عرفانِ نسیم

نسیم امروہوی کی علمی و شعری خدمات کے جشنِ زریں

کے موقع پر ادیبوں اور نقادوں کے گراں قدر مقالات کا مجموعہ

شائع کردہ

انجمن سادات امروہہ (رجسٹرڈ) کراچی

عرفانِ نسیم

نسیم امروہوی کی علمی و شعری خدمات کے جشنِ زریں

کے موقع پر ادیبوں اور نقادوں کے گراں قدر مقالات کا مجموعہ

۱

ترتیب

نوٹ: غلط نامہ مع صحت نامہ کتاب کے آخر میں منسلک ہے، ازراہِ کرم مطالعے سے پہلے تصحیح فرمالیں۔

سید سبطِ حسن انجم

قطعۂ تاریخ جشنِ زرّیں

نہ عشرت کا نہ یہ عیش و طرب کا جشنِ زرّیں ہے
مذاقِ بینش و سعی و طلب کا جشنِ زرّیں ہے
نہ دولت کا نہ یہ نام و نسب کا جشنِ زرّیں ہے
ثنا خوانِ حسینؑ تشنہ لب کا جشنِ زرّیں ہے

نسیمِ باغِ مدحت نے لکھی جو عمر بھر، جم کر
یہ اُس مدحِ شہنشاہِ عرب کا جشنِ زرّیں ہے
ہوا تھا عالمِ زر میں کبھی جشنِ علم اک برپا
وہ جب کا جشنِ زرّیں تھا، یہ اب کا جشنِ زرّیں ہے
کہا جب "شاعرِ آلِ محمدؐ" قوم و ملت نے
تو گویا اِس گراں قیمت لقب کا جشنِ زرّیں ہے
عمل، ذوقِ عمل، فکر و نظر، تطہیرِ ذہنیّت
حدودِ مرثیہ گوئی میں سب کا جشنِ زرّیں ہے
کہو اِس جشن کی تاریخ کا اک شعر وہ انجم
بتا دے شعر کی ابجد، یہ کب کا جشنِ زرّیں ہے

۱۲۰۳ نسیم آدھی صدی سے آپ کی ہے مرثیہ گوئی
+ ۷۷۱ پیاپے جہد آئینِ ادب کا جشنِ زرّیں ہے
= ۱۹۷۴ء

سخنے چند

زیر نظر کتاب ان مقالات پر مشتمل ہے جو جناب سید قائم رضا نسیم امروہوی کی پنجاہ سالہ علمی و ادبی خدمات کے جشن زریں کے موقع پر پیش کیے جا رہے ہیں، یہ تقریب انجمن ساداتِ امروہہ کی جانب سے اپنی برادری کے ایک ہونہار فرزند کی ان خدمات کے پیش نظر کی جا رہی ہے جو اس نے آباء و اجداد کی علمی و ادبی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے انجام دی ہیں، کسی قوم یا برادری کی زندگی کا راز اس کے افراد کے کارناموں ہی میں مضمر ہے۔ سید قائم رضا جیسے فرزندِ قوم ہی وہ ہیں جو قوموں کا نام زندہ رکھتے ہیں۔

جناب نسیم امروہوی نے اپنی صلاحیتوں کا مناسب استعمال کر کے نہ صرف اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے بلکہ عظیم تر اردو لغت کی ذمہ داری قبول کر کے اردو زبان کی اہم خدمت انجام دے رہے ہیں، اس لغت کی تکمیل ہماری لغت کی تاریخ میں یقیناً سنگ میل ثابت ہوگی۔ شاعری میں مرثیہ نگاری آپ کا خاص میدان ہے، اور اس سرزمین میں انقلابی تخیل سے کام لینا آپ کا حصّہ ہے۔

سید قائم رضا امروہہ میں پیدا ہوئے، یہ ایک قدیم قصبہ ہے، جو صدیوں سے برِ صغیر پاک و ہند میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ اس کی شہرت صحت بخش اور معتدل آب و ہوا کی وجہ سے نہیں، دلّی سے قربت کی وجہ سے نہیں، آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت کی وجہ سے نہیں، آم اور رو ہو مچھلی جو اس کی وجہِ تسمیہ ہیں اس کی وجہِ شہرت نہیں، شیخ سدو کی تاریخی مسجد، بائیکا کنواں، یا صدیوں پرانا مراد آبادی دروازہ وہ نشانات نہیں جن سے اس کو شہرت حاصل ہوئی، امروہہ کی شہرت امروہہ والوں سے ہے جو ہمیشہ علم و ادب میں نمایاں رہے ہیں اور اس میدان میں اپنی مخصوص روایات رکھتے ہیں۔

اردو زبان نے جس وقت سے جنم لیا اسی وقت سے اہلِ امروہہ اس کی خدمات میں پیش پیش رہے، ادب اور شعر میں امروہہ کا مقام د ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد جیسی شخصیت نے شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے لیے "امروہہ پن" کے الفاظ استعمال کر کے اس قصبہ کی انفرادی حیثیت کو ظاہر کیا اور

مصحفی کے مخصوص طرزِ بیان، ان کی وضعداری، متانت اور سنجیدگی، قدرتِ کلام اور زود گوئی پر مہر ثبت کی۔ ان سیکڑوں اہلِ امروہہ میں سے جنھوں نے اردو زبان کو پروان چڑھانے میں حصّہ لیا۔ ہم اس موقع پر چند اساتذہ کا نام لینا ضروری سمجھتے ہیں۔

ان میں سب سے پہلے قابلِ ذکر ولی دکنی کے ہمعصر اسمٰعیل امروہوی ہیں، جن کی دو مثنویاں "وفات نامۂ بی بی فاطمہ" اور "مثنوی گل انار"، رسالہ "اردو" حیدرآباد دکن میں شایع ہو چکی ہیں۔ "وفات نامۂ بی بی فاطمہ" کی ایک اصل کاپی نیشنل میوزیم میں بھی موجود ہے۔ اسمٰعیل امروہوی کے بعد میر سعادت ان اساتذہ میں تھے جن سے میر تقی میر بھی فیضیاب ہوئے۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ثاقب لکھنوی کے استاد سید مومن حسین صفی سرزمینِ امروہہ ہی کے فرد تھے۔ مرثیہ کے میدان میں فرزدقِ ہند سید جواد حسین شمیم امروہوی کا نام تا ابد زندہ رہے گا۔ سید قائم رضا نسیم امروہوی آپ ہی کے پوتے اور آپ کے فرزند سید برجیس حسین برجیس امروہوی کے بیٹے ہیں۔ سید ابوالحسن فرقتی، مشتاق امروہوی اور سید ظفر حسین منتظر بھی اساتذہ کی فہرست میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ نسیم امروہوی کے ہمعصروں میں سید محمد عبادت کلیم، سید مصطفیٰ حسین نجم امروہوی مرحوم، حیات امروہوی مرحوم، رئیس امروہوی اور سید تبارک سعید وہ لوگ ہیں جنھوں نے اردو زبان کی خدمات انجام دیں۔

امروہہ علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے، یہاں شعرا کی طرح نامور علما بھی پیدا ہوتے رہے ہیں اور علم و ادب کی روایت مسلسل جاری رہی ہے۔ اس علمی و ادبی ماحول کا مختصر سا خاکہ موجودہ کتاب کے ایک مقالے میں موجود ہے۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ امروہہ کی مذہبی، ثقافتی اور سماجی زندگی کچھ ایسی تھی کہ کسی قسم کی تقریب علم و ادب سے خالی نہ ہوتی تھی، مثلاً مجالسِ عزا، بنیادی طور پر مذہبی اجتماعات ہونے کے علاوہ ذاکری، خطابت اور مرثیہ گوئی کے لیے تربیت گاہوں کا کام بھی کرتی تھیں، اسی طرح نعت اور قصائد کی محفلیں اپنے مقاصد کے ساتھ ساتھ شعر و سخن کا فن بھی سکھاتی تھیں، ثقافتی زندگی میں لطفِ شعر کی سہل

کرنے کے ساتھ ساتھ تنقید کی تلخیاں برداشت کرنا بھی شامل تھا۔ غرض یہ کہ امروہہ والوں کی زبان، ان کے خیالات، ان کا طریقۂ فکر و طرزِ ادا سب اسی ماحول کا نتیجہ تھے۔

اسی ماحول میں سید قائم رضا نے پرورش پائی اور پندرہ سال کی عمر میں ۱۹۲۳ء میں پہلا مرثیہ کہا جس کو اب پچاس سال ہو چکے۔ اب تک آپ تقریباً ایک سو ساٹھ مراثی کہہ چکے ہیں اور بجا طور پر شاعرِ آلِ محمدؐ کہلانے کے مستحق ہیں۔ مرثیہ گوئی سید قائم رضا نے ورثہ میں پائی، امروہہ کے ماحول نے ان کی شاعری کی سمت کا تعین کیا، وہاں کی زبان نے ان کے کلام میں وہ لطافت پیدا کی کہ آج وہ نسیم امروہوی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس قادرِ مطلق نے ہمارے وطنِ مالوف کے ایک ہونہار فرزند کو ذہنِ رسا کے ساتھ ایک لگن بھی دی اور اس کی عمر میں اتنی برکت عطا فرمائی کہ آج ہمیں اس کی پنجاہ سالہ علمی و ادبی خدمات پر خراجِ تحسین پیش کرنے کا موقع ملا۔

الحمدُ للہ

سید حسن مجتبیٰ انتوی

(صدر انجمن ساداتِ امروہہ)

اعتراف

جناب صہبا اختر نے حضرت نسیم امروہوی کی شعری و علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں چند تمہیدی کلمات کے ساتھ ایک قطعہ ارتجالاً تصنیف کیا اور "جشنِ زرّیں" میں پڑھا۔ آپ نے کہا:

"میں جناب نسیم امروہوی کو اپنا استادِ معنوی تسلیم کرتا ہوں، ساتھ ہی اس کا افسوس ہے کہ عدیم الفرصتی کے باعث اس موقع پر شایانِ شان ہدیۂ منظوم پیش نہیں کر سکا، لیکن وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد اس کی تلافی کروں گا۔ فی الوقت دو شعر کا یہ قطعہ نذر گزارتا ہوں۔"

بحبِّ محمدؐ، بعشقِ حسینؑ
بالفاظِ عیسیٰ، بمنبرِ کلیم
جوابِ انیس و دبیرِ سخن
نئے عہد میں ہیں جنابِ نسیم

سیّد قائم علی شاہ (وزیر مملکت برائے صنعت پاکستان)

کے تاثرات

(شاہ صاحب نے آرٹس کونسل میں نسیم امروہوی کی علمی و ادبی خدمات کے "جشنِ زریں" کی تقریب میں جو تقریر فرمائی، وہ ٹیپ کی گئی تھی، جس کا ماحصل انہیں کے لفظوں میں درج ذیل ہے)

جناب نسیم امروہوی! خواتین و عزیز حاضرین!

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میں ایسی محفل سے خطاب کرنے کے لیے کھڑا ہوا ہوں جو اعلیٰ درجے کے ادیبوں اور ممتاز شاعروں سے بھری ہوئی ہے۔ ایک ایسے شخص کے لیے جس کا ادب اور شاعری سے دور کا واسطہ ہو، نسیم امروہوی جیسے یگانۂ روزگار شاعر اور مفکر کے بارے میں کچھ کہنا بڑا مشکل کام ہے۔ بہرحال نسیم صاحب کے بارے میں، میں اپنے تاثرات اور مشاہدات آپ کے سامنے پیش کیے دیتا ہوں۔ یہ بات میرے لیے باعثِ افتخار ہے کہ میں نسیم امروہوی صاحب کو اپنے بچپن سے جانتا ہوں، جب کہ میں اسکول میں پڑھتا تھا۔ نسیم صاحب اس زمانے میں خیرپور تشریف لائے تھے۔ انہوں نے اس ملک کی تاریخ میں پہلی بار ۱۹۵۲ء میں، خیرپور سے ایک اخبار نکالا "مراد" جس کا آدھا اردو میں ہوتا تھا اور آدھا سندھی میں (نمایاں)۔ وہ اس وقت (آج سے ۲۲، ۲۳ سال پہلے) اردو اور سندھی کو ایک جگہ دیکھنا چاہتے تھے (نمایاں) اس سے ان کی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ نسیم صاحب کی شخصیت کے بارے میں پیر حسام الدین راشدی صاحب کا جو مضمون[عہ] آپ لوگوں نے سنا، وہ حرف بحرف میرے تاثرات کی بھی ترجمانی کرتا ہے۔ میں نے نسیم صاحب کو بارہا دیکھا ہے، خوشی میں بھی دیکھا ہے اور مصائب میں بھی دیکھا ہے، لیکن وہ ایک گہرے سمندر کی طرح مجھے ہمیشہ اور ہر حالت میں ایک پُروقار اور متین انسان نظر آئے ہیں۔ میں نے کبھی اُن کی صورت یا بات چیت تک سے اپنی

عہ یہ مضمون شاہ صاحب کی تقریر کے بعد زیرِ نظر کتاب میں درج ہے۔

مشکلات کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نسیم صاحب عجیب شخصیت اور کردار کے مالک ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ ایک ایسے چھپے ہوئے نایاب موتی ہیں جسے ملک کے دانشوروں اور اہل علم نے بہت کم پہچانا ہے ان کے علم و فہم، ان کی ذہانت و فراست، سمجھ بوجھ اور تجربے سے ملک اور قوم بہت کچھ حاصل کر سکتی ہے ان سے نہ صرف علم و ادب کو بلکہ معاشرے کو بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ میں نے ان کے مرثیے بھی سنے ہیں، ان کی دوسری تخلیقات اور تصنیفات کا بھی تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے، اور ان سے کافی مانوس اور متاثر ہوں، میں کوشش کروں گا کہ ان کی صلاحیتوں سے ملک کے موجودہ حالات اور ماحول کے مطابق مزید فائدہ اٹھایا جائے۔ آج کی شام اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ آپ ایسے شخص کی خدمات کو سراہنے کے لیے جمع ہوئے ہیں جس نے پچاس سال سے زیادہ علم و ادب اور شاعری اور قوم کی خدمت کی ہے۔ ہمارے ملک میں دستور رہا ہے کہ جب کوئی دانشور گزر جاتا ہے تب کہیں اس کی عظمت اور اہمیت کا اعتراف کیا جاتا ہے، یہ بڑی اچھی بات ہے کہ آپ ایک عظیم علمی، اور ادبی شخصیت کو اس کی زندگی اور اس کی موجودگی میں خراج تحسین پیش کر رہے ہیں۔ یہ شام دراصل نسیم امروہوی کی علمی و ادبی عظمت کی شام ہے، ان کو پہچاننے کی شام ہے۔

جہاں تک انجمن سادات امروہہ کا تعلق ہے، میرا اس انجمن کے بہت سے ممبروں اور شخصیتوں سے قریبی تعلق ہے اور رہا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ علم و ادب میں آپ لوگوں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں لیکن آج خاص طور سے میں اس وقت آپ لوگوں کی علمی، ادبی اور تہذیبی کاوشوں سے بہت زیادہ متاثر ہوا جب میں نے آرٹ گیلری میں آپ حضرات کی تخلیقات کی نمائش دیکھی۔ ان میں جدید تصنیفات بھی تھیں، قدیم نسخے بھی تھے، اصل مصوری اور خطاطی کے نمونے اور مجسمے بھی تھے۔ بہت کم خاندانوں میں ایسا ہوتا ہے کہ لوگ پرانی یادگاریں یا تصنیفات یا ادبی تخلیقات اس احتیاط سے محفوظ رکھیں، جس طرح آپ لوگوں نے محفوظ کی ہیں، پھر انہیں عام لوگوں کے فائدے کے لیے پیش کریں یا دکھائیں۔ میں ان قدیم تصنیفات اور کلام پاک کے پرانے نسخوں کو دیکھ کر بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں۔ آپ کے نوجوانوں کی بھی تصنیفات اور تخلیقات اور فن پارے دیکھے۔ جو تصاویر میں نے دیکھیں وہ بھی بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ آپ کی انجمن اور اس انجمن کے ممبروں کی کوششیں اور کاوشیں ملک اور معاشرے کے لیے بڑی اہم خدمات میں رہنما ہیں۔

آخر میں، میں جناب نسیم امروہوی صاحب، آپ دوستوں اور انجمن کے عہدیداروں کا بہت ممنون ہوں کہ مجھ جیسے آدمی کو جو نہ شاعر ہے اور نہ ادیب، اس محفل میں مدعو کر کے عزت بخشی، سلام علیکم!

نسیم صاحب کو جیسا میں نے پایا

سید حسام الدین راشدی

نسیم صاحب امروہوی سے میری ملاقات ۱۹۵۲ء میں خیرپور میں ہوئی، جب آپنے اردو کانفرنس بلائی اور میں مولوی عبدالحق مرحوم کے قافلے میں وہاں پہنچا، کانفرنس بہت کامیاب رہی اور مہمانداری کے لحاظ سے ہر چیز شاہانہ طور طریق سے سرانجام پائی۔

نسیم صاحب سندھ میں کب آئے اور کیوں آئے؟ یہ تو مجھے معلوم نہیں، لیکن جب یہاں پہنچے تو خیرپور میں جاکر بود و باش اختیار کی اور اپنی شرافتِ نسبی اور فضائلِ شخصی کی وجہ سے "پناہ گیر"[۱] نہیں بنے بلکہ زمین و مکان کے علاوہ خیرپور کے باشندوں نے اپنے دلوں میں بھی آپ کو جگہ دی، جو شرف بہت ہی کم حضرات کو نصیب ہوا ہے۔

براہِ راست میرا واسطہ آپ سے نہیں پڑا تھا، اس پہلی اور سرسری ملاقات کی وجہ سے کئی سال تک فقط دور کی علیک سلیک تک نوبت رہی، ہر وقت کا آمنا سامنا یا مسلسل تعلق، جو بعد میں تعلقِ خاطر کی صورت اختیار کر گیا، اس وقت سے شروع ہوا جب آپ نے کراچی آکر اردو بورڈ میں لغت نویسی کا کام شروع کیا اور آپ کی علمی منزلت اور مقام سے میں آشنا ہوا۔

لغت نویسی میں نسیم صاحب کو پہلے سے درک تھا۔ "نسیم اللغات" پاکستان میں مشہور و معروف ہو چکی تھی، اردو زبان ان کی اپنی زبان تھی، فارسی و عربی زبان و ادب پر انھیں قدرتِ کاملہ حاصل تھی، چنانچہ جب آپنے بورڈ میں کام کا آغاز کیا تو رفتہ رفتہ آپکے جوہر کھلتے گئے اور علمی فضیلت آشکار ہوتی گئی، کچھ ہی عرصے کے اندر معیار اور رفتار کے لحاظ سے نہ فقط اپنے ہمکاروں کو کوسوں پیچھے چھوڑ دیا، بلکہ ارکانِ بورڈ کے دلوں پر بھی آپ کی علمیت اور فضیلت کا سکّہ بیٹھ گیا اور تمام ممبر ایک جیسے قبیح، ذہین، پُرمایہ، عالم اور بزرگ کی حیثیت سے ان کا احترام کرنے پر مجبور ہو گئے۔ آپ کی متانت، وقار، سنجیدگی، اصابتِ رائے اور ساتھ ہی مزاج کی شگفتگی نے گرد و پیش کو اپنا گرویدہ اور والہ و شیدا بنا دیا۔

نسیم صاحب بورڈ میں رہتے ہوئے میرے قریب تر ہو گئے، میں ان کی علمی برتری سے سخت متاثر

۱؎ یہ لفظ ۱۹۴۷ء میں ہندوستانیوں کے لیے بولا جاتا تھا جو بعد میں ختم ہو گیا۔

ہوا اور بہترین کارکردگی نے مجھے مجبور کیا کہ میں اپنے علمی کاموں میں ان کی امداد و استعانت حاصل کروں چنانچہ میں نے آپ سے استفادہ شروع کیا اور جب کبھی ضرورت پڑی، نہ میں نے مدد لینے میں ہچکچاہٹ محسوس کی نہ کبھی آپ نے امداد فرمانے میں دریغ کیا، میرے اور نسیم صاحب کے روابط، تعلقات یا باہمی یکدلی کا سفر اسی نقطے سے شروع ہوا۔

علمی کام یا ہمکاری کے سلسلے میں ان گنت انسانوں سے واسطہ پڑا ہے، خوبیاں اور خرابیاں سامنے آئی ہیں، کوتاہیاں اور کمزوریاں ظاہر ہوئی ہیں، کارکردگی اور علمی حیثیت کا راز کھلا ہے، غرض کہ چند روز کے اندر اندر ہر ایک کی بساط میرے سامنے آگئی ہے اور یہ بندہ سخت مایوسی کے عالم میں دعائیں دیتا ہوا پہلو تہی کر گیا ہے، زندگی میں نسیم صاحب کی شخصیت ہی مجھے ایسی ملی ہے جو میری خواہش، ضرورت اور خیال کے مطابق ہر صفت موصوف تھی، آج تقریباً دس برس گذر چکے ہیں نسیم صاحب میرے ہمکار اور میرے معاون و مددگار ہیں، ہر مشکل مقام پر میری رہنمائی کرتے ہیں اور ہر آن اور ہر وقت میری استعانت پر کمربستہ رہتے ہیں۔

دس برس کے اس خاصے طویل عرصے میں، میں نے آپ کو یکساں پایا ہے۔ رفتار اور گفتار میں کبھی نشیب و فراز نہیں آیا، وہی متانت، سنجیدگی اور مزاج میں شگفتگی اور چہرے پر باوقار مسکراہٹ جو پہلے دن دیکھی تھی وہ اب تک بھی باقی ہے، کام میں ٹال مٹول، زیادہ کام پڑ جانے پر گھبرا جانا یا وقت آنے پر جی چرانا میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ پابندیٔ وقت اور قلم کی یکساں رفتار جو شروع میں تھی وہ اب تک باقی ہے۔

ہر چند کہ اب ظاہراً تھکے تھکے سے معلوم ہوتے ہیں اور صحت کے لحاظ سے کمزور ہو چکے ہیں۔

اپنی خانگی زندگی میں نسیم صاحب بعض وجوہ کی بنا پر کبھی مطمئن نہیں رہے، کئی مواقع ایسے بھی آئے کہ کوئی اور چھوٹے ظرف اور عامی مزاج کا آدمی ہوتا تو صبر و ضبط کا پیمانہ توڑ بیٹھتا لیکن اس خدا کے بندے نے کبھی اندرونی کرب و اضطراب کو ظاہر ہونے نہیں دیا، مطمئن، خندہ رو اور شاداب، ہمیشہ اپنے کام میں حضورِ قلب کے ساتھ مشغول اور منہمک رہے، کبھی جواب نکلی بھی تو ہنس کر اشارۃً کنایۃً کچھ "ہاں ہوں" کر دی، ورنہ ہمیشہ صبر و شکر کا سکوت رہا! یہ صبر گیا ایک سچے مسلمان کی نشانی ہے جس کا اپنے خدا

اور رسولؐ پر کامل بھروسا ہو اور ہر کیفیت کو خدائے ذوالجلال کی طرف سے سمجھ کر امتحانوں سے گذرتا ہوا زندگی کی مہم سر کرتا ہوا آگے قدم اٹھاتا ہوا چلا جا رہا ہو۔ سچ بات تو یہ ہے کہ نسیم صاحب کی ایمانی قوت دیکھ کر ہم جیسے ضعیف لوگوں کی ڈھارس بھی بندھی رہتی ہے، زندگی میں کبھی سخت مواقع آئے جبکہ میری ایمانی قوت میں بھی توانائی آگئی اور میں زندگی کے سخت مقامات اور مراحل سے نسیم صاحب کے کردار کو سامنے رکھ کر بخیر و خوبی گذر گیا۔

انسان میں سب ہی کچھ ہوتا ہے، اچھائیاں اگر زیادہ ہیں تو کچھ برائیاں بھی ساتھ ہوتی ہیں، خوبیاں بکثرت ہیں تو تھوڑی بہت خرابیاں بھی دامن سے لگی رہتی ہیں، آخر دس برس کے ساتھ سنگت میں زندگی کے سارے پہلو ایک دوسرے کے سامنے آہی جاتے ہیں، لیکن بلا مبالغہ آج تک نسیم صاحب میں اعلیٰ انسانی اقدار کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آیا۔

گذشتہ دس برس سے نسیم صاحب میرے ساتھ ہیں، میرے اکثر و بیشتر مسودات آپ کے تیار کردہ ہیں، جب کبھی میں نے کوئی خطی کتاب نقل کرنے کو دی تو اس طرح خوش اسلوبی اور تیز رفتاری کے ساتھ اس کو مسودہ پر منتقل کر دیا کہ مجھے مطابقت یا نظر ثانی کی ضرورت بہت کم ہی ہوئی، نقل مطابق اصل کے کیا، فارسی و عربی کے آپ عالم ہیں، خود شاعر، شاعر گر اور ادیب ہیں، تاریخ گوئی پر پورا درک حاصل ہے، مسودے میں جہاں فارسی کا غریب لفظ آیا انھوں نے بغیر لغت دیکھے اس کے معنی بتا دیئے، جہاں کہیں عربی عبارت آئی صحت کا خیال رکھا، حدیث آئی تو بتا دیا کہ کس کتاب سے لی گئی ہے، آیۂ کریمہ آئی تو خود ہی لکھ دیا کہ فلاں سورہ میں فلاں نمبر آیت ہے۔ عربی کا مقولہ آیا تو بتا دیا، شعر یا عبارت میں کمزوری پائی تو نشان دہی کر دی، تاریخ غلط نکالی گئی تو اس کو درست کر دیا، غرض کہ مشکل مقام کو حل کیے بغیر آگے نہیں چلے، میرے ساتھ بہت سے لوگ اس علمی سفر میں ساتھ رہے ہیں لیکن جتنا اطمینان مجھے نسیم صاحب کے تعاون سے حاصل ہوا وہ کوئی اور ساتھی مجھے نہ پہنچا سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ اور کے بس کا یہ روگ بھی نہیں ہے۔

شاعری اور تاریخ گوئی نسیم صاحب کے خاص میدان ہیں، تاریخ اور تذکرے کی کتابوں میں اکثر ولادت و وفات یا کسی واقعہ پر کہی ہوئی تاریخیں آتی ہیں، اور نقل در نقل ہوتے ہوتے کچھ کی کچھ بن جاتی ہیں، ایسے مقامات

پھر میں نے دیکھا ہے کہ نسیم صاحب کی ذہانت، فنی مہارت اور تاریخ گوئی پر گرفت بالکل بجلی کی طرح چمک دکھا جاتی ہے۔ جہاں وہم و گمان بھی نہیں ہوتا آپ کا فکر رسا وہاں تک پہنچ جاتا ہے۔ بعض اوقات ایک تاریخ کی تصحیح یا سمجھنے میں پہروں ضائع کر دیتے ہیں لیکن جب نسیم صاحب کے سامنے وہ تاریخ پیش کی تو ایک لمحہ کے اندر حل کر کے تاریخ کو اپنی اصلی صورت میں لے آئے۔ یہ علم کے ساتھ ساتھ ذہانت اور فراست کی بات بھی ہے، جو ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ ع "تا نہ بخشد خدائے بخشندہ"

نسیم صاحب کو خدائے ذوالجلال نے جہاں علم و فضل، دانش اور بینش کے بیش بہا خزانے دیئے ہیں وہاں زمانے میں رفتار و گفتار کے طور طریقہ پر بھی پوری قدرت اور مہارت عطا کی ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ سخت سے سخت دور اور دشوار ترین حالات میں انسان کو کس نہج پر ——— زندگی گزارنا چاہیئے، اور مشکل سے مشکل مسئلے کو کس طریقے اور انداز سے کس کے سامنے پیش کرنا چاہیئے کہ مسئلے کے تمام پہلو بھی سامنے آجائیں اور ساتھ ہی حل بھی آسان نظر آئے۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ زندگی کے معاملات یا کاروباری مسائل میں جب کبھی پیچیدگی پائی گئی اور ہم سب پریشان ہو گئے اس وقت نسیم صاحب نے نہ فقط اپنے تدبر اور فراست کے ساتھ معاملے کو سمجھایا بلکہ ساتھ ساتھ گفتگو میں اس طرح کا انداز اختیار کیا کہ اس کا حل یا طریقۂ کار خود بخود ذہنوں میں ابھر آیا۔ لغت نویسی ہو یا بورڈ کے کاروباری معاملات، نسیم صاحب کا وجود ہمیشہ مشعل راہ رہا ہے۔

میں نے جہاں تک ان کی شخصیت کا مطالعہ کیا ہے، میں وثوق اور پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سید قائم رضا نسیم امروہوی صاحب کو جو ماحول ملا ہے وہ ان کے فہم و فراست، علم و دانش کے مقابلے میں بہت ہی تنگ اور محدود ہے۔ ان کے لیے درحقیقت حد نظر سے بھی بہت دور ——— بہت دور ——— بلکہ محدود وسعت چاہیئے تھی ——— لیکن! کیا کیا جائے؟ زمانے نے تو ہمیشہ صاحب نظر اور اہل دل کے ساتھ ناانصافی برتی ہے۔

صہبائی راشد

5-12-74 کراچی

نذرانۂ جمیل

جمیلؔ نقوی

"وقت مر سکتا ہے انسان نہیں مر سکتا"

میں ہوں اک شاعرِ وارفتہ و آشفتہ مزاج
میری فطرت نہیں اسلاف پہ نازاں ہونا
میں ہوں وہ چار گرہ کپڑا بقول غالبؔ
"جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا"

میں کہاں اور کہاں یہ نفسِ گرم سخن
اپنی اس جرأتِ بیباک پہ حیراں ہوں میں
محض یہ فرط عقیدت کا کرشمہ ہے کہ آج
شاعرِ آل محمدؐ کا ثنا خواں ہوں میں

جب سے راس آئی مرے کام و دہن کو تلخی
یہ وفائیں، یہ جفائیں بخدا کچھ بھی نہیں
ہو چکا پختہ مرا ذوقِ نظر، ذوقِ جمال
حسنِ مغرور بجز حسنِ ادا کچھ بھی نہیں
ہر طرف کچھ نظر آتا نہیں جز خیمۂ گل
ایک گل رنگ تخیل کے سوا کچھ بھی نہیں

اسی گل رنگ تخیّل کے سہارے اکثر
ذہن میں اپنے کبھی بزم سجا لیتا ہوں
اور اس بزم میں ہوتے ہیں وہی پاک نفس
جنھیں میں مرشد و ممدوح بنا لیتا ہوں

میرے ممدوح مکرم، میرے مشفق مرے دوست
علم سے تیرے منور ہے دبستان وطن
اپنے اسلاف کی اخلاف کی عزت کی قسم
ذات سے تیری معزز ہیں عزیزان وطن

فخرِ اسلاف ہے تو، قوم کا سرمایہ ہے
ان کی عظمت کا بیاں ہے تری عظمت کا بیاں
اپنے دادا کی امانت کا امیں ہے یہی شخص
تم کو معلوم ہے اے مجمع معنی نگہباں

شاعرِ آل محمدؐ بھی ہے نثار بھی ہے
صاحب طرز بھی ہے۔ خالقِ اقدار بھی ہے
محرم علم لغت، مخزنِ افکار بھی ہے
پیکرِ سادگی و جذبۂ ایثار بھی ہے

مخزنِ علم لسان و ہمہ دانی ہے نسیم
واقفِ و کاشفِ اسرارِ معانی ہے نسیم
طرزِ اسلوب میں آپ اپنا ہی ثانی ہے نسیم
شعر میں ایک نئے سبک کا بانی ہے نسیم

اس کی بے ساختہ تحریر معانی کا طلسم
اس کی جادو بھری تقریر ہے اک جوئے رواں
اس کی معصوم نگاہوں میں جھلکتا ہے وہ عزم
شیب پر اس کے گذرتا ہے جوانی کا گماں

جن سے امروہہ ممیز تھا بصد شان و شکوہ
ذات میں اس کی وہ اقدارِ کہن زندہ ہیں
یہ وہ ساحر ہے کہ جس کے نفسِ پیہم سے
آج بھی مرثیہ گویانِ وطن زندہ ہیں

تو نمائندہ ہے ان مرثیہ گویوں کا نسیم
جن کو شہرت کی تمنا نہ صلے کی پرواہ
ایک خاموش مسافر کی طرح گرمِ سفر
کر رہا ہے بڑے اسلوب سے طے عمر کی راہ

میرے مشفق ترے اس جشن کے موقع پہ جمیلؔ
بجز اس شعر کے کچھ نذر نہیں کر سکتا
زندگی دل سے ہم آہنگ اگر ہو جائے
وقت مر سکتا ہے انسان نہیں مر سکتا

جمیل نقوی عفی عنہ

گُلِ خوش رنگ

نسیم امروہوی کی ایک جھلک
اُن کے
ماحول اور کلام کے آئینہ میں

سید تصویر حسین
سابق:
صدر شعبۂ السنہ
پاکستان ملٹری اکادمی، کاکول
پرنسپل سراج الدولہ کالج، کراچی

جنابِ منصور حسین نجمؔ مرحوم کے نام

جو

جنابِ نسیمؔ امروہوی کے ساتھ

دبستانِ مرتضوی

یعنی

درسگاہِ حاجی سیّد مرتضیٰ حسین اعلی اللہ مقامہ

کے نونہال تھے!

نسیم امروہوی کا پہلا مرثیہ اور اس کی مجلس

امروہہ، برِ صغیر ہند و پاک کا ایک قدیم قصبہ ہے اور پٹھان فرمانرواؤں کے وقت سے برابر ایک مردم خیز سرزمین ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ یہ ملک کے دور دراز گوشوں تک سادات کی ایک ممتاز ترین بستی کی حیثیت سے مشہور ہے، یہاں عزاداریِ حسینؑ بڑے اہتمام سے کی جاتی ہے، جس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس چھوٹے سے قصبے میں آزادیِ ہند و پاک کے وقت (۱۹۴۷ء میں) چھوٹے بڑے ملا کر باونؔ عزاخانے تھے جو اب بھی ہیں، ان میں سے بعض کا شمار امروہے کی عالی شان عمارتوں میں ہوتا ہے جنھیں ہر سال عشرۂ محرم میں جھاڑ فانوس سے سجایا جاتا ہے اور بعض عزاخانے معمولی چھوٹی عمارتوں میں ہیں جن کی آرائش حسبِ استطاعت و گنجائش کی جاتی ہے، ایامِ عزا میں ذکرِ حسینؑ سب ہی میں ہوتا ہے۔ بڑے عزاخانوں میں ایک محلہ دانشمند میں واقع ہے جو نقوی سادات کا محلہ ہے، یہ (بانیٔ نور المدارس) نور الحسن مرحوم کے امام باڑے کے نام سے مشہور ہے کیونکہ حاجی سید نور الحسن مرحوم نے اپنی جائداد اس عزاخانے کے لیے وقف کردی تھی، اس عزاخانے کے برآمدے میں شاندار سائبان پر مولانا سید اولاد حسن سلیم مرحوم اعلی اللہ مقامہ (امام جمعہ و جماعت) کی کہی ہوئی یہ تاریخ درج ہے۔

فکر تھی تاریخ کی ہاتف پکارا ناگہاں
رونے والوں کے سروں پر نور کا ہے سائباں

اس سے پتا چلتا ہے کہ تعمیرِ عزاخانہ ۱۳۲۲ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔

۱۹۲۳ء میں نومبر کی چوتھی تاریخ تھی اور اتوار کا دن۔ سنہ ہجری ۱۳۴۲ تھا اور تاریخ ربیع الاوّل کی چوبیس تھی، صبح سے نور الحسن کے امام باڑے میں صفائی ہو رہی تھی اور ۹ بجے تک اس کے بڑے ہال میں فرش بچھ چکا تھا ذاکر کے لیے منبر اور سوز خوان کے لیے تخت آراستہ کرکے جگہ پر رکھا جا چکا تھا۔ ایام عزا تو گزر چکے تھے مگر مجلس کا اہتمام اعلیٰ پیمانے پر کیا گیا تھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ، یہ غیر معمولی مجلس جس کے لیے اتنا انتظام کیا گیا تھا ضرور کوئی خاص اہمیت رکھتی تھی، لوگ ساڑھے نو بجے سے ہی آنے شروع ہو گئے اور آدھے گھنٹہ کے اندر ہال سامعین سے بھر گیا۔ ہال کے باہر بھی اتنا مجمع ہو گیا کہ تل دھرنے کی جگہ باقی نہ رہی، لیکن ابھی تک ذاکر کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔

ایک بار لوگوں کی نظریں اٹھیں اور انھوں نے دیکھا کہ سادات امروہہ کے چند معمر اور مقتدر اشخاص تشریف لا رہے ہیں، ان کے ساتھ ایک اجنبی بزرگ بھی ہیں جن کے پہلو میں جامے وار کی لمبی شیروانی، ڈھیلے پائنچوں کا پاجامہ اور امروہے کی مخصوص کارچوبی ٹوپی پہنے ہوئے ایک جانا پہچانا پندرہ سالہ لڑکا بھی ہے، یہ لوگ امام باڑے کے شمالی دروازے کی طرف سے آرہے تھے جس کے قریب ہی ایک پرانے مکان کا دروازہ ہے جس پر یہ شعر کندہ ہے:

شمیم حیدرِ یکتا کا ہے در	ہوا اِلقا، بہ لطفِ شاہِ خیبر

۱۳۸۳ھ ۱۸۶۶ء

آنے والے حضرات میں اجنبی بزرگ سادات بارہہ (جانسٹھ ضلع مظفر نگر) کے نواب باقر علی خاں نسیم (مرحوم) تھے جو اس پھاٹک والے گھر کے شہرۂ آفاق

۱؎ فرزدقِ ہند حضرت شمیم مرحوم اعلی اللہ مقامہ کے والد مرحوم کا اسم گرامی (حیدر حسین) جو یکتا تخلص فرماتے تھے۔

شاعر فرزدقِ ہند شمیم امروہوی کے ۱۹۰۱ء میں شاگرد ہوئے تھے۔ اس وقت سے ہر سال عشرۂ محرم میں شمیم (اعلی اللہ مقامہ)، جالندھر جاتے اور آپ کے یہاں مجالس میں اپنا مرثیہ پڑھا کرتے تھے، ان دونوں میں باہم کتنے پُرخلوص تعلقات تھے اور ایک کو دوسرے پر کتنا اعتماد تھا یہ اس سے ظاہر ہے کہ شمیم (اعلی اللہ مقامہ) کی وفات کے بعد مرحوم کے بستۂ مراثی کی نقل نواب سید باقر علی خاں نسیم کے پاس موجود تھی۔ یہی نگاہوں اور علمی شیروانی والا لڑکا بھی اسی گھر کا بچہ برجیس حسین برجیس (مرحوم) کا یتیم بیٹا، فرزدقِ ہند شمیم (مرحوم) کا پوتا اور ریکتا (مرحوم) کا پرپوتا "سید قائم رضا" تھا (جو آج نسیم امروہوی کے نام سے پکارا جاتا ہے) اہلِ وطن جن میں مشاہیر شہر، علماء، شعراء، ذاکرین، اور طلباء سب ہی شامل تھے، اس لڑکے کا تصنیف کردہ پہلا مرثیہ اسی کی زبان سے سننے کے لیے جمع ہوئے تھے۔

عزیز العلماء مولانا سید یوسف حسین نجفی مجتہد (طاب ثراہ) و مولانا سید سبطِ نبی نجفی مجتہد (طاب ثراہ) اور سید العلماء مولانا سید محمد امروہوی مجتہد کے اسمائے گرامی اس مجمع کے علماء میں سرِفہرست لکھے جا سکتے ہیں۔ سادات کے وہ حضرات جو شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے یا خود مشقِ سخن کرنے والے تھے۔ کم و بیش سب ہی اس محفل میں شریک تھے۔ سادات کے علاوہ دیگر مقامی شاعر اور ادیب بھی آئے تھے، ان میں جناب شبیر خاں شبیر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ وہ عوام کے شاعر تھے اور ان کو امروہے کا نظیر اکبر آبادی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

اس مجمع میں وہ اشخاص بھی تھے جن کے آگے اس لڑکے نے زانوئے ادب تہ کیا تھا اور اس کی علمی و ادبی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں ان کا بھی ہاتھ تھا، جس پودے کی انھوں نے آبیاری کی تھی آج اس کا پہلا ثمر دیکھنے آئے تھے۔ منشی حمید حسن جنھوں نے قائم کو پانچ چھ سال کی عمر میں اردو پڑھائی تھی اپنے

شاگرد کا مرثیہ سننے آئے تھے۔ مولوی ابوجعفر جنھوں نے فارسی کا درس دیا تھا، موجود تھے۔ منشی سیّد انتظار حسین جنھوں نے ابتدائی زمانے میں حساب پڑھایا تھا ہمہ تن انتظار بنے بیٹھے تھے۔ محلّے کے منشی سید ضمیر الحسن وہ تھے جنھوں نے قائم کو بچپن میں مار مار کر پہاڑے ایسے یاد کرائے تھے کہ آج بھی نسیم امروہوی ہزاروں کی جمع، تفریق، ضرب، تقسیم زبانی کر دیتے ہیں۔ وہ بھی منبر سے دور، ہال کے ایک گوشے میں خاموش بیٹھے تھے۔ کسی نے دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو مگر قائم کی نظر ان پر پڑی ہوگی، بچپن کی مار یاد آئی ہوگی، منشی جی کو دیکھتے ہی سنبھل گئے ہوں گے کہ کہیں مرثیہ پڑھنے میں کوئی لغزش نہ ہو جائے، ورنہ ......

امروہہ گورنمنٹ ہائی اسکول میں عربی کے استاد اور حاجی سید مرتضیٰ حسین (مرحوم اعلی اللہ مقامہ) کے شاگرد مولوی سید انوار الحسن (مرحوم اعلی اللہ مقامہ) بھی موجود تھے، قائم رضا اپنی تصانیف کے مسودے ان کی خدمت میں پیش کرتے تھے، انھیں پڑھ کر موصوف اصلاح تو نہ دیتے تھے مگر اصلاح طلب مقامات پر خط کھینچ کر حاشیے پر تبصرہ لکھ دیا کرتے تھے، جسے پڑھ کر قائم رضا خود اصلاح و ترمیم کر لیا کرتے، پھر مرحوم کو سناتے اور جب تک وہ نہ کہہ دیتے کہ اب شعر ٹھیک ہو گیا اس وقت تک کسی مجلس یا محفل میں نہیں پڑھتے تھے۔

حاجی سید مرتضیٰ حسین (مرحوم اعلی اللہ مقامہ) کی ذات تو وہ تھی جس کا اس مجلس کے انعقاد میں بھی بڑا ہاتھ تھا، وہ فرزدق ہندؔ کے حقیقی چچازاد بھائی ہونے کی بنا پر قائم رضا کے بزرگ خاندان تھے۔ ان جناب کی خاص توجہ اور علمی سرپرستی کا شرف قائم رضا کو آٹھ نو سال کی عمر سے حاصل تھا، یعنی اس وقت سے جب وہ نور المدارس کے طالب علم ہوئے۔ انھوں نے حاجی صاحب کے شاگرد کی حیثیت سے گیارہ برس کی عمر میں پنجاب یونیورسٹی سے اور بارہ سال کی عمر میں الہ آباد بورڈ

سے منشی کے امتحانات پاس کیے۔ ۱۹۲۳ء میں الہ آباد بورڈ سے ہی عربی علوم میں مولوی کی سند حاصل کی اور اسی سال یہ مرثیہ کہا جو آج پیش کیا جانے والا تھا، ظاہر ہے کہ ان جیسے شفیق استاد کو اس مرثیے کی کتنی فکر ہوگی۔ یقیناً وہ اور ان کے ساتھ ہی قائم رضا کے عم محترم سید معجز حسین (مرحوم) اور چند دیگر حضرات جن کا قائم رضا سے قریبی تعلق تھا اس محفل میں امید و بیم کے عالم میں تھے۔

لیکن وہ دل جو اس وقت سب سے زیادہ بے چین و بے قرار تھا، مردوں کی محفل میں نہیں بلکہ پس پردہ مستورات کے مجمع میں تھا، وہ ماں کا دل تھا، ایسی ماں کا دل جسے قدرت نے شادی کے چند سال بعد ہی سہاگ سے محروم کر دیا تھا اور جس کی زندگی کا مقصد اور تمام امیدوں کا مرکز اس کے دو بچے قائم اور صائم تھے، قائم رضا کی عمر چار سال تھی اور صائم رضا صرف دو سال چھ مہینے کے تھے کہ ۱۹۱۰ء میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور والدہ ان بچوں کو ساتھ لے کر فرزدقِ ہند کے پاس رامپور چلی گئیں تاکہ ان کو دادا کی سرپرستی حاصل رہے۔ نواب حامد علی خاں علم دوست اور محب اہلبیت والیان ریاست میں سے تھے فرزدق ہند شمیم امروہوی (اعلی اللہ مقامہ) کی ادبی اور دینی خدمات سے متاثر ہو کر بیسویں صدی کے اوائل میں ان کو امروہے سے رام پور لے گئے تھے اور اس وقت سے فرزدقِ ہند کا قیام رام پور میں تھا۔ مرجلیس مرحوم (اعلی اللہ مقامہ) کی جوان موت کا ان پر بیحد اثر ہوا اور وہ اس صدمہ کو زیادہ دن تک برداشت نہ کر سکے، اور بیٹے کے انتقال سے ایک سال دو ماہ بعد ۱۹۱۲ء میں فوت ہو گئے اور قائم رضا تقریباً پانچ سال کی عمر میں دادا کی سرپرستی سے بھی محروم ہو گئے۔

اب باپ دادا کی جگہ بس والدہ ہی والدہ تھیں، بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی تعلیم و تربیت کا مناسب انتظام کرنا انہی کی ذمہ داری تھی جسے انھوں نے

بڑی عالی ہمتی سے پورا کیا۔ رامپور سے امروہہ واپس آکر اس زمانے کے دستور کے مطابق قائم رضا کو منشی بنیاد علی فاروقی کی مکتب میں داخل کر دیا، اس وقت وہ کلام پاک کے کئی پارے پڑھ چکے تھے، مرحومہ جس دور سے تعلق رکھتی تھیں وہ تعلیم نسواں کا دور نہ تھا، عورتوں کو قرآن تلاوت کی حد تک پڑھا دینا اور اردو کی بالکل ابتدائی تعلیم دے دینا کافی سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ بچپن میں مرحومہ کی تعلیم بھی اسی حد تک ہوئی تھی، مگر اللہ نے انھیں ذہن رسا عطا فرمایا تھا اور ان کے دل کو دولتِ ایمان و حبِ محمدؐ و آل محمدؐ سے معمور کیا تھا، اپنے ذاتی شوق سے فقہ جعفری کا مطالعہ کیا۔ اپنے شوہر اور خسر مرحوم کا کلام اس حد تک پڑھا تھا کہ ان کے مرثیوں کے بہت سے بند انھیں زبانی یاد تھے، اس کے علاوہ انیسؔ و دبیرؔ کے مراثی سے اتنی مانوس تھیں کہ خاندان کی لڑکیوں کو قرآن پڑھانے اور شرعی مسائل بتانے کے ساتھ مراثی انیسؔ کا درس بھی دیتی تھیں نوحے اور مناقب بھی تصنیف کرتی تھیں، کشیدہ کاری اور سلائی کے میدان میں بھی ان کو ہمعصر مستورات میں امتیازی حیثیت حاصل تھی۔

جب قائم رضا نے سال ڈیڑھ سال کے بعد قرآن پاک ختم کیا تو جوہر شناس ماں نے ان کی دماغی صلاحیتوں کا اندازہ کر لیا، انھیں یقین ہو گیا کہ اگر صحیح تعلیم و تربیت ملتی رہی تو یہ لڑکا اپنے دادا کی علمی و فنی میراث حاصل کر لیگا، لہذا وہ اپنے اس لڑکے کو علم کی دولت سے مالا مال کرنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہو گئیں، اپنے بلند کردار اور پُر عمل خانگی زندگی کے ذریعہ انھوں نے گھر کے اندر ہی لڑکے کی شخصیت کی تعمیر کے لیے ساز گار فضا پیدا کر دی اور اسے قائم رکھا، یہاں تک کہ اب اس شخصیت کے خدوخال ابھر کر دنیا کے سامنے آنے کا وقت آگیا، قائم رضا اپنا پہلا مرثیہ پڑھنے کے لیے منبر کی طرف جا رہے تھے

اور ان کی والدہ کا دل دھڑک رہا تھا، جسم میں لرزہ، آنکھوں میں آنسو اور زبان پر نادِ علیؑ کے کلمات۔

منبر پر بیٹھ کر قائم رضا نے پہلے سامعین سے تلاوت سورۂ فاتحہ کی درخواست کی اور خود دونوں ہاتھ اٹھا کر الحمد پڑھی، پھر مرثیہ شروع کیا:

مطلع

تجھ میں اے باغِ وطن اب گُلِ خوش رنگ نہیں
کس رَوش پر گل و بلبل میں یہاں جنگ نہیں
تن پہ کس غنچے کے ہستی کی قبا تنگ نہیں
طنطنے ہیں وہی ماضی کے، وہ اور نگ نہیں

آنکھ با وصفِ تکدر جدھر اٹھ جاتی ہے
فقر کی شاہی بے ملک نظر آتی ہے

—— "باغِ وطن" اور "گُلِ خوش رنگ" کے الفاظ نے لوگوں کو وہ مشاعرے، مجلسیں اور ادبی نشستیں یاد دلا دیں جن میں ان کے با کمال اسلاف حصہ لیا کرتے تھے۔ مجلس میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جنھوں نے مومن حسین صفیؔ، ابوالحسن فرقتیؔ، ابوالحسن ساکتؔ اور حیدر حسین یکتاؔ وغیرہم کا کلام خود ان شعراء کی زبانی سے سنا تھا، وہ یہ دیکھ کر خوش ہوئے کہ ان کے وطن کا یہ نوجوان شاعر اسلاف کے ثقافتی سرمایہ سے آگاہ ہے۔

مرثیہ آگے بڑھتا گیا اور مجمع کی سبحان اللہ، مرحبا، جزاک اللہ، جیتے رہو کی صدائیں بلند سے بلند تر ہوتی گئیں، یہاں تک کہ ۹۶ بند پڑھنے کے بعد قائم رضا نے بڑی خود اعتمادی اور متانت کے ساتھ مقطع پیش کیا:

بس قلم روک لے اے مرثیہ گوئے شبیر

غش نہ ہو جائیں عزادارِ امامِ دلگیر
شکر کر اب کہ بہ انفضال خداوندِ قدیر
باپ دادا کی مجھے مل گئی اصلی جاگیر
اس عطا کا سنِ تصنیف یہ لکھا قائم
آفریں خوب ہے یہ مرثیہ پہلا قائم

۱۹۲۳ء

مرثیہ ختم کر کے قائم منبر سے اتر رہے تھے کہ نواب سید باقر علی خاں نسیم نے مجمع سے مخاطب ہو کر اس موقع پر ایک اہم اعلان کرنے کی خواہش ظاہر کی، سامعین خاموش ہو گئے اور سید صاحب نے اپنا تعارف کرانے کے بعد فرمایا: "استاد کے انتقال کے وقت سے اب تک میں نے مرحوم کی ایک امانت احتیاط سے اپنے پاس رکھی ہے، اور وہ ہے اُن کے جانشین کا تخلص یعنی "نسیم" جسے آخر عمر میں استاد مرحوم بہت پسند فرماتے تھے اور ان کی تمنا تھی کہ اب معجز یا برجیس کی اولاد میں کوئی مرثیہ گو شاعر ہو تو میں اس کا یہ تخلص رکھوں، آج تک میں اسی واسطے یہ تخلص اپنائے رہا کہ کوئی دوسرا شاعر اسے اپنے لیے مخصوص نہ کر سکے، چنانچہ میں نسیم تخلص کرتا رہا آج اس امانت کی حفاظت کی ذمہ داری سے سبکدوش ہوتا ہوں، استاد مرحوم کی علمی اور فنی صلاحیتوں کا صحیح وارث آج مجھے مل گیا اور میں یہ امانت اس کے حوالہ کرتا ہوں، آج سے یہ نسیم ہو گئے اور میں اپنا تخلص نسیم کی بجائے فہیم رکھوں گا"

کم و بیش ان الفاظ کے ساتھ نواب سید باقر علی خاں نے، نسیم کے سر پر دستار باندھی، اور درود کے نعروں کی گونج میں نسیم امروہوی کے جدید مرثیہ کی پہلی مجلس ختم ہوئی۔

نسیم امروہوی کے بنیادی نظریات

نسیم امروہوی کا پہلا مرثیہ جس کا ہم نے ذکر کیا، ملک کی اس فضا کا پتہ دیتا ہے جس سے ان کے دور کے اکثر ترقی پسند تعلیم یافتہ نوجوان متاثر ہو رہے تھے۔ اسی فضا میں ان کی ذہنیت اور کردار نے نشو ونما پائی اور ان کے نظریات کی داغ بیل پڑی۔ اس فضا کے ساتھ ہی نسیم کے گرد و پیش، امروہہ کا علمی و ثقافتی ماحول ان کی شخصیت کی تعمیر اور نظریات کی تشکیل میں کارفرما رہا اور اسی نے ان کے ذہن میں وہ مخصوص فکری رجحانات پیدا کیے جنھوں نے ان کے نظریات کو نکھار کر ان میں عمومیت کی جگہ خصوصیت پیدا کر دی اور وہ ایک نوجوان شاعر کی حیثیت سے اس انفرادیت کے حامل ہو کر دنیا کے سامنے آئے جو ابھی ان کے مخصوص ماحول نے عطا کی تھی۔

مذکورہ ماحول نے نسیم کو کیا کیا دیا تھا؟ اس کا جواب آپ کو ہمارا پورا مضمون پڑھ کر خود مل جائے گا، لیکن ہم اس موقع پر ان میں سے صرف ایک کے بارے میں مختصراً کچھ کہیں گے، اور وہ ہے "نظریہ انقلاب" جسے مرثیہ کے میدان میں نسیم امروہوی کا مخصوص اور بنیادی نظریہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس فضا اور اس ماحول کو ظاہر کرنے کے لیے جس کا ذکر کیا گیا اول ہم ان کے پہلے مرثیے سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

مرثیہ کے مطلع کا پہلا مصرع ہے:

تجھ میں اے باغ وطن اب گل خوش رنگ نہیں

حاضرین مجلس اہل امروہہ تھے، اور اہل وطن کے الفاظ سے بظاہر ان کو ہی مخاطب کیا گیا ہے لیکن معاشرے کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ کسی ایک شہر یا قصبہ کی نہیں بلکہ پورے ہندی مسلم معاشرے کی صحیح تصویر ہے:

تھا جو سرمایہ اسلاف وہ سب کام آیا   آفتاب آج ریاست کا لب بام آیا

یہ بیت مسلمانانِ ہند کی اُس اقتصادی اور سماجی کیفیت کو جو بیسویں صدی کے اوائل میں تھی تاریخی پس منظر کے ساتھ بہت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں ظاہر کر رہی ہے۔ یہ وہ دور تھا جب برصغیر کے مسلمانوں کی وہ جاگیریں جن کی آمدنی پر ان کے اعلیٰ متوسط طبقہ کی رئیسانہ زندگی کا دارومدار تھا عام طور پر تلف ہو چکی تھیں۔ گنے چنے جاگیر دار، تعلقہ دار اور والیان ریاست رہ گئے تھے۔ ان کے علاوہ ان نام نہاد روٴسا و امراء میں سے اکثر کی املاک ختم ہو چکی تھیں، جن کے اجداد سلطنت مغلیہ یا اس کے زوال میں جائدادیں حاصل کر کے ان کی آمدنی کے ذرائع فراہم کر گئے تھے۔ چونکہ ان لوگوں کو ذاتی کوشش اور جدوجہد کے بغیر تمول کی زندگی حاصل تھی اس لیے ان کی قوت عمل معطل ہو گئی تھی۔ البتہ اس فارغ البالی سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ فکر معاش سے آزاد ہونے کی وجہ سے ہی لوگ اس قابل ہوئے کہ اپنی تفریحِ طبع اور ذہنی تعیش کے لیے فنونِ لطیفہ کی طرف متوجہ ہوں۔

سلطنت مغلیہ کے وقت سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک اہل علم اور صاحبانِ فن کو سلاطین اور امرا کی سرپرستی حاصل تھی اور ان کے درباروں میں علما اور شعرا کا ایک بلند مقام تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد نہ وہ فرمانروا رہے، نہ وہ دربار، لیکن جاگیرداروں نے فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کی روایت کو برقرار رکھا۔ اور جہاں بھی لوگوں کے پاس اپنے گزارے کے لئے جائدادیں تھیں وہاں استطاعت رکھنے والے حضرات خود شعر و سخن کی محفلیں منعقد کرتے رہے کیونکہ شوقِ علم اور ذوقِ سلیم شرافت کی نشانی سمجھے جاتے تھے، جن لوگوں میں شعر و شاعری کا چرچا ہوتا تھا وہ مہذب اور شائستہ خیال کیے جاتے تھے۔ اور شائستہ لوگ محنت مزدوری اور دستکاری کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ نداقی، نجاری، خیاطی اور اسی طرح کے دوسرے کام کرنے والوں کو شرفا حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جاگیردارانہ نظام نے یہ ذہنیت پیدا کر دی تھی کہ مسلمانوں کا وہ طبقہ

جو شرافت وشائستگی کا مالک اور تمدن واخلاق کی اعلیٰ قدروں کا خود ساختہ علمبردار بنا بیٹھا تھا، عسرت وبدحالی کی زندگی بسر کرنے کو، اپنے ہاتھ سے کام کرکے روزی کمانے سے بہتر خیال کرتا تھا۔ اس ذہنیت کو نسیمؔ صاحب نے ایک بند میں یوں بیان کیا ہے:

پختہ کاروں کے سنے کوئی خیالات یہ خام
دستکاری کو تجارت کو سمجھتے ہیں حرام
کوئی پوچھے جو سبب کہتے ہیں یہ برسرِ عام
شان سادات کے شایاں نہیں یہ ادنیٰ کام
جیتے جی اب تو یہ آثار ہیں سب مرنے کے
فاقے کریں گے مگر کام نہیں کرنے کے

"پختہ کاروں" کا لفظ بتاتا ہے کہ یہ انیسویں صدی والی نسل کے خیالات ہیں بیسویں صدی کی نئی نسل کے نوجوان شاعر ماضی قریب کے اسلاف کی بے عملی اور ان کے نظریات کی خامی کا ان پرزور الفاظ میں ذکر کرکے اس انقلابی ذہنیت کی ترجمانی کررہا ہے جو اس کے ہمعصر تعلیم یافتہ نوجوانوں میں پیدا ہورہی تھی۔ بیت کی زبان مخاطب مجمع کی مخصوص مقامی زبان ہے جس کے استعمال نے مصرعہ میں نہایت درجہ بلاغت پیدا کردی ہے، کیونکہ حاضرینِ مجلس کے لیے برصغیر کے مسلمانوں کی ذہنیت کو اس سے زیادہ موثر الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ مسلمانوں کی اس نسل کے خیالات ہیں جس کی کیفیت خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے اپنے مسدس میں تفصیل کے ساتھ نظم کی ہے۔ نمونے کے طور پر مسدس حالیؔ کا ایک بند ہم یہاں نقل کرتے ہیں جس میں انھوں نے مسلمانوں کی تنگ نظری اور بے عملی کا ذکر کیا ہے:

مشقت کو محنت کو جو عار سمجھیں
ہنر اور پیشہ کو جو خوار سمجھیں
تجارت کو کھیتی کو دشوار سمجھیں
فرنگی کے پیسے کو مردار سمجھیں

تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی

نسیم امروہوی کے لڑکپن اور نوجوانی کے زمانے میں مسدس حالی مسلمانوں میں بہت مقبول تھا، جو اس امر کی دلیل ہے کہ وہ قوم کے خیالات، جذبات اور احساسات کی صحیح ترجمانی کرتا تھا۔ اس وقت قوم کے خیالات میں سب سے زیادہ دردناک اور مہلک خیال وہ تھا جسے چھٹے مصرعے میں ظاہر کیا گیا ہے:

وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی

مستقبل میں قوم کی تباہی کا بھیانک منظر لوگوں کی نگاہوں کے سامنے تھا اور عام خیال یہ ہوگیا تھا کہ مسلمانوں کی پستی اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ اب ایک قوم کی حیثیت سے ان کے زندہ رہنے کی کوئی امید باقی نہیں۔ نا امیدی کے اس جذبے کا حالی کو بھی احساس تھا اور وہ اس کے خطرناک نتائج کو بھی جانتے تھے۔ اس لیے وہ اسے دور کرنا چاہتے تھے اور انھوں نے اپنے مسدس میں ضمیمہ کا آغاز ہی اس بند سے کیا:

بس اے نا امیدی نہ یوں دل بجھا تو
جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو
ذرا نا امیدوں کی ڈھارس بندھا تو
فسردہ دلوں کے دل آکر بڑھا تو

ترے دم سے مردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں

حالی کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ پہلے شاعر ہیں جس نے قوم کے حالات اردو کی ایک طویل نظم میں اصلاحی نقطہ نظر سے پیش کیے، اور شعر کے ذریعے جذبہ قومی کو بیدار کرنے اور قوت عمل کو حرکت میں لانے کی کوشش کی۔ شعر کے

مقصد اور اس کی افادیت کے بارے میں اُن کا جو خیال تھا اُسے انھوں نے مسدس میں یوں نظم کیا ہے:

برا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے　　عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے　　مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دینگے شاعر ہمارے

پھر عرب کے شعرا کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ہوئے ان کے شعروں سے اخلاق صیقل
بڑی ان کے خطبوں سے عالم میں ہلچل

اور اپنے شاعروں کو قوم میں تعطل پیدا کرنے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں:

کہ عقلوں پہ پردے دیے ڈال انھوں نے
ہمیں کر دیا فارغ البال انھوں نے

اگرچہ حالی کے ذہن میں وہ مقصد جس کے حصول کے لیے انھوں نے مسدس لکھا بالکل واضح تھا، لیکن اس کے حصول میں فوری کامیابی حاصل نہ ہو سکی، کیونکہ جس دور میں وہ لکھا گیا اس کا تقاضا یہی تھا کہ مسلمانوں پہ نا امیدی و یاس کا غلبہ ہو، وہ سلطنت کی بربادی کو اپنی نا اہلیت کا نتیجہ سمجھیں اور اپنی قوم کو پست خیال کریں۔ اگرچہ مسدس میں قوم کے مرض کی تشخیص اور اس کا علاج دونوں موجود تھے، لیکن قوم پہ بیماری اس قدر حاوی آ چکی تھی کہ مریض کو اس وقت درد کی شدت کے باعث کراہنے ہی سے فرصت نہ تھی۔

با ایں ہمہ سر سید احمد خاں کی تحریک شروع ہو چکی تھی اور رفتہ رفتہ ترقی کی راہ دکھائی دینے لگی تھی، البتہ اس راہ پر گامزن ہونے کے لیے وقت درکار تھا

چنانچہ نسیم امروہوی کے لڑکپن ہی میں وہ زمانہ آگیا جب اقبال نے خیالات میں انقلاب پیدا کرنے کے لیے نظم کا ذریعہ اختیار کیا اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا عملی پروگرام پیش کیا، جس کا نتیجہ آج مملکت پاکستان کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ یا یوں سمجھیے کہ نسیم کے لفظوں میں یہ کہنے کا وقت آ گیا کہ:

روح کو خواب سے بیدار کریں گے ہم بھی عزم اور عزم عملدار کریں گے ہم بھی

پہلی جنگ عظیم کے بعد تمام ملک میں سوراج کی تحریک اور اس کے دوش بدوش مسلمانوں میں تحریک خلافت نے نوجوانوں میں ایک ولولہ پیدا کر دیا تھا اور ملک کی فضا "انقلاب زندہ باد" کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ اس نعرے میں ہندو مسلمان سب ہی شریک تھے، لیکن نعرہ لگانے والوں کے ذہن میں انقلاب کا مفہوم کیا تھا؟ اس کے بارے میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندو تو اس کا مطلب یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کی جگہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم کی جائے گی، مگر مسلمانوں کے سامنے کوئی واضح لائحہ عمل نہ تھا۔ وہ محض اپنے جذبۂ حریت کے تحت انقلاب کے نعرے میں ہندو کے شریک ہو گئے تھے۔ عام مسلمان کے ذہن میں انقلاب کا مطلب زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ انگریز کی حکومت سے نجات حاصل کی جائے۔ چنانچہ جو انقلابی نظمیں لکھی جاتی تھیں وہ بھی عوام کے جذبات میں ہیجان پیدا کرنے اور ان کو تخریب کی طرف مائل کرنے والی ہوتی تھیں اور بس!

جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں، اقبال کی نظمیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ علامہ اقبال کو دوسرے شعرا کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خود بھی اپنے کو گروہ شعرا سے جدا ہی شمار کرتے تھے، جس کا اظہار انھوں نے اپنے خطوط میں کیا ہے۔ وہ مولانا سید سلیمان ندوی کو اپنے خط مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء میں لاہور سے تحریر فرماتے ہیں:

"شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لئے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو۔ اور بس اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔"

اس کے سولہ سال بعد، ۲ راگست ۱۹۳۵ء کو بھوپال سے بھیجے گئے ایک خط میں مولانا موصوف ہی کو آئندہ نسلوں کا نہیں بلکہ خود اپنا فیصلہ ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں:

"میں نے کبھی اپنے کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی، ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے ورنہ:

نہ بینی خیر ازاں مرد فرودست
کہ بر من تہمت شعر و سخن بست

بہر حال ملک کی "انقلاب زندہ باد" کے نعروں سے گونجتی ہوئی فضا وہ تھی جس میں نسیم امروہوی کا جذبہ انقلاب بیدار ہوا۔ پھر امروہہ کے علمی اور ادبی ماحول نے ان کو اس راہ پر لگایا کہ وہ اس جذبے سے شعر و ادب کے میدان میں کام لیں۔ امروہہ میں عام تعلیم کا رواج اور شعر و شاعری کا چرچا صدیوں سے

ے تعلی پسند شعرا سبق لیں۔

چلا آتا تھا، مسلمانوں کی حکومت کے زمانے ہی سے وہاں کثیر تعداد میں مکتب تھے، جہاں سادات اور شرفاء کے بچے پڑھتے تھے اور تعلیم اتنی عام تھی کہ سادات میں تو کوئی بالغ و عاقل مرد ناخواندہ ہوتا ہی نہ تھا اور اب بھی نہیں ہوتا۔ علمائے دین میں امروہہ نے سید محمد میر عدل اور نجم الملۃ شمس العلما سید نجم الحسن اعلی اللہ مقامہ، مجتہد جیسی شخصیتیں پیدا کیں۔ شعر و سخن کے میدان میں امروہہ کو میر سعادت اور مصحفی جیسے سخنوروں کا وطن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ بقول محشر لکھنوی:

امروہہ در حقیقت ایوانِ شاعری ہے
مولد ہے مصحفی کا محشر ذرا سنبھل کر

باکمال شعراء اس قصبہ میں ہمیشہ پیدا ہوتے رہے جن میں سے صرف چند کو ملک میں شہرت حاصل ہوئی۔ اکثر شعرا کا کلام ان کی خانہ نشینی کی وجہ سے منظر عام پر نہ آسکا۔ امید ہے کہ عزیزی سید علی امام اپنے تذکرہ شعراء امروہہ میں جس کی تدوین میں وہ آج کل مصروف ہیں ایسے شعرا کے کلام کے نمونے پیش کرکے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کریں گے۔

جس زمانے میں نسیم امروہوی نے اپنا پہلا مرثیہ کہا اس وقت بھی امروہہ میں شعر و شاعری کی پرانی روایات برقرار تھیں، شہر میں مختلف مقامات پر تمام سال مشاعرے ہوتے تھے اور مقاصدے کی محفلیں ہوتی تھیں جن میں مقامی اور بیرونی شعرا شرکت کرتے تھے۔ اگر ان مشاعروں اور محفلوں کو امروہہ کے نوجوانوں کی ادبی درسگاہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان میں سید مظفر حسن منظر مرحوم، حکیم اسرار الحق شوق، انیق امروہوی اور انسر امروہوی جیسے اساتذہ بھی موجود ہوتے تھے اور حیات امروہوی مرحوم، نجم آفندی امروہوی مرحوم، تاباں امروہوی، مولانا کلیم امروہوی جواب بھی امروہہ ہی میں ہیں، نسیم امروہوی، رئیس امروہوی، مبارک سعید،

اور احسان امروہوی مرحوم نوجوان اور جوان شعرا بھی اپنا تازہ کلام پیش کیا کرتے تھے۔ اور فقط کلام سن لینے یا سُنا دینے ہی پر اکتفا نہ تھی، بلکہ تنقید و تبصرہ کا قدیم طریقہ بھی رائج تھا۔ اور مقامی شعرا میں باہم نوک جھونک رہتی تھی۔ بعض اوقات تو شاعر کی کسی فروگذاشت یا لغزش پر ہفتوں اور مہینوں تک بحث و تمحیث کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور اس میں لوگوں کا کافی وقت صرف ہوتا تھا۔

نسیم امروہوی کا خصوصیت کے ساتھ کم و بیش ایک سال ایسے ہی ایک مباحثہ کی نذر ہوا۔ ۱۹۲۳ء میں وہ مولوی کا امتحان پاس کرکے دوسرے سال عالم کا امتحان دینے کی تیاری کر رہے تھے کہ شہر میں ایک ادبی بحث شروع ہو گئی۔ واقعہ یہ ہوا کہ محلہ حقانی کے عزاخانے میں، ۱۱ رجب کی سالانہ محفل مقاصدہ کے لئے یہ مصرعہ طرح دیا گیا:

ہمسرِ مہرِ نبوت نقشِ پائے بوتراب

مصرع مولوی سید اولاد حسن اعلی اللہ مقامہ کا تھا جن کے انتقال کو چند سال گزر چکے تھے۔ مرحوم کی زندگی علم و فضل، زہد و تقویٰ، عجز و انکسار اور دیگر اوصاف کی وجہ سے مومنین و مسلمین کے لیے ایک نمونہ تھی اور شہر میں ہر مذہب و ملت کے لوگ آپ سے عقیدت رکھتے اور آپ کی بہت عزت کرتے تھے۔ فقہ، کلام، حدیث اور دوسرے علوم دین کے ساتھ ساتھ آپ فلسفہ، ادب اور عروض کے میدان میں بہت بلند پایہ رکھتے تھے اور اعلیٰ درجہ کے خوش نویس بھی تھے۔ سلیم تخلص تھا، حمد، نعت، غزل اور منقبت بھی کہتے تھے۔ تاریخ کے بہترین مصرعے کہتے تھے۔ امروہہ کے دو عزاخانوں پر آج تک آپ کی کہی ہوئی تاریخیں موجود ہیں جو فنِ تاریخ گوئی میں آپ کے کمال کے شاہد ہیں۔ ایک تاریخ محلہ کٹکوئی کے عزاخانے کی ہے:

عزاخانہ شہید کربلا کا

اور دوسری محلہ دانشمندان میں عزا خانہ حاجی سید نور الحسن کی ہے:

روئے والوں کے سروں پہ نور کا ہے سائباں

الغرض مقاصدہ شروع ہوا اور شعرا اپنے قصائد پیش کرتے رہے۔ نہایت خوشگوار فضا میں محفل اختتام کے قریب پہنچ گئی اور کہنہ مشق حضرات اپنا کلام پیش کرنے لگے۔ ان بزرگوں میں سے ایک صاحب نے اپنے قصیدے میں یہ شعر پڑھا:

بر سرِ مہرِ نبوت نقش پائے بوتراب ... سن کے تعریفاتؐ ہمسر ہم نے یہ ترمیم کی

یہ بزرگ سید آل احمد نعیم مرحوم تھے جو مولانا سید اولاد حسن اعلی اللہ مقامہٗ کے شاگرد بھی تھے۔ غالباً مصرع طرح میں لفظ "ہمسر" پر کسی نے اعتراض کیا تھا جس کا جواب دینے کی بجائے سید آل احمد نعیم مرحوم نے استاد محترم مرحوم کے مصرعے میں ترمیم کر دی (مجھے یاد نہیں کہ لفظ ترمیم تھا یا اصلاح) وہاں محفل میں اور چند بزرگ بھی ایسے موجود تھے جنھیں مولانا سید اولاد حسن اعلی اللہ مقامہٗ کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ ان کو یہ ناگوار ہوا۔ اُن میں سے ایک یعنی سید مجتبیٰ احسن مرحوم عرف مولوی چاند خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، کیونکہ نسیم صاحب سے یہ دریافت کرنے پر کہ اس مباحثے کا محرک کون تھا مجھے معلوم ہوا کہ مولوی چاند صاحب مرحوم ہی کے اشارے پر اسی محفل میں اس بحث کی ابتدا ہوئی تھی۔ نعیم مرحوم بزرگ تھے اور ان کے بعد کسی کم سن شاعر کے منبر پر جانے کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا، مگر نوجوان شاعر نسیم امروہوی کو شمیم مرحوم کا جانشین ہونے کی حیثیت سے باوجود کم عمری کے آخر میں کلام پیش کرنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ آپ بھی اس حیثیت سے مولانا سید اولاد حسن اعلی اللہ مقامہٗ کے شاگردوں میں شامل تھے کہ آپ نے موصوف سے ہدایۃ النحو پڑھی تھی۔ چنانچہ اشارہ پاتے ہی آپ نے موصوف کے خلاف چند اشعار وہیں کہہ لیے اور جب منبر پر گئے تو وہ اشعار پڑھ دیے:

وہ محفل تو ختم ہو گئی لیکن ایک طویل مدت کے لیے دو مقامی اخباروں (اتحاد اور قرطاس)

میں اس بحث کا سلسلہ شروع ہو گیا کہ مصرعِ طرح میں لفظ "ہمسر" زیادہ موزوں ہے یا "برسر"۔ جانبین سے اس موضوع پر مصرعہ طرح کی زمین میں اشعار کے ذریعہ اظہار خیال ہوتا رہا۔ مقاصدہ کے بعد نسیم امروہوی کے اُن اشعار کا جواب جو انھوں نے منبر پر پڑھے تھے اخبار اتحاد میں شائع ہوا، جواب الجواب فوراً ہی اخبار قرطاس میں چھپا اور پھر اس سوال و جواب کا یہ سلسلہ ایسا جاری ہوا کہ ہر پڑھے لکھے آدمی کو اس میں دلچسپی ہو گئی۔ لفظ "ہمسر" کے استعمال کی موزونیت پر تمام اشعار نسیم امروہوی کہتے تھے اور جب حکومت کی مداخلت سے یہ بحث ختم ہوئی تو اخبار قرطاس میں آپ کے ایک ہزار سے زائد اشعار ایک ہی زمین میں اس مسئلہ پر شائع ہو چکے تھے۔

باوجودیکہ اس مصروفیت کی وجہ سے نسیم امروہوی اس سال عالم کا امتحان نہ دے سکے لیکن یہ ان کی آئندہ ادبی زندگی کے لیے یقیناً مفید ثابت ہوئی۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس مباحثے نے اس نوجوان شاعر کی فنی تربیت کے لیے تجرباتی لیبارٹری کا کام کیا اور اس کو مستقبل میں پیش آنے والے ادبی و فنی معرکوں کے لیے اچھی طرح تیار کر دیا۔

جب یہ معاملہ ختم ہو گیا تو نسیم صاحب پھر تعلیم کی طرف پوری طرح متوجہ ہوئے ۱۹۲۶ء میں عالم، ۱۹۲۷ء میں فاضل ادب، اور ۱۹۲۸ء میں کامل کے امتحانات پاس کیے۔ ایک سال بعد فاضل فقہ کی سند حاصل کی۔ ۱۹۲۸ء میں ہی آپ نور المدارس میں معلم ہو گئے تھے۔ اُسی سال چند ماہ بعد منصبیہ کالج میرٹھ میں ملازم ہوئے اور دار العلوم میرٹھ میں بھی معلم کے فرائض انجام دینے لگے۔

اگرچہ آپ نے کسی کالج یا یونیورسٹی میں انگریزی تعلیم حاصل نہیں کی۔ اور مغرب زدگی کا شکار نہ ہوئے لیکن اُس تعلیم کے مفید تر اثرات سے محروم بھی نہ رہے، کیونکہ سادات امروہہ کی سوسائٹی جس کے ایک فرد آپ بھی ہیں کچھ ایسی خصوصیات رکھتی تھی کہ اس میں

انگریزی داں اور عربی داں ایک دوسرے کے خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ سوسائٹی ایک برادری تھی جس کے تمام افراد ایک دوسرے سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ تقریبات اور ثقافتی اجتماعات میں تو سب لوگ یکجا ہوتے ہی تھے۔ اس کے علاوہ روزمرہ زندگی میں بھی مشرقی اور مغربی طرز کی تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان مل کر بیٹھتے اور نجی معاملات سے لے کر سیاسی اور علمی و ادبی مسائل تک سب پر ہی باہم تبادلۂ خیال کرتے رہتے تھے۔ اختلاف رائے کی صورت میں گھنٹوں بحثیں ہوا کرتی تھیں جن میں فلسفہ، ادب، سائنس، اقتصادیات، سیاست وغیرہ میں سے کوئی بھی موضوع ہو سکتا تھا۔ بحث کرنے والے اپنے نقطۂ نظر کی صحت پر مستند کتابوں اور علما و سلف کے اقوال سے دلائل پیش کرتے تھے اور قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ شدید اختلاف رائے کے باوجود خالص علمی مباحث ہی رہتے تھے تعلقات میں کوئی کشیدگی پیدا نہ ہوتی ہمارے زمانہ طالب علمی میں جو نسیم صاحب کا بھی طالب علمی کا زمانہ تھا تبادلۂ خیال کی یہ روایت عروج پر تھی۔ ان بحثوں میں حصہ لینے والوں میں سے منصور حسین نجم، معزز حسین نقوی، کاظمین احمد نقوی تو مرحوم ہو چکے۔ کچھ ہندوستان ہی میں رہ گئے۔ یہاں اس وقت سید محمد تقی، رئیس امروہوی، نسیم امروہوی موجود ہیں اور راقم الحروف ہے۔

اس تفصیل بیان سے ہمارا مقصد اس حقیقت کو واضح کرنا تھا کہ ساداتِ امروہہ کی سوسائٹی میں انگریزی تعلیم یافتہ اپنی جگہ اور عربی تعلیم یافتہ اپنی جگہ ایک دوسرے کے علم سے بہرہ ور ہوتے تھے جس کے نتیجے میں ان کا گریجویٹ دین و مذہب اور اپنی قوم کے قدیم علمی سرمایہ سے بے بہرہ نہ ہوتا تھا اور عربی فارسی کا فاضل "کٹھ ملا" نہ ہوتا تھا۔ دونوں کے نظریات پر ایک دوسرے کا اثر ہوتا تھا اور دونوں ایک دوسرے کے علم سے مستفید ہوتے تھے۔

یہ تھا وہ مقامی ماحول جس میں نسیم امروہوی کے فکری رجحانات نے خصوصیت حاصل

کی اور اُن کے نظریات قائم ہوئے۔ اسی ماحول میں ان کے فنّی ارتقاء کا آغاز ہوا۔ "انقلاب زندہ باد" کے نعرے سے گونجتی ہوئی ملک کی فضا نے دوسرے نوجوانوں کی طرح ان کو بھی متاثر کیا اور اُن کے جذبہ انقلاب کو بیدار کیا۔ امروہہ کے مذہبی، علمی، ادبی اور ثقافتی ماحول نے اُس جذبہ کو آلۂ تخریب بننے سے روکا اور تعمیری سرگرمیوں کی طرف مائل کیا۔ اُن کے یہاں انقلاب کا مقصد مارڈالو اور مرجاؤ نہیں بلکہ جیئو اور جینے دو اور جی کر خود ترقی کرو قرار دیا۔ ان کی شاعری میں "انقلاب زندہ باد" محض ایک ہیجانی نعرہ نہیں بلکہ ایک مکمل فلسفہ حیات بن کر سامنے آتا ہے جس کی بنیادیں یونان، جرمنی، فرانس، انگلستان یا روس کے مفکرین کے خیالات پر نہیں بلکہ کائنات کے اُس نظریے پر رکھی گئی ہیں جو خالق کائنات کے بھیجے ہوئے مصلحین نے پیش کیا۔ یہ وہ نظریہ ہے جو سیاست و اقتصادیات تک محدود نہیں، بلکہ انسانی زندگی سے بھی آگے بڑھ کر موجودات اور کُل کائنات کو اپنے پہلو میں لیے ہوئے ہے۔ ہم یہاں اُس نظریہ کو اجمالاً چند الفاظ میں بیان کرتے ہیں اور وہ، یہ ہے:

انقلاب تقاضائے فطرت ہے۔ اصول انقلاب خود خلقت کائنات کے اندر پائے جاتے ہیں، اس لیے انقلاب ایک دائمی حقیقت ہے، جو کائنات میں مسلسل حرکت، تغیر اور ارتقا کی صورت میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ انسانی زندگی میں صحیح خطوط پر انقلاب اس وقت رونما ہو سکتا ہے جب تاریخ اور مشاہدے کی روشنی میں ایسی راہِ عمل نکال جائے جس پر چلنے سے انسان کی روحانی اور مادی دونوں ضرورتیں مناسب توازن کے ساتھ پوری ہو سکیں۔ ایسی راہِ عمل انبیا و اولیا نے بتائی جو خالق کائنات کی طرف سے وقتاً فوقتاً اس لیے بھیجے گئے کہ انسانی معاشرے میں نظم و ضبط قائم کریں اور اس کی اصلاح کرتے رہیں۔ لہٰذا ان ہستیوں کے اتباع ہی کا دوسرا نام جادۂ انقلاب پر گامزن ہوتا ہے۔

اس نظریے کی جھلک تو نسیم امروہوی کے پہلے ہی مرثیہ میں موجود ہے۔ لیکن عمر کے ساتھ ساتھ ان کے علم اور تجربے میں اضافہ ہوتا رہا، خیالات میں پختگی آتی رہی اور فن بھی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ شاعری اور اس میں بالخصوص مرثیہ نگاری اُن کا آبائی فن تھا، اس لیے انھیں اپنے نظریے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مرثیہ کا میدان ہی سب سے زیادہ مناسب معلوم ہوا اور وہ شروع ہی سے اس صنف شعر میں جدت پیدا کرنے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

سنہ ۱۹۲۹ء میں آپ لکھنؤ گئے۔ وہاں اپنے چچا زاد بھائی مولوی سید سرور حسین مرحوم و مغفور کے ساتھ مدرسۃ الواعظین میں قیام کیا اور جوبلی انٹرمیڈیٹ کالج میں مولوی محمد حسین صاحب کی جگہ، جو اُن دنوں رخصت پر تھے اردو فارسی پڑھائی شروع کی۔ ساتھ ساتھ مولانا سید ابوالحسن عرف منّن صاحب سے درسِ نظامی لیتے رہے۔ اُسی زمانے میں نسیم البلاغت کے نام سے ایک درسی کتاب لکھی جو محکمۂ تعلیم کی طرف سے انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں منظور ہو گئی۔ مگر سرکاری ملازم ہوتے ہوئے پرنسپل کی وساطت کے بغیر ان کا یہ عمل کالج کے پرنسپل کی نظر میں ناپسندیدہ اور خلاف قانون تھا، نسیم صاحب نے اپنے ذہن اور ادبی مشاغل پر اس پابندی کو گوارا نہ کیا اور جواب دہی سے بچنے کے لیے سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔ چھ ماہ بعد چرچ مشن ہائی اسکول میں استاد کی حیثیت سے تقرر ہو گیا اور علم و ادب کے میدان میں اپنی مرضی کے مطابق آزادی کے ساتھ کام کرنے لگے۔ اب آپ کی انقلابی فکر کا عمل، مرثیے کے میدان میں کھل کر سامنے آنے کا وقت آگیا۔

اس کا مظاہرہ پہلی بار سنہ ۱۹۳۲ء میں اُس مرثیہ میں ہوا جس کا مطلع ہے:

اے انقلاب مژدۂ عزم و عمل ہے تو ۔۔۔ رنگینیٔ حیات کے گلشن کا پھل ہے تو
تعمیر کائنات نہ صرف آج کل ہے تو ۔۔۔ آدم کو باغ خلد کا نعم البدل ہے تو

گردش بتا رہی ہے یہ لیل و نہار کی
تو ہے دلیل ہستی پروردگار کی

نسیم کا یہ مرثیہ اس مجموعہ مراثی میں موجود ہے جو کراچی میں مراثی نسیم (جلد اول) کے نام سے ڈاکٹر سید صفدر حسین کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ مرثیہ سے پہلے یہ نوٹ لکھا ہوا ہے۔

"یہ سب سے پہلا مرثیہ ہے جس میں مصنف نے حقائق اور عقائد کو فلسفیانہ انداز بیان کے سانچے میں ڈھالا اور جدید تخیل کو قدیم فنی بلندیوں کے ساتھ سمو کر مرثیہ گوئی میں ایک نئے رنگ کی بنیاد ڈالی"

۱۹۳۶ء میں یہ مرثیہ "روح انقلاب" کے نام سے نظامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ نسیم امروہوی نے اسے ۱۹۳۵ء میں ناظم صاحب کے امام باڑے میں پڑھا تو سامعین کو اس کا رنگ جو روایتی مرثیے سے الگ ہے کچھ عجیب سا معلوم ہوا۔ اخبار نظارہ میں اس پر تبصرہ بھی شائع ہوا۔ مگر نسیم صاحب کو اس پر کوئی تعجب نہ ہوا، وہ جانتے تھے کہ ایسا ہوگا اور مقطع کے بند میں وہ پہلے ہی کہہ چکے ہیں:

بس اے نسیم روک لے خامہ کو اب ذرا — سن جبرئیل کہتے ہیں واللہ مرحبا
ہٹ کر جو طرز عام سے یہ مرثیہ کہا — اس وادی سخن میں یہ جادہ نیا بنا
اک تازہ طرز فکر کا سورج طلوع ہے
دور جدید مرثیہ گوئی شروع ہے

یہاں ہم اس تمہید پر اکتفا کرتے ہیں۔ نسیم امروہوی کی مرثیہ نگاری پر تفصیل کے ساتھ آئندہ لکھیں گے۔

سید نعیم حسن ۲ دسمبر ۱۹۷۶ء کراچی

نسیم امروہوی کی مرثیہ گوئی

سیّد وقار عظیم

پچاس سال تک کسی مقصد کی لگن میں مصروفِ عمل اور سرگرمِ سفر رہنا بجائے خود ایک اہم واقعہ ہے، لیکن یہ واقعہ اگر اس طرح پیش آئے کہ مسلسل پچاس سال تک یہ سفرِ شوق جاری رکھنے والا رہروِ سفر کے مختلف مرحلوں میں ایسے نقشِ پا چھوڑتا جائے کہ مستقبل کے رہرو کے لیے رہبر و رہنما بن جائیں تو سرگرمیٔ سفر کا یہ واقعہ اہم ترین جاتا ہے۔ یہی اہم اور اہم تر واقعہ سیّد قائم رضا نسیم امروہوی کے ساتھ پیش آیا ہے۔ نسیم صاحب نے مرثیہ گوئی کا آغاز ۱۹۲۳ء میں کیا جب ان کی عمر بمشکل ۱۵ سال تھی، اس بات کو اب باون سال ہونے کو ہیں اور اس دَوران نسیم صاحب نے ڈیڑھ سو سے زیادہ مرثیے کہے ہیں۔

۱۹۲۳ء والے مرثیے میں ۹۷ بند ہیں، اس کا پہلا بند یہ ہے :-

تجھ میں اے باغِ وطن اب گلِ خوش رنگ نہیں کسی وش پر گل و بلبل میں یہاں جنگ نہیں
تن پہ کس غنچے کے ہستی کی قبا تنگ نہیں ٹھاٹھے ہیں وہی ماضی کے وہ اور رنگ نہیں

آنکھ با وصفِ تنگّر جو بھر اٹھ جاتی ہے
فقر کی شاہیٔ بے ملک نظر آتی ہے

اگلے بندوں کی کیفیت یہ ہے کہ سب سے پہلے چند بندوں میں موجودہ دَور کے مسلمانوں کی زبوں حالی پر رنج و غم کا اظہار کیا گیا ہے۔ مسلمانوں میں نہ طلبِ فن کی خواہش ہے نہ زرِ وسیم وہ کسبِ معیشت کی طرف سے غافل ہیں، ہر طرف بے عملی کا دَور دورہ ہے اور مسلمان کو فاقہ مستی، کام سے زیادہ عزیز ہے، اور انھوں نے یہ بات قطعاً فراموش کر دی ہے کہ کام ہی مسلمان کی میراث ہے؛ اور یہ میراثِ ابراہیمؑ، نوحؑ، داؤدؑ اور کلیمؑ جیسے پیغمبروں سے گذر کر احمدِ مختار صلعم کے گھرانے کے وسیلے سے ہم تک پہنچی ہے، اور کام کی اس مسلسل اور متواتر میراث میں معماری، نجاری، زرہ سازی

کے علاوہ ایندھن کی لکڑیاں چننے اور چکی پیسنے کی مشقتیں بھی شامل ہیں، اور ہم کہ جو اِس مقدس ورثے کے وارث اور امین ہیں فقر و ناداری کی مملکت کے تاجدار بے ملک بنے، محض اپنی عالی نسبی کے تصور میں مگن، زندگی کے شب و روز بسر کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کی اسی بوالعجبی کی طرف اشارہ کرکے شاعر نے انھیں عصرِ نو کے تقاضوں کی طرف متوجہ کیا ہے جو پکار پکار کر انسان کو دعوتِ عمل اور دعوتِ انقلاب دے رہے ہیں۔

مرثیے کے سترھویں بند میں کربلا کے واقعات کی طرف گریز ہے۔ چند بندوں میں واقعاتِ کربلا کا ایک خیالی نقش بنایا گیا ہے، اس کے بعد صبح کی منظر کشی ہے، گرمی کی شدت کا بیان ہے، رزم کا نقشہ ہے، تلوار کی تعریف ہے، مصائب کا بیان ہے، اور مرثیہ اس بند پر ختم ہوتا ہے:-

بس قلم روک لے اے مرثیہ گوئے شبیرؑ	غش نہ ہو جائیں عزادارِ امامِ دلگیر
شکر کر اب کہ بہ افضالِ خداوندِ قدیر	باپ دادا کی مجھے مل گئی اصلی جاگیر
اِس عطا کا سنِ تصنیف یہ لکھا قائمؔ
آفریں خوب ہے یہ مرثیہ پہلا قائمؔ

۱۹۲۳ء

اِس مرثیے کا تجزیہ کیجیے تو کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ مرثیے کے وہ تمام اجزا مرثیہ نگار کے سامنے ہیں جو ضمیرؔ اور خلیقؔ کے وقت سے اس کی روایت کا حصہ بنے اور جن کی فنی تکمیل انیسؔ اور دبیرؔ کے ہاتھوں ہوئی، مرثیہ نگار کو مرثیے کے رثائی مقصد کا واضح احساس ہے، اس کے سامنے رزم و بزم کے وہ حسین و دل آویز مرقعے ہیں جو انیسؔ کی مہارتِ قلم نے ترتیب دیئے ہیں۔ انیسؔ ہی کے زیرِ اثر اُسے یہ احساس بھی ہے کہ مرثیے کے مختلف اجزا میں صبح کے مناظر کے ذکر، گرمی کی شدت کے بیان اور رزم کی مرقع کشی کو کتنی اہمیت دی گئی ہے۔ اُسے اس بات کا علم بھی ہے کہ مرثیے کے مختلف اجزا کی ترتیب و تزئین میں تغزل اور اس کے جملہ فنی لوازم کو کس حد تک

دخل ہے اور مرثیے کے ان اجزا میں سے ہر ایک کی مخصوص تاثیر کا انحصار اس بات پر ہے کہ موضوع کی مناسبت سے بیان کے لہجے میں زیر و بم رونما ہوتا رہے۔

پندرہ سال کی عمر میں مرثیے کی روایت اور اس کے فنی رموز سے اس درجہ آگاہی جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا، نتیجہ ہے اس ذہنی تربیت کا جو نسیم صاحب کو اپنے قریبی ماحول سے بالواسطہ اور بلاواسطہ حاصل ہوئی، گھر میں رات دن مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا چرچا تھا، پھوپی[1] مرثیہ کہتی تھیں، نانا اور ان کے دو بھائی[2] مرثیہ خوانی میں مشہور تھے، والد، دادا اور پردادا شاعر تھے اور نسیم کو یہ ذوق ورثے میں ملا، اس وہبی ذوق کو جن بہت سی چیزوں نے جلا دی ان میں یہ بات بھی شامل ہے کہ انھوں نے آبِ حیات، موازنۂ انیس و دبیر، مقدمہ شعر و شاعری، شعر العجم، شعر الہند اور یادگارِ انیس جیسی کتابوں کے علاوہ انیس کے چند مرثیوں کا مطالعہ درس کے طور پر کیا اور ابتدا ہی سے مشقِ سخن کی کاوش کو اپنا معمول بنایا۔

مرثیے اور مرثیے کی روایت اور اس کے فن سے اسی قریبی نسبت اور تعلقِ خاطر کا نتیجہ ہے کہ نسیم نے مرثیہ گوئی میں انیس کو اپنا امام تسلیم کیا، چنانچہ ۱۹۲۳ء والے مرثیہ میں قدم قدم پر اس نسبت اور تعلقِ خاطر کا اثر نمایاں ہے، مرثیہ کے ان حصوں کا مطالعہ کریں جن میں صبح کے منظر اور گرمی کی شدت کے بیان اور تلوار کی تعریف ہوتی ہے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ شاعر نے اپنی پوری توجہ انیس کی طرح "ایک مضمون کو سو رنگ میں" باندھنے پر صرف کی ہے، تخیل کے زور سے مضامین میں نئے پہلو نکالے ہیں اور ہر جگہ ان شاعرانہ وسائل سے مدد لی ہے جو لطفِ بیان اور حسنِ کلام کا موجب بنتے ہیں۔

پہلے مرثیے کی جن خصوصیات کی طرف میں نے اب تک اشارہ کیا ان میں سے کوئی

---

[1] مدینہ خاتون مرحومہ (دورِ حاضر کے مرثیہ گو سردار محمد نقوی سیکرٹری سیکنڈری بورڈ آف ایجوکیشن برائے کالجز کی دادی)

[2] سید ذکی حسن مرحوم، سید نجم الحسن مرحوم، سید انجم حسن مرحوم (آخر الذکر سید سرکار حسن (اخبار جنگ) کے والد تھے)

ایسی نہیں جسے ہم نیا کہہ سکیں، نئے پن کا اظہار اس بات سے البتہ ہوتا ہے کہ جو مضامین مراثی انیس کے مطالعے کے بعد ذہن میں جاگزیں ہو گئے ہیں شاعر ان میں نئے رُخ تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف ہے اور اس کوشش میں اس کے قلم سے ایسے مصرعے اور شعر بھی نکل جاتے ہیں جن کی داد دینی پڑتی ہے، لیکن اس روایتی اثر سے قطع نظر مرثیے میں ایک بات ضرور ایسی ہے جو ایک ایسے رجحان کی نشان دہی کر رہی ہے جو آگے چل کر نسیم کے مرثیے کا سب سے واضح اور سب سے اہم رجحان بن گیا۔

مرثیے کے پہلے بند میں وطن کو "اے باغِ وطن" کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے اور اگلے بندوں میں اہلِ وطن کی زبوں حالی کے اسباب بتاتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ان کی ساری خرابیوں کی بنیاد ان کی "بے عملی" ہے۔ شاعر نے بے عملی کو ایک سبب قرار دے کر اسے محض بے عملی کہنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس کے ذکر اور بیان میں حتی الامکان پورا زورِ کلام دکھایا ہے اور اس کے مقابلے میں "عمل" کی اہمیت واضح کرنے پر بھی اتنا ہی زور صرف کیا ہے۔ مرثیے کے دوسرے بند کا تیسرا مصرع ہے۔ ع

ہر طرف بے عملی، بے عملی، بے عملی

ظاہر ہے کہ یہاں "بے عملی" کی تکرار بے سبب نہیں۔ پانچویں بند میں یہی بات اور بھی شدت کے ساتھ کہی گئی ہے۔ ع

فاقے کر لیں گے مگر کام نہیں کرنے کے

گیارھویں بند میں بات ایک مثبت شکل اختیار کرتی ہے۔ ع

وہی زندہ ہے جو کچھ کام یہاں کر جائے

اور بارھویں بند میں دعویٰ ایک عالمگیر کلیے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ؎

جی گیا وہ جو قتیلِ غمِ ایّام ہوا   کام سے کام رہا، کام ہوا، نام ہوا

مرثیے کا یہ لہجہ معلمانہ اور خطیبانہ ہے اور اس لہجہ کا محرک اہلِ وطن کی اصلاح کا

جذبہ ہے، اصلاح کے اس احساس کو شاعر نے وہی صورت دی ہے جس کا اظہار حالی کے مسدس اور اقبال کے "شکوہ اور جوابِ شکوہ" میں بڑے دل نشیں شاعرانہ انداز میں ہوا ہے۔ نسیم نے بھی اپنے مرثیے میں اسلاف کے کارناموں کا ذکر کر کے موجودہ نسل کے مسلمان کو بیداری اور حسنِ عمل کا راستہ دکھانے کی روش اپنائی ہے اور اپنے خیال کے اظہار کے لیے جو پیرایہ اختیار کیا ہے اس میں صاف حالی اور اقبال کی آوازوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ مرثیہ کا پندرھواں بند یہ ہے :-

ہم ہیں عرفان و حقیقت کے پرستاروں میں　　　کلمہ ہم نے پڑھا تیغوں کی جھنکاروں میں
سر جھکایا نہ کبھی ظلم کے درباروں میں　　　انتہا یہ کہ چنے بھی گئے دیواروں میں

سبز یہ باغ ہوا ذوقِ نمو سے اپنے
ہم نے اسلام کو سینچا ہے لہو سے اپنے

مرثیے کو ملت کی اصلاح اور ترقی کا ذریعہ بنانے کا جو رجحان ایک خاص شکل میں ذرا محدود پیمانے پر اس مرثیے میں ملتا ہے اس نے نسیم کے مرثیوں میں آگے چل کر تین صورتیں اختیار کیں۔ پہلی تو یہ کہ مرثیے کو ہر طرح کے اصلاحی پیغام کے اظہار کا وسیلہ بنایا گیا، دوسرے یہ کہ اصلاحی پیغام اسلاف کے کارناموں کے پس منظر میں تاریخی واقعات کے حوالے سے پیش کیا گیا اور تیسرے یہ کہ "عمل" کو زندگی کی ہر کامیابی کی اساس سمجھ کر ہر ممکن زاویے سے اس کی تاکید کی گئی اور یوں نسیم کے مرثیہ بہ حیثیت مجموعی جہاں ایک طرف عمل کے ایک واضح اور مخصوص فلسفے کا حامل اور پیغامبر بنا اس نے تاریخ کے رشتے سے قوم کے ماضی اور حال میں ایک بامعنی ربط پیدا کرنے کی اہمیت بھی واضح کی۔ نسیم نے ماضی اور حال کو مربوط کرنے کے اس عمل میں ان مہتم بالشان شخصیتوں کی سیرت کو مشعلِ ہدایت بنایا جن کے وجود کے نور کی تابانی سے تاریخ کے افق کا گوشہ گوشہ منور و معمور ہے۔

"تجھ میں اے باغِ وطن اب گلِ خوش رنگ نہیں" کی اشاعت کے بعد سے نسیم کی مرثیہ نگاری نے جو رخ اختیار کیے اور موضوع اور بیان کے نقطۂ نظر سے ان رجحانات نے جن کا اظہار ان کے لکھے ہوئے پہلے مرثیے میں ہوا تھا، کیا کیا صورتیں اختیار کیں اس کا اندازہ کرنے کے لیے ان مراثی کا

مطالعہ کرنا چاہیے جو مراثیٔ نسیم (جلد اوّل) میں شامل ہیں۔ یہ کتاب کُل تیرہ مرثیوں کا مجموعہ ہے۔ ایک مرثیے کے علاوہ جو ۱۹۵۲ء میں لکھا گیا باقی مرثیے ۱۹۳۳ء اور ۱۹۴۲ء کے درمیانی وقفے میں لکھے گئے۔ ان مرثیوں میں مضامین اور موضوعات کا جو تنوّع ہے اور مرثیے کی مروجہ اور روایتی وضع سے جو انحراف ہے اسے دیکھ کر صاف پتہ چلتا ہے کہ شاعر نے مرثیہ کو ایک نیا نہج اور نیا انداز دینے اور اسے ایک خاص اصلاحی مقصد کے اظہار کا وسیلہ بنانے کی جس روش کی طرح ڈالی تھی نہ صرف یہ کہ وہ اس پر مستقل مزاجی سے گامزن ہے بلکہ اسے شاہراہ بنا کر اس میں سے نئی راہیں نکالنے کے عمل میں بھی مصروف ہے۔ فہرست میں مختلف مراثی کا جو مختصر خلاصہ درج ہے اس سے ان راہوں اور روشوں کا سراغ نکالنے میں تھوڑی سی مدد ملتی ہے۔ اس مختصر خلاصے پر ایک نظر ڈالیے:-

۱۔ حمد، نعت، شہادت حضرت علی اکبرؑ

۲۔ نعت معراج، وفات حضرت سکینہؑ

۳۔ منقبت و ولادت و شہادت حضرت علی بن ابی طالبؑ

۴۔ مناقب و عقد جناب سیدۂ عالم و مصائبِ اہلِ حرم۔

۵۔ فضائلِ امام حسینؑ، ملّت کے امراض اور ان کا علاج، ساقی نامہ اور اس میں مصائب۔

۶۔ فضائلِ امام حسینؑ، دورِ یزید کا مختصر خاکہ اور ان حالات میں تبدیلی کے لیے ایک مردِ مجاہد کی ضرورت اور مصائب حضرت امام حسینؑ

۷۔ فضائل و ولادتِ امام حسینؑ، مختصر شہادت کا حال

۸۔ عورت کے فضائلِ نفسِ اسلام میں، مناقب جناب زینبؑ اور ذمہ داریوں کی تکمیل میں ان کی دلیری اور پامردی۔

۹۔ حضرت حُر (علیہ السّلام)

۱۰۔ نعت، خواب میں جنت کی سیر اور رضوان سے مکالمہ اور بہجت و بھجت جنّت کی تصویر، شہادت جناب علی اکبرؑ

۱۱۔ غم اور خوشی کا فلسفہ، حدیث "مَنْ بَکیٰ عَلَی الحسین" کی وضاحت، عقل و نقل سے گریہ وزاری اور سامانِ عزاداری کی حقانیت کا اثبات، اہلِ حرم کی شام کے زنداں سے مدینہ میں واپسی۔

۱۲۔ قیدِ بنارس کے حالات، مناقب و ولادت حضرت زین العابدین علیہ السلام اور زندانِ شام میں ورودِ ہندہ۔

۱۳۔ فضائل ائمہ اثنا عشر، ولادت امامِ زماں اور وجود و غیبت کا اثبات، مصائب حضرت امام حسین علیہ السّلام۔

ان تیرہ مرثیوں میں سے نمبر ۳، ۱۹۵۳ء کا لکھا ہوا ہے۔ موضوعات کے تنوّع اور ندرت کے اعتبار سے ان کے مطالب کا تجزیہ کیجیے تو کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ مرثیے کے رواجی اور روایتی موضوعات کے علاوہ شاعر نے مرثیے کی بنیاد بعض ایسے موضوعات پر رکھی ہے جنھیں یا تو اب تک مرثیے میں شامل ہی نہیں کیا گیا تھا یا ان کا بیان محض تبرک کے طور پر کیا جاتا تھا، مثلاً پہلے، دوسرے، دسویں اور گیارہویں مرثیوں میں حمد و نعت کے مضامین، تیسرے اور چوتھے مرثیوں میں حضرت علی بن ابی طالبؑ اور جناب سیّدہ عالم کے مناقب کا تفصیلی بیان مرثیے کی عام روش سے جداگانہ ایک صورت ہے۔

دوسرے یہ کہ جن شہدائے کربلا اور اہلِ بیت کے فضائل کو مرثیے کا موضوع بنایا گیا ہے، ان میں علی الترتیب حضرت علی اکبر، حضرت سکینہ، حضرت امام حسین، حضرت حُر، حضرت زین العابدین کے مناقب بیان ہوئے ہیں، منقبت کے ان سات مرثیوں میں جن کا موضوع یہ مناقب ہیں چار حضرت امام حسین کے مناقب کے لیے مخصوص ہیں۔

تیسری بات یہ کہ ان منقبتی مرثیوں میں بعض ایسے مضامین نظم ہوئے ہیں جنھیں اب تک مرثیے کے موضوعات نہیں سمجھا جاتا تھا، یہ موضوعات ملّتِ اسلامیہ کے احوال و کوائف اور اصلاح سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً پانچویں مرثیے میں ملّت کے امراض اور ان کا علاج، چھٹے مرثیے

میں حالات میں تبدیلی کے لیے ایک مردِ مجاہد کی ضرورت ایسے قومی مسائل ہیں جن سے مرثیے کا دامن اب تک خالی تھا۔

چوتھی بات جوان مرثیوں میں سے ایک میں (مرثیہ نمبر ۱۱) بڑے واضح انداز میں ملتی ہے یہ ہے کہ غم اور خوشی کے فلسفے پر حکیمانہ انداز میں بحث کی گئی ہے اور عقل و نقل سے گریہ و زاری اور سامانِ عزاداری کی حقانیت کا اثبات کیا گیا ہے، ان حکیمانہ مباحث کی اساس رسولِ کریمؐ کی ایک حدیث کو بنایا گیا ہے۔

ایک اور بات جو دسویں مرثیے کے مطالب پر نظر ڈال کر واضح ہوتی ہے یہ ہے کہ شاعر نے تصویر کشی اور مکالمہ نگاری کے اس ادبی اور فنی میلان کو نئے رُخ دیئے ہیں جسے انیسؔ کے اعلیٰ فنی اور جمالیاتی احساس نے پروان چڑھایا۔

یوں گویا جب ہم نسیمؔ امروہوی کی مرثیہ نگاری کے اس دس سالہ دور پر نظر ڈالتے ہیں جس کا احاطہ "مراثیِ نسیم" کے بارہ مرثیے کرتے ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ اس شاعر اہلبیت کا فنی اجتہاد کے مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا اس منزل کی طرف جا رہا ہے جہاں وہ محض عقیدت، محبت اور تکریم کے احساسات کا ترجمان ہونے کی بجائے حقائقِ حیات کا مفسّر اور انسانی زندگی کے اعلیٰ و ارفع مقاصد کا مُبلّغ بننے کا منصب ادا کرے۔ ایک بلند اور رفیع مقصد کی لگن اور فن کے وسیع امکانات ابھر کر سامنے آتے ہیں اور جہاں روایت اور جدّت کے امتزاج سے خیالات و تصورات کا دامن بھی وسیع ہو رہا ہے اور بیان و اظہار کے ایسے وسیلے بھی وجود میں آ رہے ہیں جو نئے خیال اور نئے تصور کے ابلاغ کو آسان اور مؤثر بنا رہے ہیں۔ نسیمؔ کی مرثیہ نگاری کے اس دور میں مرثیت کے جملہ تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے بھی ایک وسیع تر قومی خدمت انجام دینے کا فریضہ ادا کر رہا ہے۔

۱۹۳۳ء اور ۱۹۴۲ء کے مرثیوں کے مطالب اور اسالیب کی طرف جو مجمل اشارے کیے گئے ان کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے میں اسی دَور کی ایک اور نظم کے حوالے سے چند

باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں ، یہ نظم نسیم امروہوی نے ۱۹۴۳ء میں لکھی اور ۱۹۴۴ء میں "برق وباراں" المعروف بہ "مسدسِ نسیم" کے نام سے لاہور سے شائع ہوئی، اس نظم کو مرثیہ میں نے کئی اسباب کی بناء پر نہیں کہا۔ اوّل تو اس لیے کہ اس میں رثائی پہلو صرف کہیں کہیں ہے اور جہاں کہیں ہے وہ کسی واضح مثبت مقصد کا تابع ہے۔ دوسرے یہ کہ واقعۂ کربلا کا ذکر، جسے ہمارے مراثی میں بنیادی موضوع کی حیثیت حاصل ہے، پوری اسلامی تاریخ کے پس منظر میں اس طرح آیا ہے کہ عمل اور جدوجہد کی صدہا سال کی روداد میں اسے بھی ایک اہم سنگِ میل اور چراغِ راہ کی حیثیت حاصل ہے اور تیسرے یہ کہ اس نظم میں شروع سے آخر تک انقلابی احساس کو ابھارنے کی جو تدبیریں کی گئی ہیں ان میں غم انگیز مضامین کی گنجائش نہیں، یہی وجہ ہے کہ نظم میں ایک جگہ واقعۂ کربلا کا ذکر جس انداز سے کیا گیا ہے اس سے فکر وعمل کی ان قوتوں کو ابھارنا مقصود ہے جو اعلیٰ مقاصد کے حصول میں انسان کی تقویت کا باعث بنتی ہیں۔ بند یہ ہے :-

کھلی کربلا میں تمھاری عزیمت ... بہتّر یہاں، واں ہزاروں کی نوبت
اُدھر شورشیں تھیں، اِدھر استقامت ... وہاں ظلم ونخوت، یہاں صبر وہمّت

جری مرمٹے ، رہ گیا نام زندہ
شہادت سے ان کی ہے اسلام زندہ

"برق وباراں" کو مسدسِ حالی کی طرح "مسدسِ نسیم" کہنے میں قومی احساس کی جو جھلک ہے اس کا عکس مسدس کی چھوٹی بڑی بہت سی چیزوں میں ہے۔ مثلاً "برق وباراں" کے مصنف کو شاعرِ حرّیت کہا گیا ہے اور خود شاعر نے نظم کا انتساب جن لفظوں میں کیا ہے وہ بھی واضح طور پر اس اصلاحی احساس کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس کے تحت یہ مسدس تصنیف ہوا۔ انتساب کے الفاظ یہ ہیں :-

"جہد وعمل ، فکر ونظر ، سوز وگداز اور ذوق وشوق کے جذبات وتاثرات

کا ہدیہ دنیا کے سب سے بڑے عملی انسان، خیر البشر سرورِ کائنات کے حضور۔

ع زِ چشمم آستیں بر دار و گوہر را تماشا کن"

انتساب میں مسدس کے مقاصد کا ذکر بھی ہے اور بیان کے اُس سوز و گداز کی طرف اشارہ بھی جس کے بغیر کوئی مقصدی، اصلاحی اور قومی نظم مطلوبہ تاثر پیدا کرنے سے قاصر ہے۔

گرد و پیش کی زندگی کا مشاہدہ کرنے اور اس کا تجزیہ کر کے نتائج مرتب کرنے کی عادت نے اپنے عہد کے مسلمانوں کی زندگی کا جو نقشہ شاعر کو دکھایا ہے وہ اس کے لیے خلش و اضطراب کا باعث ہے، اِس خلش اور اضطراب کو جو حقیقت میں اس کے مخلصانہ احساسِ ملّی کا نتیجہ ہے وہ اُسے پوری ملّت کی خلش اور اضطراب بنانا چاہتا ہے کہ اس کے نزدیک اس غم کا مداوا یہی ہے۔ اس کی آرزو ہے کہ وہ ملّت کے موجودہ انتشار کو مستقبل کی تعمیر کا پیش خیمہ بنائے۔ "برق و باراں" کی تصنیف اسی ملّی جذبے اور قومی احساس کے تحت عمل میں آئی ہے۔ اِس اعلیٰ مقصد کا تقاضا تھا کہ نظم کی ترتیب و تنظیم اور اس کی تہذیب و تزئین پر فکر و تخیل کی پوری توجہ اور پوری کاوش صرف ہوتی، تفکر و تخیل کی اسی ہم آہنگ توجہ اور کاوش کا نتیجہ ہے کہ شاعر نے نظم کو جن پانچ حصّوں میں تقسیم کیا ہے علی الترتیب ان کے نام یہ ہیں "تلاطمِ امواج، برقِ خرمن، نویدِ برشگال، بارانِ رحمت، اور پاکستانِ رحمت" ناموں سے ان کی علامتی حیثیت واضح ہے۔ "تلاطمِ امواج" اس اضطراب اور انقلاب کی علامت ہے جس نے "عصرِ نو" کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔

"برق و خرمن" ان تخریبی عوامل کا استعارہ ہے جس کی بجلی نے ملّت کے گلشن کو خاکستر بنایا۔

"نویدِ برشگال" بیداری کے اُس احساس کی نشانی ہے جس نے ملت کا رخ تعمیر کی راہوں کی طرف موڑا اور بالآخر یہی احساس بارانِ رحمت بنا اور تخریب کی خاک میں سے تعمیر کی کلیاں پھوٹیں اور کھِل کر پھول بنیں، پاکستانِ رحمت اُس مثالی سرزمین کا نقشہ ہے جس کی آرزو میں شاعر نے تخیل کی یہ عمارت تعمیر کی تھی۔

نظم جس شکل میں ہمارے سامنے ہے اس کی ایک معنوی اور صوری تجسیم حالی کے مسدس

کی صورت میں ہو چکی تھی، حالی نے اپنے مسدس کی تعمیر و تشکیل جن جذباتی عوامل کے تحت کی تھی اسی میں اقبال نے "شکوہ" اور "جواب شکوہ" کی صورت میں نئے رنگ بھرے اور نئے نقش ابھارے۔ "برق و باراں" کے مصنف نے جب اپنے مشاہدات و تصورات کو ایک قومی نظم کے سانچے میں ڈھالنے کا منصوبہ بنایا تو اس منصوبے کی تشکیل میں حالی اور اقبال کے مسدس اس کے رہنما بنے، لیکن نظم کی مجموعی ترتیب و تنظیم میں حالی اور اقبال سے قبول کیے ہوئے اثرات کے جزوی نقوش کے علاوہ باقی جو کچھ ہے وہ اس شاعر کا ہے جسے ایک طرف تو شاعرِ اہلبیت ہونے کی سعادت حاصل ہے اور اس نے مرثیہ گوئی میں اپنا ایک مقام پیدا کیا ہے اور دوسری طرف وہ مرثیے کو قومی مسائل کے اظہار کا وسیلہ بنانے کو اپنا شاعرانہ منصب اور قومی فریضہ تصور کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ "برق و باراں" کی منصوبہ بندی میں جہاں بنیادی جذبہ قومی اصلاح کا ہے اس کی ترتیب و تزئین انھیں عناصر سے ہوئی ہے جن سے اُردو کا مرثیہ ترتیب پاتا ہے۔

انیس کے مرثیوں کا تجزیہ اور ان کی ادبی تحسین و تقدیر کرتے وقت ہم جن باتوں پر زور دیتے ہیں ان میں واقعات کی مصوری، کرداروں کی سیرت کشی، اور رزم و بزم کے مضامین کا بیان اور اس بیان میں حسنِ کلام کے مختلف عناصر یعنی تغزل، تصویر کاری، تشبیہوں اور استعاروں کا برمحل صرف، لطیف کنایے، کلام کے حسن کو دوبالا کرنے والے صنائع بدائع، صفائی اور روانی اور زورِ کلام جیسی چیزیں شامل ہیں، مرثیے کے ان روایتی اجزا کو انیس نے ترقی دے کر ان میں سے ہر ایک کے امکانات کو جو وسعت دی وہ مرثیے کی روایت کا بڑا بیش بہا سرمایہ ہے۔ اس سرمائے کو نسیم نے ایک محترم ورثہ سمجھ کر آنکھوں سے لگایا اور اپنی بزمِ سخن کی آراستگی میں قدم قدم پر اس سے کام لیا ہے، لیکن سرمائے کے ان عناصر میں سے بعض ایسے ہیں جن سے قومی تصورات کے اظہار میں نسبتاً زیادہ مدد ملتی ہے۔ اسی لیے "برق و باراں" کی ترتیب و تزئین میں ان منتخب عناصر کا عکس زیادہ نمایاں ہے۔

مرثیے کو ضمیر نے جن مختلف حصوں میں تقسیم کرنے کی طرح ڈالی تھی ان کے لکھنے والے

مرثیہ گویوں نے اسے مرثیہ کی فنی روایت کا لازمہ سمجھ کر اس روایت کی پیروی کی، یہاں تک کہ اس روایت کے مختلف اجزا اپنی جملہ معنوی اور صوری خصوصیات کے ساتھ انیس کے مرثیوں میں درجۂ کمال کو پہنچے، لیکن انیس نے اپنے زورِ تخیل، پاکیزہ مذاقِ شعری اور نازک فنی احساس کی بدولت مرثیہ کی تزئین و تعمیر کی جو عملی خدمت انجام دی اس کے علاوہ دوسرا اہم کام یہ کیا کہ مرثیے کے مختلف عناصر کی پرکھ کے بڑے واضح معیار بھی مقرر کیے، انھوں نے شبیرؑ اور اہل بیتؑ کی ثنا خوانی اور مداحی کو مرثیے کا مقصدِ اولین قرار دیا اور بارگاہِ خداوندی سے شوقِ مداحئ شبیرؑ کی دعا و طلب کی، وہ گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھنے اور ایک پھول کو سو رنگ دینے کی قدرت کے طلب گار رہے اور رزم اور بزم[13] دونوں کے مضامین نظم کرنے کے لیے واقعہ نگاری اور تصویر کشی کے جداگانہ شاعرانہ معیار مقرر کیے[14]۔ پھر اس معیار کا قائل ہونے کے باوجود کہ مرثیے کو درد کی باتوں سے خالی نہیں ہونا چاہیے اور یہ آرزو رکھنے کے باوجود کہ نظم میں رونے کی تاثیر پیدا ہو انیس نے مرثیے کو تین چیزوں کا مجموعہ ٹھہرایا اور اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا کہ مرثیے میں یہ تین باتیں ہوں گی تو سامع اور قاری کے ذہن پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ ان کے ایک معروف مرثیے کا یہ شعر انھیں حقائق کی نشان دہی کرتا ہے۔ ؎

دبدبہ بھی ہو، مصائب بھی ہوں، توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں، رقت بھی ہو، تعریف بھی ہو

انیس نے اس احساس کے تحت کہ مرثیے کی تخلیق کی اساس جذبہ ہے اور جذبہ کا عام میلان یہ ہے کہ وہ جب تخلیقی اظہار کی صورت اختیار کرتا ہے تو توازن و اعتدال کی گرفت کمزور پڑ جاتی ہے، جذبہ کی تعقیل کو کامیاب اسلوب کی شرط قرار دیا ہے کہ اس کے بغیر بات میں سنجیدگی پیدا نہیں ہوتی اور عقل کی میزان میں اس کا وزن ہلکا ٹھہرتا ہے۔[16]

---

۱۳ ع "بزم کا رنگ جدا، رزم کا میداں ہے جدا"

۱۴ ؎ گر بزم کی جانب ہو توجہ دمِ تحریر
کھنچ جائے ابھی گلشنِ فردوس کی تصویر

۱۵ ؎ جل جائیں عدو آگ بھڑکتی نظر آئے
تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے

۱۶ قول لے عقل کی میزان میں جو فہمیدہ ہے
بات جو منہ سے نکلتی ہے وہ سنجیدہ ہے

"برق وباراں" بدیہی طور پر قومی اور اصلاحی نظم ہے لیکن واقعات کے بیان میں رزم و بزم کی مصوری کے جداگانہ شرائط کا لحاظ، اوصاف و فضائل کے ذکر میں تعقل و تفکر کی کار فرمائی اور حقائق کے اظہار میں سبب اور نتیجے کے منطقی تعلق کا احساس ایسی چیزیں ہیں جو اس قومی نظم کو نسیم نے دی ہیں جو شاعرِ اہلبیت ہے اور جو فنِ مرثیہ نگاری میں انیس کا متبع اور ان کی شاعرانہ روایت کا پرستار ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ "برق وباراں" کے قومی مزاج کی تشکیل میں حالی اور اقبال کے فکر و فن کے اثرات زیادہ واضح ہیں۔

جہاں تک حالی کے اثر کا تعلق ہے وہ اوّل تو نظم کے ان مختلف حصّوں میں ملتا ہے جس میں نسیم نے اسلاف کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے ماضی اور حال کے فرق کی تصویر کشی کی ہے اور دوسرے اس خاص حصّے میں جس میں سرورِ کائنات آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اسوۂ حسنہ کا ذکر آیا ہے۔ حالی کے مسدس کے اس حصّے کو پیشِ نظر رکھیے جو اس مصرعے سے شروع ہوتا ہے۔ ؏

"وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا"

اور پھر نسیم کے مسدس کے یہ دو بند پڑھیے :-

وہ خیر البشر، فخرِ اولادِ آدم — بشیر و نذیر و ظہیرِ دو عالم
وہ لطفِ مکمّل، وہ خلقِ مجسّم — بنی نوعِ انساں کا غمخوار و ہمدم
غنی اور گدا کا سہارا محمّدؐ
خدا کا محمّدؐ، ہمارا محمّدؐ

محمّدؐ، وہ گم گشتہ قوموں کا ہادی — جو عالم میں علم و عمل کا منادی
وہ پیغمبرِ عزم و خود اعتمادی — شریعت ہے جس کی بہت سیدھی سادی
نہ دنیا پرستی، نہ رہبانیت ہے
معیشت بہ ایماں یہ روحانیت ہے

اقبالؔ نے اپنی قومی اور حکیمانہ شاعری کے ذریعے ہمارے عہد کے انسان کو عموماً اور مسلمان کو خصوصاً زندگی کے جن تصورات سے آشنا کیا اور ان تصورات کی انقلابی اہمیت کی مدلل وکالت جس انداز سے کی اس سے ہمارے شعر کی ایک خاص نہج متعین ہوئی اور آج اردو کے اکثر و بیشتر شعرا کے کلام میں فکر و خیال کی اس نہج کا سراغ ملتا ہے۔ خصوصیت سے ان شاعروں کے کلام میں جنھوں نے عہدِ حاضر کے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اقبالؔ کے فکر، خیال اور اسلوبِ شعری کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے "برق و باراں" کے چند مصرعوں اور شعروں پر نظر ڈالیے۔

نظم کے پہلے حصے "تلاطمِ امواج" کا آغاز اس خبر سے ہوتا ہے کہ۔ ع

زمانے میں اک انقلاب آرہا ہے

اس کے بعد "تلاطمِ امواج" کے ۴۰ بندوں میں سے ۱۳ ایسے ہیں جن میں بار بار وہی خیالات آئے ہیں جو اقبالؔ کے پیغام کا جزوِ لازم ہیں اور بعض اوقات انھیں الفاظ اور ترکیبوں کے ساتھ آئے ہیں جو اقبالؔ کے اسلوبِ شعری کے لیے مخصوص ہو گئی ہیں۔ چند چیدہ چیدہ مصرعے اور شعر یہ ہیں:۔

؎ یہ ذوقِ عمل نے ہے قسمت جگائی ———— فقیروں نے کی ترکِ رسمِ گدائی

؎ زمانے کے کچھ کارخانے عجب ہیں ———— کہ سورج سے جگنو مبارز طلب ہیں

("زمانے کے انداز بدلے گئے" اور "لڑا دو ممولے کو شہباز سے")

؎ عجب بحر و بر میں مچا ہے تلاطم ———— جنونِ خرد میں ہے باہم تصادم

؎ مٹانے کو عہدِ کہن کے قرینے ———— قیامت مچا دی نئی زندگی نے

ع "ابھرنے کو ہے "عصرِ نو" خاک و خوں سے"

ے ازل سے یہی ہے مشیّت خدا کی ‏ بشر سے ہو تسخیر ارض و سما کی

ے یہ کارِ نمایاں بشر کر رہا ہے ‏ ہم اسعی و کوشش کی سر کر رہا ہے
عناصر کو زیر و زبر کر رہا ہے ‏ کہ تسخیرِ شمس و قمر کر رہا ہے

خودی کے ہیں پرچم دلیروں نے کھولے

تغیّر سے ہے رونقِ بزمِ ہستی
(ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں) اقبالؔ

ے زمانے کی پوچھو جو اصل و حقیقت ‏ حدوث و تغیّر ہے ساعت بہ ساعت
ہمیشہ سے قانونِ فطرت یہی ہے ‏ ازل سے مذاقِ مشیّت یہی ہے

جواں مرد ایسے کوزں میں پلے تھے ‏ وہ تیغوں کے سائے میں پھولے پھلے تھے
("کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی" اقبالؔ)

اس طرح کی بہت سی مماثلتیں ہیں جو حالیؔ اور نسیمؔ اور اقبالؔ اور نسیمؔ کے فکر، تخیل اور اسلوبِ اظہار میں تلاش کی جا سکتی ہیں، لیکن ان ائمۂ فن کی شعوری اور غیر شعوری پیروی میں نسیمؔ نے انیسؔ کے اس شاعرانہ مسلک کو اپنا رہنما بنایا ہے کہ وہ ایک مخصوص تصوّر کے اظہار کے لیے مختلف پیرا‌ئے اختیار کرتے ہیں اور ہر پیرایہ اپنے شاعرانہ حسن اور دلکشی کی بنا پر ایک جداگانہ اثر اور امتیاز رکھتا ہے۔ "برق و باراں" کی ایک مثال سے نسیمؔ کے شاعرانہ اسلوب کی اس خصوصیت کا اندازہ لگائیے۔

شاعر نے نظم کے دوسرے بند کے تیسرے شعر میں انقلاب کی اجمالی کیفیت یوں بیان کی ہے

زمانے کے کچھ کارخانے عجب ہیں ۔۔۔۔ کہ سورج سے جگنو مبارز طلب ہیں

سورج اور جگنو کی تمثیل کی صورت میں ضعیف اور قوی کے تصادم اور پیکار کا جو تصور پیش کیا گیا ہے شاعرانہ تخیل نے اگلے بندوں میں اس کی مختلف تصویریں بنائی ہیں اور یوں انقلاب کے تصور کے نقش کو جس پر نظم کی بنیاد رکھی گئی ہے آہستہ آہستہ زیادہ ابھارا ہے۔ مضمون آفرینی یکے بعد دیگرے بہت سی خیالی تصویریں بناتی چلی گئی ہے اور ہر اگلی تصویر کا رنگ پچھلی تصویر کے رنگ سے زیادہ روشن، زیادہ شوخ اور زیادہ نظر میں کھب جانے والا ہے۔ تیسرے بند میں خیال ذرا دھیمی رفتار سے آگے بڑھتا اور "سورج سے جگنو مبارز طلب ہیں" کی تشریح و توضیح کا عمل شروع کر دیتا ہے۔

عجب بحر و بر میں مچا ہے تلاطم ۔۔۔۔ جنون و خرد میں ہے باہم تصادم
جھلکتا ہے اشکوں میں رنگِ تبسم ۔۔۔۔ خموشی کے لب پر ہے شانِ تکلم

ہر ایک سانس بھاری ہے موجِ صبا پر
بگولوں نے کی ہے چڑھائی ہوا پر

شاعرانہ تصویر کاری کا جو ٹیپ کے شعر میں ظاہر ہوا ہے اس کی تابانی اگلے بندوں میں اور بڑھتی ہے اور شاعرانہ تخیل کی نزاکت اور بیان کی قوت کے امتزاج سے رنگ برنگ مضامین کا ایسا گلدستہ تیار ہو جاتا ہے جو رنگ و بو کے تنوع اور بوقلمونی کے باوجود تاثر کی اس وحدت کا حامل ہے جس کی تخلیق شاعر کا مقصود ہے۔ "ہر اک سانس بھاری ہے موجِ صبا پر" والا شعر پڑھئے اور پھر اس کے فوراً بعد آنے والے شعر پڑھتے چلے جائیے:-

ہُوا برقِ سوزاں کے در پے نشیمن ۔۔۔۔ نہنگوں پہ ہیں مچھلیاں دام افگن
تماشا ہے صیاد و بلبل کی ان بن ۔۔۔۔ مچلتا ہے کانٹوں سے لڑنے کو دامن

صف آرا ہے، دل کی صدا ہمہموں سے
الجھتے ہیں تارِ نفس زمزموں سے

تعاقب میں آندھی کے ذرے ہیں جولاں غبارِ قدم ہے حریفِ بیاباں
ہواؤں سے بادل ہیں پست دگرگوں کنارے ہیں رو کے ہوئے راہ طوفاں
بپھرتے ہیں خرگوش شیروں کے بن میں
صفیں موریوں نے جمائی ہیں رن میں

بجا ہے یہ دعویٰ چراغوں کے لب پر کہ ہستی میں ہم بھی ہیں تاروں کے ہمسر
شرارے جو شعلوں پہ ہیں حملہ آور تو موجوں سے لڑتے ہیں قطرے مچل کر
اقلیتیں زور دکھلا رہی ہیں
چٹانیں پہاڑوں سے ٹکرا رہی ہیں

حبابوں نے یوں اپنے تانے ہیں سینے سمندر کو بھی آ رہے ہیں پسینے
نئے ہیں جہانِ کہن کے قرینے کہ سیلاب پر ہنس رہے ہیں سفینے
جو مخفی تھے جوہر، وہ اب کھل رہے ہیں
ترازو میں کوشش کی سب تل رہے ہیں

"ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے" کی یہ شاعرانہ روش نسیم کے مراثی کی بہت سی فنی خصوصیات میں سے ایک ہے، اور یہ خصوصیت "برق وباراں" جیسی قومی نظم میں اسی انداز سے جلوہ گر ہے جیسے ان کے مراثی میں۔

"برق وباراں" اور نسیم کے مراثی میں بعض حیثیتوں سے جو فنی مماثلت اور اشتراک ہے، یہی مماثلت اور اشتراک ان مضامین اور موضوعات میں بھی ہے جنھیں نسیم نے اصلاحی اور قومی نقطۂ نظر سے مرثیے کی عام روایت کے خلاف اپنے مراثی میں جگہ دی ہے۔ ان موضوعات میں جہاں ایک طرف صبر، تحمل، رضا اور شجاعت جیسے اوصاف شامل ہیں جو مرثیے کا موضوعِ خاص ہیں وہاں ان اوصاف کو بھی نمایاں حیثیت دی گئی ہے جو ترقی کی راہ میں انسان کے ہمدم و دمساز بنتے ہیں، یہ اوصاف عزم، سعی، عمل اور سخت کوشی و سخت جانی کے اوصاف ہیں۔ "برق وباراں" میں عمل کے اسی

تصور کو بنیادی موضوع بنایا گیا ہے۔ نسیم کے نزدیک عمل ہی روشنی کا وہ مرکزی نقطہ ہے جس سے عزم، سعی، جہد، طلب اور سخت کوشی و سخت جانی کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ اس نظم میں عمل کے فلسفے اور اس کی منطق کو شاعری کی زبان ملی ہے۔ "برق و باراں" کے ایک شعر میں عمل کی اسی منطق کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے۔ ؎

ہر اک کو ریاضت کا پھل مل رہا ہے　　مگر حسبِ عزم و عمل مل رہا ہے

یہی منطق ایک اور شعر میں یہ صورت اختیار کرتی ہے ؎

جسے کامیابی یہاں رزو شب ہے　　بحدِ تمنّا، بقدرِ طلب ہے

ریاضت کے پھل کا "حسبِ عزم و عمل" ملنا اور کامیابی کا "بحدِ تمنّا و بقدرِ طلب" حاصل ہونا میں جو منطق ہے اسے نسیم نے "برق و باراں" میں تاریخ کے بے شمار واقعات اور حقیقی زندگی کے واردات کے حوالے سے، نیز شاعرانہ تخیل کی بنائی ہوئی شاعرانہ تصویروں کی مدد سے ابھارا اور قوم کو فلاح و نجات کا راستہ دکھایا ہے۔ نسیم نے یہی قومی خدمت مرثیوں کے ذریعے بھی انجام دی ہے اور یوں مرثیے کے مقاصد میں وسعت پیدا کی کے اس رفیع اور عظیم صنف کو رفیع تر اور عظیم تر بنایا ہے۔ مرثیے کو خدمت گزاری کے اس منصب پر فائز کرنے کے لیے فن نے کیا وسیلے اختیار کیے ہیں ان کی مختلف صورتوں سے شناسائی حاصل کرنے کے لیے ہمیں ایک بار پھر ان بارہ مراثی کے خلاصے پر نظر ڈالنی ہوگی جن کا ذکر چھوڑ کر ہم نے "برق و باراں" کا تعارف کرایا تھا کہ اس طرح چند ایسے رجحانات کی طرف اشارہ مقصود ہے جن کا اشارہ نسیم امروہوی کے شاعرانہ اجتہاد کی بدولت ان کی ایک ایسی نظم میں بھی ہوا ہے جو مرثیے کے روایتی مفہوم میں مرثیہ نہیں ہے اور ان نظموں میں بھی جو ہر اعتبار سے مرثیے کے روایتی تقاضے کو پورا کرتے ہوئے بھی قومی نظمیں ہیں۔

مراثیِ نسیم (جلد اوّل) کے پہلے مرثیے میں کل ۱۰۶ بند ہیں۔ ان میں سے چودہ میں حمد ہے تیس میں نعت، باقی بند جناب علی اکبرؑ کے فضائل اور شہادت کے لیے مخصوص ہیں۔ دوسرا مرثیہ ۹۳ بندوں کا ہے، اس کے آدھے سے زیادہ بندوں میں رسول اللہؐ کے فضائل اور معراجِ نبوی کا بیان ہے

اس کے بعد گریز کر کے حضرت سکینہ کی وفات کا مرثیہ بنایا گیا ہے۔ دسویں مرثیے میں ۱۲۰ بند ہیں، ابتدائی گیارہ بارہ بند نعت کے ہیں، اس کے بعد کے ۱۲، ۱۳ بندوں میں غم کی آغوش میں پلنے والی خوشی اور امید کی نوید کے ساتھ عمل کی اہمیت کی طرف بعض اشارے ہیں اور اس کے بعد کے بندوں میں رضوان سے مکالمہ اور بحث و حجت ہے اور آخری چند بندوں میں جناب علی اکبرؑ کی شہادت کا بیان ہے۔

توصیفی مرثیوں میں سے تین حضرت امام حسینؑ کے فضائل سے متعلق ہیں، پانچواں، چھٹا اور ساتواں۔ پانچویں مرثیے کے ۱۰۲ بندوں میں سے تقریباً آدھے سیدالشہداؑ کے فضائل کے لیے مخصوص ہیں، اس کے بعد ملت کے امراض اور ان کے علاج کی طرف گریز ہے اور بالآخر ساقی نامے کی تمہید کے ساتھ دس بندوں میں مصائب کا بیان، چھٹے مرثیے میں کل ۸۱ بند ہیں۔ ان میں سے ۴۳ شہید کربلا کے فضائل کے لیے اور سات آٹھ واقعۂ کربلا کی اہمیت کے لیے وقف ہیں۔ اس کے بعد دورِ یزید کی عام بے راہ رویوں کی طرف اشارہ کے بعد ایک "مردِ حق نما" کی ضرورت کا احساس دلایا گیا ہے اور آخری چند بندوں میں مصائب کا ذکر ایسے انداز میں ہوا ہے کہ وہ انسان کی عملی زندگی کے لیے شمعِ ہدایت بن کر ابھرتے ہیں۔ ساتواں مرثیہ جس میں کل ۹۳ بند ہیں اس کا بیشتر حصہ حضرت امام حسینؑ کی ولادت اور فضائل کے لیے وقف ہے، صرف آخری آٹھ دس بندوں میں مصائب کا بیان ہے۔

توصیفی مرثیوں میں سے ایک، یعنی چوتھا مرثیہ حضرت فاطمہؑ کے مناقب اور عقد کی تفصیلات کے بیان کے لیے مخصوص ہے۔ ۸۰ بند کے اس مرثیے میں سے صرف آخری سات بند مصائب کے ذکر کے لیے ہیں، اسی طرح کا ایک اور مرثیہ (مرثیہ نمبر ۳) حضرت علیؑ کی منقبت اور ولادت و شہادت کے لیے مخصوص ہے اور اس مرثیے کے ۱۰۳ بندوں میں سے آخری تیرہ میں غم انگیز مضامین کا بیان ہے۔

توصیفی مضامین کے ان جملہ مراثی پر بہ یک وقت نظر ڈالیے تو کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔

پہلی تو یہ کہ ان مرثیوں میں شخصیتوں کے اوصاف و فضائل کے ذکر کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے مقابلے میں مصائب کا ذکر بہت کم ہے، اور یہ ذکر بھی کہیں ایسے انداز میں ہے کہ غم کا احساس جذبۂ تعمیر کی اساس بنتا ہے اور کہیں اس طرح کہ غم زندگی کے ایک ایسے مثبت تعمیری فلسفے کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس کی جلوہ گری کائنات کے ذرّے ذرّے میں ملتی ہے، یہ چند توصیفی مرثیے جن کا موضوع نعت و منقبت ہے، مرثیہ نگار کے فلسفۂ حیات، اندازِ فکر اور نظریۂ فن کے بعض اہم پہلوؤں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ جو آٹھ مرثیے اس وقت گفتگو کا موضوع ہیں علی الترتیب ان کے آخری بند یہ ہیں:۔

پہلا مرثیہ :۔

خاموش نسیم اب کہ نہیں ضبط کا یارا — مجلس میں ہر اک کا ہے جگر غم سے دوپارا
ہے وقتِ دعا، عرض یہ کر شہ سے خدارا — یا شاہ مصیبت میں ہے مدّاح تمھارا
کیوں منہ سے کہوں دل میں جو اک بات نہاں ہے
احوال تو سارا مرے مولا پہ عیاں ہے

دوسرا مرثیہ :۔

بس روک لے خامے کو نسیمِ جگر افگار — رقّت کا ہے اب جوش، دعا کر بہ دلِ زار
موجود سرِ بزم ہیں خود احمدِ مختارؐ — قبضے میں انھیں کے تو ہے اللہ کی سرکار
کر عرض کہ قسمت کو بدل دیجیے مولا
اس قوم کو پھر عزم و عمل دیجیے مولا

تیسرا مرثیہ :۔

بازو پہ حسینؑ کا، بے شیر کا گلا — اک آہ بھر کے رہ گئے مظلومِ کربلا
بیٹے کی سمت دیکھ کے بولے کہ میں فدا — لو میری جان پیاس بجھی، حلق تر ہوا
چونکو تو تیر کھینچ لیں ہم منہ کو پھیر کے
اے لال اُف نہ کیجیو ہوتے ہوشیر کے

چوتھا مرثیہ :-

بس اے نسیم باغِ گلِ سیّد البشر　　بے مثل مرثیہ یہ کہا تو نے سر بسر
عقدِ علیؑ و فاطمہؑ کتنا ہے مختصر　　پَر یہ بھی حق ہے تو نے دکھایا جو گڑ دفر
حد کی ہے دھوم دھام غلو بھی ذرا نہیں
یوں آج تک یہ حال کسی نے کہا نہیں

پانچواں مرثیہ :-

بس اے نسیم کہ مجلس میں حشر ہے برپا　　بتول روتی ہیں، سر پیٹتے ہیں خیرِ ورا
علیؑ کے لب پہ ہیں نالے حسنؑ ہیں محوِ بکا　　تڑپ رہے ہیں خود اس غم میں سیّد الشہدا
نبیؐ کی جان، دلِ زہراؑ کے چین روتے ہیں
خدا کا عرش ہے لرزاں حسینؑ روتے ہیں

چھٹا مرثیہ :-

بس اے نسیم روک لے خامے کو اب ذرا　　سُن جبرئیلؑ کہتے ہیں واللہ مرحبا
ہٹ کر جو طرزِ عام سے یہ مرثیہ کہا　　اس وادیٔ کہن میں یہ جادہ نیا بنا
اک تازہ طرزِ فکر کا سورج طلوع ہے
دورِ جدید مرثیہ گوئی شروع ہے

ساتواں مرثیہ :-

پہنے ہے اے نسیم جو زنجیر ناتواں　　یہ کشتیٔ حیات کے لنگر ہیں بے گماں
وہ پاؤں جس میں آ پڑی ہیں یہ بیڑیاں　　آجائے حشر آج نہ ہو گر یہ درمیاں
وہ دستِ پاک اونٹوں کی جس میں مہار ہے
پنجے میں اس کے قوّتِ پروردگار ہے

دسواں مرثیہ :-

اب قلم روک نسیم اور یہ کر حق سے دعا　　　واسطہ اکبرِ دیجاہ کا اے ربِّ ہدا

استقامت وہ جوانوں کو ہمارے ہو عطا　　　ہر قدم یاد ہو عزم و عملِ کرب و بلا

موت کے سامنے گھبرائیں نہ یہ ڈر کے رہیں

اپنا سینہ تری ملّت کے سپر کر کے رہیں

ان آٹھ مرثیوں کے آخری بند، جنھیں میں نے توصیفی مرثیے کہا ہے، مرثیہ نگار کے جن رجحانات کی طرف اشارہ کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ مرثیوں میں ان کے رثائی یا غم انگیز پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ پہلے، تیسرے اور پانچویں مرثیے میں یہی صورت ہے لیکن پہلے مرثیے میں ایک بات اور بھی ہے۔ یہاں شاعر نے اپنے غم کا ذکر کرتے ہوئے اپنے آپ کو مداحِ اہلبیتؑ بھی کہا ہے۔ مداحی یا ثنا خوانی کی طرف یہ ہلکا سا اشارہ نسیم کے مراثی کے ایک اور رجحان یا رُخ کی نشان دہی کرتا ہے۔ نسیم نے اپنے مرثیوں کو غم انگیز کیفیت کا حامل اور ترجمان بنانے کے ساتھ ساتھ انھیں اکابرِ اسلام کے فضائل کے اظہار کا وسیلہ بھی بنایا ہے اور ایسے موقعوں پر ان کے مرثیے انیس کے مرثیوں کی طرح قصیدے کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ یہاں اوصاف و فضائل کے بیان میں مبالغے کو دخل نہیں، جن اوصاف و فضائل کا ذکر آیا ہے، انھیں یا تو قرآن اور حدیث کی تائید حاصل ہے یا تاریخ کے واقعات اور مستند روایات کی، فضائل کے حصے میں ہر جگہ بیان کا وہی شکوہ موجود ہے جو قصائد کے اسلوب کی بنیادی شرط ہے، لیکن یہ شکوہ مغلق الفاظ اور تراکیب کی وجہ سے نہیں بلکہ ان شخصیتوں کی عظمت و رفعت کا اثر اور عکس ہے جنھیں مرثیے میں شاعر نے اپنا ممدوح بنانے کا شرف حاصل کیا ہے۔ تیسرا اشارہ جو ہمیں مذکورہ شعروں سے ملتا ہے یہ ہے کہ مرثیہ نگار نے اہلبیتؑ کی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں کو مرثیوں کا موضوع بنایا ہے جن کی طرف اس سے پہلے کسی اور مرثیہ نگار نے توجہ نہیں کی تھی، اس خصوصیت یا رجحان کا اظہار چوتھے اور چھٹے مرثیے میں ہوا ہے۔ دوسرے ساتویں اور دسویں مرثیے کے اشعار اس بات کی طرف واضح اشارہ ہیں کہ شاعر مرثیے کو مسلمانوں

کی اصلاحِ احوال کا فنی وسیلہ بنانا چاہتا ہے۔ ساتویں مرثیے کے شعر

پہنچے ہے اے نسیم جو زنجیرِ ناتواں　　　یہ کشتیِ حیات کے لنگر ہیں بے گماں

——— میں تو یہ اصلاحی نقطۂ نظر زیادہ واضح نہیں لیکن دوسرے اور دسویں مرثیوں کے بعض مصرعے اور شعر اس اصلاحی رجحان کے برملا اعلان کی حیثیت رکھتے ہیں ؎

اس قوم کو پھر عزم و عمل دیجیے مولا

؎ استقامت وہ جوانوں کو ہمارے ہو عطا
ہر قدم یاد ہو عزم و عملِ کرب و بلا

؎ موت کے سامنے گھبرائیں نہ یہ ڈر کے رہیں　　　اپنا سینہ تری ملت کی سپر کر کے رہیں

ساتویں بند کے جس شعر کو میں نے اصلاحی رجحان کا حامل بتایا وہ اس بات کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے کہ کربلا میں جو واقعات پیش آئے انھوں نے مسلمانوں کے مستقبل کی تاریخ کو فکری حیثیت سے بہت متاثر کیا، یہ اشارہ آخری بند کے علاوہ مراثیِ نسیم کے مختلف مرثیوں میں اور زیادہ واضح صورت میں ملتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے: ؎

فطرت بھلا سکے گی یہ احسانِ کربلا!　　　گہوارۂ عمل ہے بیابانِ کربلا

بڑھتا ہوا شکوہِ شہیدانِ کربلا　　　تاریخ لکھ رہی ہے بعنوانِ کربلا

واقعۂ کربلا کی اس اہمیت کا ذکر خصوصیت سے حضرت امام حسین علیہ السّلام کے حوالے سے بار بار کیا گیا ہے: ؎

جلوے سے دین کے جو زمیں رشکِ طور ہے　　　یہ بھی انھیں کے نور کا سارا ظہور ہے

؎ توحیدِ بے نیاز ہے قائم حسینؑ سے　　　دینِ شہِ حجاز ہے قائم حسینؑ سے
سجدے کا امتیاز ہے قائم حسینؑ سے　　　سب روزہ و نماز ہے قائم حسینؑ سے

سر دے دیا، نبیؐ کا مگر نام رکھ لیا
حق تو یہ ہے حسینؑ نے اسلام رکھ لیا

غم کے ذکر یا رثائی کیفیت یا مرثیت کو ہمیشہ سے مرثیے کا اساسی مقصد سمجھا گیا ہے۔ یہاں تک کہ مرثیے کو فن کی معراج تک پہنچانے والے مرثیہ نگاروں نے واقعہ نگاری، سیرت کشی اور جذباتی کیفیات کی نزاکتوں کی عکاسی میں فکر و تخیل کی پوری قوت صرف کرتے ہوئے بھی غم کی مصوری اور رقت انگیزی کو مرثیہ گوئی کے فنی لوازم کی حیثیت دی، نسیم نے بھی مصائب کے ذکر اور رقت انگیز مضامین کے بیان کو مرثیہ گوئی کا جزِ لازم سمجھ کر اسے اپنے فنی منصب کا حصہ بنایا۔ لیکن مرثیے کو قومی اصلاح اور قومی ترقی کا وسیلہ بنانے کی جس روش کا آغاز انھوں نے نصف صدی پہلے کیا تھا، اس کے مقصدی تقاضوں کے تحت غم کے بیان کو لطیف نفسیاتی اور دقیق فلسفیانہ اظہار کی صورت دی، غم کی نفسیات اور غم کے فلسفے کے بیان کو نسیم نے ایک منطقی ترتیب کا پابند بنایا ہے اور اس منطقی ترتیب کے تحت غم اور اظہارِ غم کی مختلف صورتوں کو بڑے مؤثر اور دل نشین انداز میں اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

غم اور اظہارِ غم کے متعلق نسیم کے جذبات اور احساسات وہی ہیں جو غمِ حسینؑ میں گریہ و زاری کرنے والے ہر مسلمان کے۔ وہ اظہارِ غم کو اور اس غم کے اظہار کے لیے گریہ و بکا کو مسلمان کا دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔ مراثیِ نسیم کے مرثیے میں عزادارِ حسینی کو مخاطب کرکے گریہ و بکا کی دعوت دی گئی ہے اور اسے بتایا گیا ہے کہ غمِ حسینؑ میں ہمارے رونے کا جواز کیا ہے:۔

ناگہاں ہاتفِ غیبی نے بصد درد کہا — اٹھ عزادارِ حسینی کہ یہ ہے فصلِ عزا
خلوتِ غم سے نکل مجلسِ شبیرؑ میں آ — مجتبیٰؑ روتے ہیں، گریاں ہیں جنابِ زہراؑ
خود نبیؐ اور علیؑ آہ و بکا کرتے ہیں
رونے والوں کو نہ غم ہو یہ دعا کرتے ہیں

ہو نہ یہ چشمِ کرم اہلِ عزا پر کیونکر — اس کو روتے ہیں یہ سب کوئی نہ رویا جس پر
اس کو روتے ہیں جو دریا پہ رہا تشنہ جگر — اس کو روتے ہیں، رلاتے تھے جسے بانیِ کفر
اس کو روتے ہیں کہیں جس کی عزا ہو نہ سکی
جس کے لاشے پہ کبھی جی بھر کے بہن رو نہ سکی

کیوں نہ روئیں کہ ہے زہرا کی تمنا یہ عزا کیوں نہ روئیں کہ محمدؐ کا ہے وعدہ یہ بجا
پڑھ کے محضر کو وہ بیٹی کا نبیؐ سے کہنا آپ جب ہوں گے نہ تب ہر نہ شہ عقدہ کشا
کون پھر روئے گا بابا مرے جانی کے لیے
کم سے کم ماں تو رہے اشک فشانی کے لیے
بدلے احمدؐ کے نہ غمگیں ہو مری راحتِ جاں غیب سے ہوں گے مسافر کی عزا کے ساماں
روئیں گے سینہ و سر پیٹ کے اہلِ عرفاں حشر تک ہوگی ترے لال پہ فریاد و فغاں
وعدہ احمدؐ کا بہر حال وفا ہونا ہے
ہم کو تصدیقِ پیمبرؐ کے لیے رونا ہے

مرثیے میں ایسے مضامین کے بیان کو جو سننے والوں کے لیے رقت و گریہ کا سبب بنیں اس کی عام روایت کا لازمی حصہ سمجھا گیا ہے اور مرثیہ نگار عقیدت، احترام اور محبت کے اس مقدس روحانی رشتے کے تحت جو اس کے اور اس کے مخاطبین کے درمیان احساسِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے، غم کے مضامین کے بیان میں خاصے اہتمام سے کام لیتا ہے۔ نسیم نے بھی عام روایت کی پابندی کرتے ہوئے غم انگیز اور رقت آور مضامین کو اپنے مرثیوں میں جگہ دی ہے اور یوں شاعری کی ایک صنف کا فنی تقاضا پورا کرنے کے علاوہ جذباتی اور روحانی تقاضا بھی پورا کیا ہے، لیکن انھوں نے غم اور اظہارِ غم کو مرثیے کا موضوع بنانے کے سلسلے میں بعض ایسی باتیں بھی کہیں جنھیں ان کا فکری اور فنی اجتہاد کہنا چاہیے، اس اجتہاد کی ایک صورت تو یہ ہے کہ انھوں نے غم کو انسان کی فطری اور نفسیاتی ضرورت اور قانونِ فطرت کا تقاضا کہہ کر اس کی شاعرانہ توجیہ و تاویل کی ہے۔

گریۂ غم سے ہے یوں فطرتِ انساں شاداب جس طرح قطرۂ شبنم سے شگفتہ ہو گلاب
دل بہت ہوتا ہے جب دردِ نہاں سے بیتاب اف کے شعلے پہ تڑپتا ہے عمل کا سیماب
عیش جاگے ہوئے جذبے کو سلا دیتا ہے
درد سویا ہوا احساس جگا دیتا ہے

اشک اور آہ سے ممکن نہیں دنیا میں مفر — گلشنِ دہر میں روتا ہوا آتا ہے بشر
دستِ دایہ میں نہ روئے کوئی مولود اگر — عین شادی میں گہربار ہو چشمِ مادر
رونے والوں کو نہیں وجہِ ندامت رونا
نوعِ انساں کے ہے جینے کی علامت رونا

خندہ و گریہ ہے گو لازمۂ نوعِ بشر — ماتم و عیش میں اک فرق نمایاں ہے مگر
مسکراہٹ ہے عرض، اشکِ عزا ہے جوہر — وہ تصنّع، یہ حقیقت، وہ توقع، یہ ثمر
فلسفی کوئی بھی ہو، غم کا وہ ہمراز نہیں
دل کا جذبہ ہے بُکا، عقل کی پرواز نہیں

غم بہرحال ہے رازِ بشریت کا امیں — غمِ جاناں، غمِ انساں، غمِ دنیا، غمِ دیں
تپشِ دل سے ہے خالی کوئی ذی روح کہیں — ہاں وہی غم سے تہی ہے جسے احساس نہیں
لاکھ بے حس ہو کوئی اس پہ بھی غم طاری ہے
انتہا یہ ہے کہ پتھر میں بھی چنگاری ہے

آدمی ہوتا ہے جب حد سے زیادہ دل تنگ — اشک بن جاتے ہیں بیداریٔ فطرت کی ترنگ
یہ بدل دیتے ہیں ہستی کے خد و خال کا رنگ — صاف ہو جاتا ہے آئینۂ احساس کا زنگ
قلب یوں اشکِ مسلسل سے سنور جاتے ہیں
جیسے بارش میں چمن دھل کے نکھر جاتے ہیں

اسی مرثیے کے اگلے بندوں میں احساسِ غم کی جو تشریح و توضیح کی گئی ہے اس میں شاہد کی رسائی اور نفسیاتی نکتوں کی آگاہی نے کلام میں زور بھی پیدا کیا ہے اور تاثیر بھی۔

نشۂ عیش سے جب روحِ بشر ہو سرشار — عقل و ادراک پہ طاری ہو جوانی کا خمار
ہمہ تن ولولۂ زلف و مذاقِ رخسار — ساغرِ عیش بکف، لیلیٔ عشرت بکنار
ایسے عالم میں جو دل غم میں کہیں گھر جائے
وہ لگے سیلیٔ احساس کہ منہ پھر جائے

جتنا ہوگا یہ غم و درد کا گہرا احساس　　نام سے بھی طرب و عیش کے آئے گا ہراس
قصدِ عصیاں پہ یہی قلب کو ہوگا وسواس　　جیسے بیٹھا ہے کوئی ٹوکنے والا مرے پاس
سرکشی حق سے جہاں نفسِ دنی کرتا ہے
غم گناہوں کی وہاں بیخ کنی کرتا ہے

جو یہ کہتے ہیں کہ گریہ ہے شجاعت کے خلاف　　ان کا یہ دعویٰ باطل ہے حقیقت کے خلاف
یہ نہ فطرت کے مخالف ہے نہ عادت کے خلاف　　ہاں اگر ہے تو یہ مستی و غفلت کے خلاف
جس میں احساس کی شدت ہو تہور ہے وہی
اشک کے دُر جو لٹاتا ہے بہادر ہے وہی

مضامینِ غم کے ذکر اور بیان کا ایک تیسرا پہلو، جو نسیم کے مرثیوں کے اصلاحی رجحان سے مطابقت رکھتا ہے یہ ہے کہ انھوں نے "خلشِ غم" کو "جنبشِ مضرابِ عمل" اور "روحِ خفتہ کیلیے پیامِ بیداری" کہا ہے ؎

ہے خوشی دل کا سکوں اور سکوں خوابِ عمل　　غم خلش اور خلش جنبشِ مضرابِ عمل

مختلف مصرعوں اور شعروں میں یہی بات کہنے کے لیے مختلف اسالیب اختیار کیے گئے ہیں مثلاً

ع　اشک تمہیدِ عمل ہیں، دلِ مضطر سمجھے

ع　رو، کہ یہ اشک ہیں تسبیحِ عمل کے گوہر

؎ عزمِ اصلی تو ہے اعمال میں سرگرمی کا　　اک بہانہ ہے بُکا دل کے لیے گرمی کا

اور خطیب اور واعظ کے انداز میں آہ و زاری کرنے والے عزادار کو جاں نثاری اور غمگساری کی تلقین کرتے ہوئے انھیں حسینی سپاہی بننے کی دعوت دی ہے۔

جب ان کے غم میں ہو مصروف آہ و زاری میں　　تو ان کی شان بھی دکھلاؤ غمگساری میں
مقابلے کی ہوس ہو جو بے قراری میں　　حریفِ حُر کے بنو شوق جاں نثاری میں

غضب ہے تم رہِ علم و عمل سے بھاگ گئے ہو
حسینؑ کا تو سپاہی وہ ہے جو آ گئے ہو

مرثیے کے آخری بندوں میں سے دو نسیم کی مرثیہ گوئی کے دو اور اہم رجحانات کی نشاندھی کرتے ہیں، چوتھے مرثیے میں حضرت فاطمہؑ کے عقد کی جو تفصیلات، کچھ تو تاریخی شہادتوں کے حوالے سے اور کچھ شاعرانہ تخئیل کی نادرکاری کی مدد سے، نظم کی گئی ہیں ان کے متعلق شاعر نے دو دعوے کیے ہیں۔ ایک یہ کہ جس حال کو انھوں نے اپنے مرثیے میں جگہ دی ہے وہ اس سے پہلے مرثیے میں کبھی بیان نہیں ہوا اور دوسرا یہ کہ جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان میں غلو کو ذرا بھی دخل نہیں، یہ بات چھٹے مرثیے کے آخری شعر میں بھی کہی گئی ہے۔ وہاں شاعر نے یہ دعوٰی کیا ہے کہ اس نے جو مرثیہ لکھا ہے وہ ایک طرف تو طرزِ عام سے ہٹ کر ہے دوسرے اپنے طرزِ فکر کی تازگی کے لحاظ سے مرثیہ گوئی میں دورِ جدید کا نقطۂ آغاز ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ نسیم کے یہ دعوے محض دعوے نہیں، جو دعوے ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۲ء تک کے مرثیوں کیے گئے ہیں، ان کی تائید اور تصدیق کسی نہ کسی انداز میں وہ سب مرثیے کر رہے ہیں جو ۱۹۴۲ء کے بعد آنے والے ۳۲۔۳۳ برسوں میں لکھے گئے ہیں۔ ۱۹۴۳ء اور ۱۹۷۴ء کے درمیان کی طویل مدت میں نسیم نے جو مرثیے لکھے ان سے ان دعووں کی تائید و تصدیق بھی ہوتی ہے جو انھوں نے ایک واضح اعلان کی صورت میں کیے ہیں اور ان فکری اور فنی رجحانات کی بھی جن کا عکس ان کے تخلیقی سفر کے ان ابتدائی نقوش میں جا بجا نظر آتا ہے، جن میں سے بعض کی حیثیت مرثیہ گوئی کے فن کے شاہکاروں کی ہے۔

ابتدائی ادوار کے ان تخلیقی فن پاروں اور شہ کاروں کا تجزیہ کرتے ہوئے میں نے نسیم کی مرثیہ گوئی کے جن رجحانات کی تفصیل بیان کی ہے ان کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) انھوں نے مرثیے میں رثا کے مقابلے میں ثنا کو زیادہ اہمیت دی یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ انھوں نے مرثیے کو بعض حیثیتوں سے قصیدہ کا ہمسر بنایا۔

(۲) یہ مرثیہ جہاں ایک طرف واقعۂ کربلا کی تاریخی اور اخلاقی اہمیت کا مظہر ہے وہاں قوم کی

اصلاحِ حال کا وسیلہ بھی ہے۔

(۳) اصلاحِ احوال کی خدمت انجام دیتے ہوئے یہ مرثیہ اپنے عہد کے سیاسی، معاشرتی، اور اخلاقی مسائل کا ترجمان و مفسّر بھی بنا ہے۔

(۴) یہ مرثیہ صرف چند مخصوص موضوعات کے بیان تک محدود نہیں، اس میں زندگی کے ہر طرح کے مسائل کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی صلاحیت موجود ہے۔

(۵) مرثیہ گو نے جس طرح نئے مضامین سے مرثیے کے دامن کو مالا مال کیا ہے وہ اظہار و بیان کے نئے اسالیب کا خالق بھی بنا ہے۔

(۶) اور اس لحاظ سے نسیم کی مرثیہ گوئی فکری و فنی اجتہاد کا وہ سفرِ مسلسل ہے جس کا ہر مرحلہ اس فن کے مسافر کے لیے سنگِ میل کا درجہ رکھتا ہے۔

ان اشارات کی روشنی میں نسیم کے مرثیوں کی تقدیر و تحسین کا عمل شروع کریں تو ان کی جو خصوصیت سب سے پہلے ہماری توجہ کی طالب ہوتی ہے وہ ان مرثیوں کا ثنائی پہلو ہے۔ جن ثنائی یا توصیفی مرثیوں کا ذکر اب تک آیا ان میں خصوصیت سے رسولِ مقبول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام کی ذاتِ جامع الصفات ان کی حمد و ثنا کا موضوع ہیں۔ آنحضرتؐ اور حضرت امام حسینؑ کے فضائل و اوصاف کے بیان میں نسیم نے ہر جگہ ان روایتوں کو پیشِ نظر رکھا ہے جو ثقہ راویوں کے وسیلے سے ہم تک پہنچی ہیں۔ جہاں تک رسول اللہؐ کے اوصاف و فضائل کا تعلق ہے ان کے بیان میں ثنا خوانِ محمدؐ کو قرآن کی شہادت کی تائید حاصل ہے، اس میں شبہ نہیں کہ جب قلم ثنائے محمدؐ میں رطب اللسان ہوتا ہے تو حسنِ بیان کے جتنے وسیلے اس کی دسترس میں ہیں وہ سب اپنی خدمت گذاری کا پورا حق ادا کرتے ہیں۔ تعریف و توصیف کے ان مرحلوں سے گذرتے وقت خود شاعر پر بھی سرخوشی کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ لیکن یہ سرخوشی اسے کبھی جادۂ اعتدال سے نہیں ہٹاتی اور موقع محل کی مناسبت اور ضرورت کے مطابق کبھی اس پر شکوہ اسلوب میں جو خاص قصیدہ گوئی کا اسلوب ہے، کبھی بیان کے اس لطیف ایمائی پیرائے میں جو غزل خوانی کے لیے

مخصوص ہے اور کبھی اس فصیح اور سلیس بیان میں جب نسیم نے اشرف کا روز مرّہ کہا ہے شاعر حقائق کے رخ سے پردے اٹھاتا چلا جاتا ہے۔ لیکن تعریف و توصیف کے اس عمل میں شاعر کی نظر ہمیشہ اس بات پر رہی ہے کہ وہ اشرف الانبیاءؐ کے اسوۂ حسنہ کے ان رخوں کو جن کا تعلق معاشرتی زندگی کے اخلاق سے ہے ایسے پیرائے میں اپنے مخاطب تک پہنچائے کہ بات سیدھی دل میں گھر کرے اور سننے والا اس نیکی کو جو فخرِ موجودات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہے، اپنی زندگی کا وظیفہ بنائے نسیم نے ایسے فضائل کے بیان میں جو صاف سلیس اور دل نشین انداز اختیار کیا ہے اس کا اندازہ چند مثالوں سے کیجیے :۔

آنحضرتؐ کے اوصافِ حمیدہ کے متعلق نسیم کا عقیدہ یہ ہے کہ :۔ ع

ہیں از رہِ اوصافِ حمیدہ ہمہ گیر آپ

——— اور اس عقیدے کا اظہار ان کے نعتیہ مرثیوں میں اخلاقِ محمدیؐ کے ان رخوں کے بیان میں ہوتا ہے جن کا اظہار زندگی کے کسی نہ کسی واقعے کی صورت میں ہوا، مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

دم بھرتے ہیں اغیار بھی اخلاق وہ پایا — دل چھین لیا اُس کا جو سر لینے کو آیا
ادنیٰ کو بھی پاس اپنے تواضع سے بٹھایا — جو کھا کے جواہر کے خزانوں کو لٹایا
بندوں پہ جو حضرتؐ کا کرم عام ہوا ہے
اسلام اسی خلق سے اسلام ہوا ہے

——— ایک اور مرثیے کے دو بند ہیں :۔

وہ مساوات کا پیغام سنانے والے — حُر کے پہلو میں غلاموں کو بٹھانے والے
گرنے والے کو سرِ راہ اٹھانے والے — آپ جَو کھا کے جواہر کا لٹانے والے
درد دیتا جو انھیں، اس کو دوا دیتے تھے
دشمنِ جاں کو ہدایت کی دعا دیتے تھے

اے میں قربان رہِ عزم دکھانے والے — عملی درس تمدّن کا پڑھانے والے

دل میں گھر کرکے جہالت کو مٹانے والے — یعنی انسان کو انسان بنانے والے

طلبِ حق کا جو احساس جگایا تو نے
نفس کے جاگتے فتنے کو سلایا تو نے

اسوۂ رسولؐ کا یہی عکس ثناخوانِ اہلبیتؑ نے سید الشہداءؑ کی سیرت اور کردار میں دیکھا ہے۔

مراثی نسیم کا مرثیہ ؎

"اے کلکِ تو مصوّرِ معجز نگار ہے"

حضرت امام حسینؑ کی ولادت، فضائل اور شہادت کے حال میں ہے۔ ولادت کا حال بیان کرتے ہوئے نسیم نے لکھا ہے کہ ؎

سارے ہیں رنگ ڈھنگ ہمارے رسولؐ کے — ہم صورتِ نبیؐ ہیں یہ پیارے رسولؐ کے

—— اسی موقع پر جب اسما بچے کو نہلا دھلا کر شہنشاہِ بحر و بر کی خدمت میں لاتی ہیں تو شاعر اس منظر کا حال یوں بیان کرتا ہے:۔

لے آئی وہ بتولؑ کے یوسف جمال کو — آغوش میں نبیؐ نے لیا نونہال کو
خورشید نے گلے سے لگایا ہلال کو — اپنی زباں چسانے لگے اپنے لال کو
سب منتقل رسولؐ کے علم و عمل ہوئے
گھٹی میں آج ارث کے عقدے بھی حل ہوئے

دوسرے مرثیوں میں رسول اللہؐ اور امام حسینؑ کے اخلاق کی مماثلت کا ذکر بار بار آیا ہے ایک جگہ کہتے ہیں ؎

ہزار ظلم سہے منہ سے اُف نہ کی اک بار — کہ تھے مجسمۂ خلقِ احمدِ مختار

—— بند کے اگلے دو شعروں میں خلقِ محمدیؐ کے مختلف پہلوؤں کی طرف اس طرح اشارہ کیا گیا ہے:۔

وفا میں فرد، سراپا مروت و ایثار — خدا کے عاشقِ جانباز، صادق الاقرار

مصیبتوں میں نہ دب کر رہے نہ ڈر کے رہے
مگر زبان سے جو کہہ دیا تھا کر کے رہے

ایک اور مرثیے میں دو جگہ یہی بات یوں کہی گئی ہے ع

حسینؑ تجھ میں ہے سب سیرتِ رسولِ حجاز

اور ؎

شہیدِ معرکۂ جہد و ارتقا ہے حسینؑ نشانِ عظمتِ حق مثلِ مصطفےٰؐ ہے حسینؑ

اپنے معرکۃ الآرا مرثیے "اے انقلاب مژدۂ عزم و عمل ہے تو" میں اس رشتۂ اخلاق کے بیان میں ایک لطیف نکتہ پیدا کیا ہے۔ کہتے ہیں۔

یہ دینِ مصطفےٰؐ ہے اخوت کا ذمہ دار علم و عمل سے دفعِ جہالت کا ذمہ دار
حقانیت سے کشفِ حقیقت کا ذمہ دار صبر و رضا سے طاقت و عظمت کا ذمہ دار

جس میں جہادِ عزم و عمل فرضِ عین ہے
بانی نبیؐ ہیں، جزوِ متمم حسینؑ ہے

— اسی مرثیے کا ایک مصرعہ اور بھی سننے اور یاد رکھنے کے قابل ہے ع

احمدؐ کا تھا مثیل، مگر بے مثال تھا

نسیم نے اپنے مرثیے کو جس اصلاحی اور انقلابی پیغام کے اظہار اور ابلاغ کا وسیلہ بنایا اس میں اسوۂ رسولؐ کے بعض پہلو خصوصیت سے ان کا موضوعِ سخن بنے ہیں اور ان پہلوؤں میں عزم و عمل کو اور بھی زیادہ خصوصیت کے ساتھ اس پیغام کا محور و مرکز بنایا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت امام حسینؑ کی سیرت کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے بھی نسیم نے عزم و عمل کے نقش کو زیادہ ابھارا ہے۔ اور بیان کے گوناگوں پیرایے اختیار کیے ہیں کہ خیال کا حسن ہر لبتہ ہر بار ایک نئے نکھار کے ساتھ جلوہ آرا ہو۔ یہ بات مرثیوں میں جو مختلف پیرایے اختیار کرتی ہے اس کی ایک جھلک چند شعروں اور بندوں میں دیکھیے:-

دیا تھا علم کا آدم نے گو سبق پہلا　　　مگر کتابِ عمل کا ہے تو ورق پہلا

حیات کو وہ پیامِ عمل دیا تو نے　　　نظامِ فکر و نظر کو بدل دیا تو نے

ان اوصاف کا ذکر جب کسی مرثیے کے بندوں میں مسلسل آتا ہے تو جذبے کی صداقت جوش اور ولولہ بن کر ابھرتی اور خطابت و شاعری کے جملہ وسائل کی ہم آہنگی واقعات کے بیان میں سیلِ رواں کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے، اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ معرکۂ خیر و شر کے طوفانِ حوادث میں پھنسی ہوئی انسانیت کی کشتی کو حسینؑ کی ناخدائی، سلامتی کے ساحل کی طرف لیے جا رہی ہے۔ ع

"شہیدِ معرکۂ جہد و ارتقا ہے حسینؑ"

سے شروع ہونے والے جس مرثیے کا ذکر اس سے پہلے بھی آ چکا ہے اس کے ابتدائی گیارہ بند انسانیت کی فلاح و بقا اور حسینؑ کے عزم و عمل کے اس رشتے کی بڑی سچی اور بڑی مؤثر تصویر کشی کرتے ہیں۔

مرثیے کے پہلے تین بند یہ ہیں:-

شہیدِ معرکۂ جہد و ارتقا ہے حسینؑ　　　نشانِ عظمتِ حق، مثلِ مصطفےٰ ہے حسینؑ
بشر کے بھیس میں قرآن کبریا ہے حسینؑ　　　قسم خدا کی عجب بندۂ خدا ہے حسینؑ
عمل سے جیت لیا عزم کی لڑائی کو
سرِ بریدہ سے سر کر لیا خدائی کو

عمل حسینؑ سے ہے زندگی حسینؑ سے ہے　　　دلوں کا درد، دلوں کی خوشی حسینؑ سے ہے
عروجِ مرتبۂ بندگی حسینؑ سے ہے　　　کہ آدمی، بخدا، آدمی حسینؑ سے ہے
بغیر جس کے رسالت کے دل کو چین نہیں
حسینؑ، بعد میں جس کے کوئی حسینؑ نہیں

حسینؑ پیکرِ انسانیت کی جاں تو ہے　　　زمینِ صبر و تحمل کا آسماں تو ہے
نہ صرف دینِ محمدؐ کی عزّ و شاں تو ہے　　　رہِ حیات میں سالارِ کارواں تو ہے

جہاں کو خوابِ فنا سے جگا دیا تو نے
بقا کے واسطے مرنا سکھا دیا تو نے

——اگلے چھ بندوں میں اسی زور اور جوش کے ساتھ امام حسینؑ کی عالی حوصلگی، خودداری، حریت پسندی، قناعت، صبر، استغنا، بے خوفی، ثابت قدمی کا حال بیان ہوا ہے، اور پھر آخری دو بندوں میں حسینؑ کے کردار کی عظمت اور انسانیت کے مستقبل کے درمیان تعلق اور رابطہ پیدا کر کے بات یوں ختم کی گئی ہے :-

تجھی سے ہے بشریت کی زیب و زینِ حسینؑ   تو ہی تو ہے دلِ انسانیت کا چینِ حسینؑ
نہیں ہے تیری ولا جن کا فرض عینِ حسینؑ   زباں پہ اُن کی محرم میں ہے حسینؑ حسینؑ

زمانہ سمجھا ہے کچھ کچھ پیام کو تیرے
ابھی تو اور ابھرنا ہے نام کو تیرے

حسینؑ تیری شہادت پیامِ ہستی ہے   شباب و شیب ترا صبح و شامِ ہستی ہے
ترے وجود سے محکم نظامِ ہستی ہے   نظامِ ہستی و دورِ دوامِ ہستی ہے

تری لقا کے ہیں دن بے شمار بے حد سال
کہ جس کی ایک گھڑی ہیں یہ سیزدہ صد سال

حسینؑ کی سیرت وکردار سے عمل کی جو عظمت ابھرتی ہے اور عمل کی عظمت کا جو رشتہ حیاتِ دوام سے قائم ہوتا ہے اس کی طرف نسیم نے بار بار اشارے کیے ہیں اور جہاں کہیں یہ اشارے کیے ہیں ان کے کلام میں وہی زور اور جوش پیدا ہوا ہے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا، اور جسے میں اس شاعری کا جوہرِ اصلی سمجھتا ہوں جس کی اساس حق کی سربلندی کے احساس اور اس احساس کو عام احساس بنانے کے جذبہ پر قائم ہو۔ مراثیٔ نسیم کا مرثیہ ؏

کامیابِ طرب و عیش ہیں ناکامِ عمل

نسیم کے اسی فلسفۂ عمل کی تفسیر و تبلیغ ہے۔ امام حسینؑ کی سیرت کے حوالے سے عمل کی تلقین کا

یہ انداز اس مرثیہ میں بھی اسی زور اور جوش کے ساتھ اور اسی شاعرانہ اسلوب میں اختیار کیا گیا ہے جیسا کہ دوسرے مرثیوں میں، مرثیے کے اٹھائیسویں بند کے تیسرے شعر میں حضرت امام حسینؑ کا نام اس طرح آیا ہے

غیر شبیرؑ تو ایسا کوئی جرّار نہیں
غم کے حلقے میں ہے اور غم میں گرفتار نہیں

اس شعر کے فوراً بعد والے بندوں میں حضرت امام حسینؑ کی سیرت کے جن اوصاف کا ذکر ہے وہ سب زنجیرِ عمل کی کڑیاں ہیں، عمل کا احساس اور عمل کا ارادہ ان اوصافِ حمیدہ کا سرچشمہ ہے۔ شاعر سوال جواب کی صورت میں سیّد الشہدا کی شخصیت کی عظمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس عظمت کا رشتہ عمل، اور سرگرمیٔ عمل سے جوڑتا ہے

کون شبیرؑ؟ وہ خورشیدِ ضیا بارِ عمل گلِ گلستانِ علیؑ، نزہتِ گلزارِ عمل
پیکرِ صبر و سکوں، کوہِ گرانبارِ عمل خود سرِ اسرار، مگر محرمِ اسرارِ عمل

جو محمدؐ بھی ہے اور حیدرِؑ کرّار بھی ہے
صبر کی ڈھال بھی ہے، حلم کی تلوار بھی ہے

—— اس کے بعد کے مختلف بندوں میں امامِ عالی مرتبت کے صفات ایک ایک کر کے گنوائے گئے ہیں :۔

ے پیکرِ علم میں جو روحِ عمل ہے وہ حسینؑ
تا ابد خلق میں جو نورِ ازل ہے وہ حسینؑ

ع وہ مجاہد، وہ سپاہی، وہ دلاور، وہ حسینؑ

ے دبنے والا نہ کسی سے نہ اکڑنے والا
ظلم کو صبر کی رسّی میں جکڑنے والا

مالکِ صبر و رضا، وارثِ شمشیر زنی سورما، سادنت، جری، جرأت و ہمت کا دھنی

منہ سے حق بات جو کہہ دی تھی اسے کر کے رہا ظلم سے دب کے، نہ ظالم سے کبھی ڈر کے رہا

اخلاق کی جو قدریں عظمتِ انسانی کے لیے سرمایۂ شرف بنتی ہیں پیغمبر آخرالزماں کی ذات والاصفات ان کا کامل ترین نمونہ ہے اور حضرت امام حسینؑ کی ذات اخلاق کی بلندی میں ان کی مثیل، زندگی کے امتحانوں اور آزمائشوں میں ان برگزیدہ ہستیوں کا فکر و عمل انسان کے لیے ہدایت کی شمعِ فروزاں ہے۔ نسیم نے اپنے مقصدی مرثیوں میں یہ شمعِ فروزاں قدم قدم پر جلائی ہے اور اسی کے سہارے معاشرتی اصلاح کا سنگلاخ اور دشوار گذار راستہ طے کیا ہے حسنِ اخلاق اور حسنِ عمل کی اسی شمع کے اُجالے نے انھیں امید کے اس رُخِ تاباں کا جلوہ دکھایا ہے جو مستقبل کے پردوں میں چھپا ہوا ہے، اور یوں ان کا مرثیہ حال کی اصلاح اور مستقبل کی امید اور یقین کا پیامبر بنا ہے۔

عمل اور علم کی آغوش میں پرورش پانے والی امید کا سراغ نسیم کو جس طرح پیغمبرِ اسلام اور شہیدِ کربلا کے حیات بخش افعال و اعمال میں ملا ہے اس کے جلوے انھوں نے ان زندگیوں میں بھی دیکھے ہیں جنھیں یا تو رسولؐ کی ذات سے کوئی قریبی نسبت اور علاقہ ہے یا جن کے قلب و ذہن اس نور سے منور ہوئے ہیں جس کا منبع اسلامی تعلیم ہے۔

اخلاق اور اصلاح کا یہی وسیع تر اندازِ نظر ہے جو نسیم کے اس خیال کا محرک بنا ہے کہ انھوں نے مرثیے میں فضائل کے بیان اور شہادت کے ذکر کو صرف شہدائے کربلا کی ذات تک محدود نہیں رکھا۔ اسی اندازِ نظر کے تحت فضائل کے بیان میں اولیت انھوں نے علی الترتیب حضور سرورِ کائنات اور سید الشہداءؑ کے فضائل کو دی۔ دوسرے شہدائے کربلا کے حال میں الگ الگ مرثیے بھی لکھے اور کئی مرثیوں میں ان کی قربانی کا تذکرہ من حیث الجماعت کیا، ان برگزیدہ اشخاص و افراد کے علاوہ جن کی سیرت و کردار کو عام طور سے مرثیے کا موضوع بنایا گیا ہے، نسیم نے حضرت علیؑ کے فضائل اور شہادت کا ذکر بھی مختلف مرثیوں میں کیا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ رسول اللہؐ، حضرت علیؑ اور امام حسینؑ کا ذکر ایک ہی مرثیے میں ترتیب وار اس طرح کیا گیا

کہ دیکھنے والوں نے ان تینوں عالی مرتبت شخصیتوں کے اوصاف و اعمال میں ایک ہی نور کا جلوہ اور عکس دیکھا، حضرت علیؑ کے علاوہ حضرت فاطمہؑ کا ذکر بھی مرثیوں میں بار بار آیا ہے۔ اوّل تو اس لیے کہ سید الشہداء کی پرورش اور تربیت انھیں کی آغوشِ محبت میں ہوئی اور دوسرے اس لیے کہ سیدۃ النساءؑ کی حیاتِ طیبہ خانگی زندگی کے آداب اخلاق کا مثالی نمونہ ہے، ان کے معمولاتِ زندگی کا ہر لمحہ عمل کی عظمت اور اس کے شرف کا شاہدِ عادل ہے۔

لیکن نسیم کے ممدوحین کی فہرست یہیں ختم نہیں ہو جاتی، ان کے تاریخی تصوّر اور اسلامی تخیل نے دو اور شخصیتوں کو بھی اپنی ثناخوانی اور مدح گستری کا موضوع بنایا، ان میں سے ایک ذات حضرت جعفرؑ کی حقیقی عم اور شیرِ خدا حضرت علیؑ کے والد محترم جناب ابوطالبؑ کی ہے اور دوسری ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی۔ ان دو ہستیوں کے نسیم کا ممدوح بننے میں جہاں اُن کے ذاتی اوصاف و فضائل کو دخل ہے وہاں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ دونوں کو رسول اللہ کی ذاتِ گرامی سے ایک نسبتِ خاص ہے اور دونوں رسولؐ کے کام میں ان کے ممد و معاون ہیں، دونوں مرثیوں کے ابتدائی بندوں میں نسیم نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

شریکِ دعوتِ اسلام ہیں ابوطالبؑ | نبیؐ کو حق کا اک انعام ہیں ابوطالبؑ
حریمِ وحی میں الہام ہیں ابوطالبؑ | حرم کے عزم کا احرام ہیں ابوطالبؑ

یہ چمن کے لائیں جو غنچہ وہ پھول ہو جائے
پھر اُن کے گھر میں پلے، پھر رسول ہو جائے

رسولِ رب کے نگہبان ہیں ابوطالبؑ | نبیؐ ہیں دین تو ایمان ہیں ابوطالبؑ
نزولِ وحی کا عنوان ہیں ابوطالبؑ | بغیر لفظوں کا قرآن ہیں ابوطالبؑ

انھیں کے دم سے ہوئی ابتدائے بسم اللہ
انھیں نے نقطہ دیا زیرِ بائے بسم اللہ

۹۳ بند کے اس توصیفی مرثیے میں جناب ابوطالبؑ کے فضائل کے بیان میں جہاں

ایک طرف حسنِ عقیدت کی کارفرمائی ہے وہاں حقیقت نگاری کے تقاضے بھی بڑی احتیاط کے ساتھ پورے ہوئے ہیں۔ واقعات کے بیان میں مستند روایتوں اور شہادتوں سے استنباط کیا گیا ہے اور دعووں کی بنیاد استدلال پر رکھی گئی ہے۔ بات کہیں محض کلام کے زور سے نہیں منوائی گئی بلکہ عموماً ہوا یہ ہے کہ حقائق کے اظہار میں سادگیٔ بیان کو وسیلہ بنایا گیا ہے اور اس سادگیٔ بیان کو برابر شاعرانہ تخیل کی تائید حاصل رہی ہے، اگلے بندوں میں واقعہ نگاری اور ثنا خوانی کیا صورتیں اختیار کرتی ہے اس کا اندازہ چند مصرعوں اور شعروں سے لگائیے۔

بند ۳: پیمبری کی بلاؤں کا رد ابوطالبؑ
مدد خدا کی ہے شکلِ مدد ابوطالبؑ

بند ۵: ہزار تیغیں تھیں اور اک سپر ابوطالبؑ

بند ۶: ہر اک محل میں ہیں مشکل کا حل ابوطالبؑ
نبیؐ کی جرأتِ عزم و عمل ابوطالبؑ

ع گِنو تو فرد تھے، سمجھو تو ایک لشکر تھے

فضائل و اوصاف کے بیان میں ہر جگہ سادگی اور ایجاز کو دخل ہے۔

ع ہوں ایک پلّے میں سب، ایک میں ابوطالبؑ

ے عمل کے آپ کا پلّہ نہ کیوں رہے بھاری
کہ ہیں یہ عاشقِ محبوبِ ایزدِ باری

ے گراں سے بھی ہے گراں تر بچشمِ دینداری
نبیؐ کے دَورِ عبوری میں ان کی غمخواری

کسی کے دل کو پرکھنے کا مستقل معیار
اک اس کا قول ہے اور ایک سیرت و کردار

بتوں کے دور میں وحدت پرست، کفر شکن
امینِ امن و اماں، قامعِ شرور و فتن
ستم زدوں کے، یتیموں کے ملجا و مامن
عمل کا گنجِ گراں، علم و فضل کا مخزن

عمل کو دیکھیے یا جانچیے صفائیٔ دل
ہر اک لحاظ سے ہیں احترام کے قابل۔
قوی جو فکر و بصیرت تو معرفت کامل
کرم میں آبِ رواں عزم میں پہاڑ کی سِل

یہ نیکیاں ہیں مُسلّم جو آپ نے کی ہیں
بشر کے بھیس میں گویا جہانِ نیکی ہیں

——— اوصاف کے بیان میں بار بار شخصیت کے عملی پہلو اور عزم و عمل کے باہمی رشتے کی طرف جو اشارے ہیں ان میں نسیم کی مرثیہ گوئی کے اس رجحان کا عکس ہے کہ انھوں نے مرثیے کو عمل کی تلقین اور معاشرے کی اصلاح کا فنی وسیلہ بنایا ہے۔

دوسرے مرثیے کا اصل موضوع پیغمبر آخر الزماںؐ اور اُمّ المومنین جناب خدیجہؑ کا عقد ہے۔ لیکن اس عقد کو مرثیہ نگار نے اس لیے اہمیت دی ہے کہ یہ عقد تبلیغِ اسلام کے بالکل ابتدائی دَور میں داعیِ اسلام کے لیے تائید و تقویت کا باعث بنا، تائید و تقویت کے اس پہلو کا ذکر کرتے ہوئے مرثیہ نگار نے اس حقیقت کی طرف سے چشم پوشی نہیں کی کہ زندگی کے کاروبار کی طرح دین کے کاروبار میں بھی مادّی وسائل کی موجودگی ضروری ہے اور یہ بات بلا کسی تکلف و تامل کے صاف، سیدھے اور غیر مبہم انداز میں کہی گئی ہے۔ مرثیے کے تیسرے اور چوتھے بندوں میں اس خیال کا اظہار اس طرح ہوا ہے :-

آ گئیں گھر میں یہ احمدؐ کے تو ہر کام چلا
مال سے ان کے بڑی شان سے اسلام چلا
قافلہ دینِ محمدؐ کا بہ آرام چلا
فرش سے حمد چلی، عرش سے پیغام چلا

سہرا اسلام جہیز ان کا بنا وجہِ حیات — حشر تک دین جسے یاد رکھے گا دن رات

برکت ان کے قدم کی تھی مصائب سے نجات — عقد ان کا تھا نبیؐ کے لیے پیغامِ برات

مرثیے میں حضرت خدیجہ کی عظمت کے بیان کے علاوہ عقد کا فلسفہ بھی بیان ہوا اور شادی کی تفصیلات کا حال بھی ایک ایسے انداز میں آیا ہے جسے شاعرانہ حقیقت پسندی کا نام دینا مناسب ہو گا۔ تخیل نے شادی کی تفصیلات کی ترتیب میں اپنے معاشرے کے رسم و رواج کو پس منظر بنایا ہے اور جہاں کہیں موقع ملا ہے انسانی زندگی میں عمل کی اہمیت کے متعلق سرسری اشارے بھی کیے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ سہرے کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے ؎

دستِ قدرت کی عطا نورِ ازل کا سہرا — علم کے پھولوں سے گوندھا ہے عمل کا سہرا

مرثیے کے آخر میں مرثیہ نگار نے واقعاتِ کربلا کی طرف گریز کی ہے اور اسے انسان کے لیے امتحاں گاہِ عمل کہا ہے۔

ع امتحاں گاہِ عمل معرکۂ کرب و بلا

—— یہ دونوں مرثیے جہاں اس لیے اہم ہیں کہ ان میں دو ایسی شخصیتیں مرثیے کا موضوع بنی ہیں جن کے کرداروں کی صداقت اور استقامت ایک ایسے زمانے میں اسلام کے لیے تائید و تقویت کا باعث بنی جب وہ ہر طرف سے خطروں میں گھرا ہوا تھا، اصلاحی شاعری کی تاریخ میں بھی انھیں یہ امتیاز حاصل ہے کہ مرثیہ ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اخلاق کی ایسی قدروں کی اشاعت کا فریضہ ادا کیا جو ترقی کی راہ میں قوموں کا زادِ سفر اور خیر و شر کے تصادم میں ان کی سپر بنتی ہیں۔ یہ دونوں شخصیتیں تاریخِ اسلام کے اس دور کی شخصیتیں ہیں جب لوگوں کے سینے نورِ ایمانی سے منور نہیں ہوئے تھے، لیکن دیکھتے دیکھتے یہ ہوا کہ ؎

دیارِ کفر میں کلمے کی دھوم مچنے لگی — بہارِ نغمۂ وحدت فضا میں رچنے لگی

نغمۂ وحدت کی صدائیں فضا میں گونجیں اور ہر وقت کی رفتار کے ساتھ نغموں کی گونج ایک سرزمین سے دوسری اور دوسری سے تیسری میں پہنچتی رہی، رسائی کا دائرہ پھیلتا رہا اور

دنیا کا ہر گوشہ اس نور سے جگمگا اٹھا اور زمین کے خطے خطے میں اس اعلیٰ انسانی اخلاق کا دَور دَورہ ہوا حسین کا داعیِ اسلام تھا، اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ کے ہر ورق پر حسنِ عمل کے لافانی نقوش ثبت ہیں۔ ہمارے اپنے دَور کی تاریخ بھی ان روشن اور تابندہ نقوش سے خالی نہیں۔ خود ہماری آنکھوں نے بھی اپنے درمیان ایسی شخصیتوں کا جلوہ دیکھا ہے جن کے قول و فعل سے زندگی کی راہیں روشن ہیں۔ جو شاعر شعر کو ہدایت و رہنمائی کا وسیلہ بنانا چاہتا ہے وہ اپنے عہد کی شخصیتوں کے اقوال و اعمال کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر حسنِ عمل کی شمعوں کو روشن رکھنے کے کام میں مصروف رہتا ہے۔ نسیم نے مرثیے کے دائرۂ عمل کو وسعت دے کر اس سے اصلاح و ترقی کی جو خدمت لی ہے اس میں اپنے عہد کے بعض اکابر کی مثال کو بھی مشعلِ راہ بنایا ہے اور ان کی وفات پر مرثیے لکھ کر ان اخلاقی قدروں کے نقش کو واضح کیا ہے جن سے ترقی کی راہوں کا سفر آسان بنتا ہے۔ ان کے مرثیوں میں بعض مرثیے ایسے ہیں جو انھوں نے علماء، فضلاء اور رہنمایانِ دین کے ارتحال پر لکھے۔ ایسے مرثیوں میں پہلا مرثیہ ناصر الملت والدین سید ناصر حسین قبلہ کی وفات پر ۱۹۴۰ء میں لکھا۔ ۱۳۸ بندوں کے اس طویل مرثیے کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر حصے میں ایک مخصوص موضوع پر اس طرح اظہارِ خیال کیا گیا ہے کہ اس موضوع سے متعلق شاعر اپنے سامع یا قاری کو جو کچھ بتانا چاہتا ہے وہ اس سے پوری آگاہی بھی حاصل کر لے، اور مختلف موضوعات کے بیان سے جو مجموعی تاثر پیدا کرنا مقصود ہے اس میں بھی کمی نہ آئے۔ مرثیے کے ہر حصے میں خیال اور بیان کا موزوں اور متوازن ربط بھی ہے، موضوع اور لہجے میں خوشگوار ہم آہنگی بھی اور ان چیزوں کے ساتھ ساتھ شروع سے آخر تک مقصدیت کی وہ لہر بھی جسے نسیم نے شعوری طور پر اپنے مرثیوں میں جگہ دی ہے۔

مرثیے کے ابتدائی سولہ بندوں میں علم کی عظمت مرثیہ نگار کا موضوعِ سخن ہے۔ ان بندوں میں جہاں بڑے سنجیدہ علمی لہجے میں لطیف خیالوں اور موزوں تشبیہوں کی مدد سے علم کی فکری اور حکیمانہ عظمت اور اہمیت واضح کی گئی ہے، مرثیہ نگار علم اور عمل کے باہمی رشتے کا

احساس دلانے سے کبھی غافل نہیں رہا۔ ع

جہدِ بقا میں اہلِ عمل کی سپر ہے علم

—— اس سے آگے کے بندوں میں علم و ادب کی شخصیتوں اور ان کے کارناموں کی مدد سے لکھنؤ کی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ لکھنؤ کو ہندوستان میں علم و اجتہاد کا گہوارہ کہہ کر وہاں کے چار علماء کے اجتہاد کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی گئی ہے اور یہاں بھی ان کی زندگی کے عملی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے ع

یکتا عمل میں، علم میں لاثانیٔ جہاں

ے
عارف تھے دینِ پاکِ رسولِ حجاز کے
سجدے تھے چار صبحِ عمل کی نماز کے

تیسویں بند سے ناصر الملۃ کا مرثیہ شروع ہوتا ہے اور ساٹھ پینسٹھ بندوں میں ان کے علمی اور روحانی مقام، ان کی جامعیتِ علمی، ان کی تعلیم، ان کی تصانیف اور ان تصانیف کے مطالب اور فیضِ جاریہ کی تفصیلات بڑے جامع انداز میں بیان کی گئی ہیں، لیکن ان تفصیلات کے بیان میں بھی اخلاقی اور اصلاحی نقطۂ نظر بار بار ابھرا ہے اور ہر جگہ اس میں ایک نیا رنگ اور نئی تاثیر ہے۔

ع سینہ وفورِ غم سے ہے علم و عمل کا چاک

ے علم و عمل جو ساتھ ریاضت سمیت تھے — اک نقشِ پائے قافلۂ اہلبیتؑ تھے

ے زہد و ورع کا جامع پُرنور زیب تن — علم و عمل، عبا و قبا، فضل پیرہن

توصیف کے حصے کے بعد تابوت کی آگرہ کو روانگی، آگرہ میں تابوت کے خیر مقدم اور شہر آگرہ کی عظمت کی بیانیہ مرقع کشی کی گئی ہے اور آخر میں آگرے کو لکھنؤ کا پیغام دے کر مرثیے کو واقعۂ کربلا کی طرف ملنے لیکن رقت آمیز اشاروں پر ختم کیا گیا ہے۔ لیکن مرثیے کے ان آخری

بندوں میں بھی عمل کا پیغام نوید بیداری بن کر دلوں کو گرماتا رہتا ہے : ؎

جانِ عمل کی نعش تھی ملّت کے دوش پر
پروانوں کا ہجوم تھا شمعِ خموش پر

علم و عمل کا چاند جو برجِ فنا میں تھا
واناصرا کا شور جلوسِ عزا میں تھا

تنہا نہ یاں سے لاشۂ جانِ عمل گیا
علم و کمال کا بھی جنازہ نکل گیا

علم و عمل کا ذکر جو بعد از وفات ہے
اخلاف کے لیے یہ پیامِ حیات ہے

علماء کی وفات پر اسی طرح کے دو اور مرثیے نسیم نے "رثاءِ محسن الحکیم" اور "رثاءِ رشید ترابی" کے نام سے، آقائے محسن الحکیم اور علامہ رشید ترابی کے انتقال پر علی الترتیب ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۳ء میں لکھے۔ رثاءِ محسن الحکیم میں کل ۹۲ بند ہیں، آخری پانچ بندوں کے علاوہ مرثیے کے باقی بندوں میں یا تو مختلف اسالیب میں علم و عمل کے باہمی رشتے کے متعلق اظہارِ خیال کیا گیا ہے، یا آقائے محسن الحکیم کے ذاتی اوصاف کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ مرثیے کا پہلا بند علم و عمل کے باہمی ربط کے ذکر سے شروع ہوتا ہے ؎

چراغِ منزلِ عرفاں ہے نورِ علم و عمل
تجلّیات کا منظر، ظہورِ علم و عمل
مگر، وہ حبیب کہ ہو اتنا وفورِ علم و عمل
کہ لاشعور میں ضم ہو شعورِ علم و عمل

— دوسرے بند میں علم و عمل کے باہمی رشتے کی وضاحت مثالوں کی مدد سے کی گئی ہے اور عالم کی ذات میں علم و عمل کے وجود کو لازم و ملزوم قرار دیا گیا ہے ؎

بشر کی روح ہے علم اور دل و ضمیر عمل
وہ ہے سراجِ منیر اور مستنیر عمل
سرشتِ فکر ہے وہ، سعی کا خمیر عمل
وہ اقتدارِ امارت ہے اور امیر عمل

جو علم سے ہے عمل تو عمل سے عالم ہے		نہ ہو عمل تو وہ عالم نہیں ہے ظالم ہے

اگلے بندوں میں بھی دونوں کا باہمی تقابل جاری رہتا ہے اور تخیل کی جستجو اور کاوش اس تقابل کے اثر اور معنویت میں اضافہ کرنے کے لیے نئی سے نئی تشبیہ مہیا کرتی چلی جاتی ہے۔

تیسرے بند میں یہ صورت دوسرے بند سے بھی زیادہ ہے :-

جمال شاہدِ حق علم ہے، عمل ہے جلال		محاسنِ ابدی کا وہ نور ہے، یہ کمال
وہ نخل ہے یہ ثمر ہے، وہ مال ہے یہ مآل		وہ فلسفہ یہ حقیقت، وہ قیل و قال یہ حال

جہانِ ذات وہ ہے، عالمِ صفات یہ ہے
حیات وہ ہے، مگر مقصدِ حیات یہ ہے

—— ہر بند کے بعد آنے والا اگلا بند کشفِ معانی کی ایک نئی کلید بن کر سامنے آتا ہے اور شاعر قرآنِ حکیم کے کنایات اور تصوف و حکمت کے مصطلحات کی مدد سے علم و عمل کے ربط کو مستحکم سے مستحکم تر بنا تا چلا جاتا ہے۔ تقابل و تماثل کے اس عمل میں حکیمانہ استدلال اور شاعرانہ بیان کا ایسا مؤثر اظہار ہے کہ پڑھنے والا ان کی رو میں بہتا چلا جاتا ہے۔ جی تو یہ چاہتا ہے کہ جب تک یہ سلسلہ جاری رہے میں بھی بند پر بند نقل کرتا چلا جاؤں، لیکن طولِ کلام کے خوف سے مختلف بندوں کے جستہ جستہ مصرعے اور شعر پیش کر رہا ہوں کہ ذہن شاعر کے ان تصورات کا احاطہ کر سکے جو علم اور عمل کے تعلق کے سلسلے میں اس کے ذہن میں ہیں اور جن کے مسلسل اعادہ و تکرار سے وہ اس نقش کو مستحکم کرنا چاہتا ہے جو اس کی اصلاحی شاعری کی اساس ہے۔ اب چند مصرعے اور شعر سنیے :- ؎

وہ کنزِ مخفیِ غیبی، یہ کُن فکاں کی متاع		وہ لامکاں کی ہے پونجی، تو یہ مکاں کی متاع

وہ ضو سمیع کی ہے، یہ بصیر کا پرتو		علیم کی وہ جھلک، یہ قدیر کا پرتو

ع جو علم خلدِ بریں ہے تو اس کا در یہ ہے

ضیائے علم سے قائم ہے آب و تابِ عمل — بغیرِ علم نہیں کوئی کامیابِ عمل

نبیؐ ہیں علم کے ساتھ اور نبیؐ کے ساتھ عمل — علیؑ کا صدر ہے علم اور علیؑ کا ہاتھ عمل

ع نبیؐ ہیں منزلِ علم و عمل کے ماہِ تمام

تمہیدی بندوں کے بعد اجتہاد کے فلسفے کی وضاحت ہے، پھر معاشرے میں مجتہد کے مقام اور درجے کی اہمیت کی طرف بلیغ اشارے ہیں اور ان اشارات کی تشریح، توضیح و تائید کے لیے تاریخی تسلسل کے ساتھ بہت سی ایسی شخصیتوں کے نام لیے گئے ہیں جن کا اجتہاد مُسلّم ہے۔ اس طویل تمہید کے بعد ستاونویں بند میں محسن الحکیمؒ کا ذکر شروع ہوتا ہے:

ع اسی گروہ میں اک محسن الحکیم بھی تھے

——— شاعر ان کے ذاتی فضائل کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بار بار اپنے پسندیدہ موضوع کی طرف لوٹ کر آتا ہے اور علم و عمل کے باہمی رشتے کی منطق اسی انداز سے مرثیے کے آخر تک جاری رہتی ہے۔ مثلاً:

ع مزاجِ علم و عمل کا وہ امتزاجِ حسینؑ

بوقتِ درس معلّم تھے یہ، نبیؐ کی قسم — دمِ جہاد مجاہد بھی تھے علیؑ کی قسم

مزاجِ فقر میں ہیبت بھی، دل نوازی بھی — وہ مجتہد بھی، مُعلّم بھی اور غازی بھی

بلند چہرِ فلک سے کلاہِ علم و عمل　　　نجف کے چاند کا پرتو یہ ماہِ علم و عمل

زوالِ عزم و عزیمت ہے اس زعیم کی موت　　　وفاتِ علم و عمل محسن الحکیم کی موت

ابھی تو قوم کی تنظیمِ عام باقی ہے　　　حیاتِ نو کا ابھی اہتمام باقی ہے

—— قوم کی تنظیمِ عام اور حیاتِ نو کا اہتمام نسیم کے مرثیوں کا وہ موضوع ہے جس نے شاعر کو عمل کے فلسفے کا مفسر اور ایک مخصوص صنفِ ادب کے ذریعے اس کی معاشرتی اور قومی افادیت کا مبلغ بنایا ہے۔ "عمل" کی تلقین کے اس فلسفے کی تشریح اور اس فلسفے کی عملی افادیت واضح کرنے اور اسے لوگوں کا وظیفۂ عام بنانے کی تدبیروں کا عکس اسی سلسلے کے تیسرے مرثیے رثاءِ رشید ترابی میں بھی موجود ہے۔ لیکن وہاں اس کا رنگ ذرا دوسرا ہے۔

علماء کے رثائی مرثیوں میں جہاں نسیم نے ایک طرف ہر عالم اور مجتہد کی سیرت کی ان خصوصیات کا ذکر کیا ہے، جو رسولؐ اور آلِ رسول سے قلبی اور روحانی تعلق کی بناء پر ان میں پیدا ہوئی ہیں، وہاں ہر عالم میں بعض ایسے اوصاف بھی ہیں جو اسی کی ذات سے مخصوص ہیں اور جنھیں اسی کا امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ عالمِ باعمل ناصر الملۃ کا امتیازِ خاص ہے اور اجتہاد آقائے محسن الحکیم کا، اسی طرح خطابت علامہ رشید ترابی کا امتیازِ خاص ہے، چنانچہ ان کے حال میں لکھے ہوئے مرثیے کی فکری و فنی ترتیب میں ان کے اسی امتیاز کو تفکر و تخیل کی اساس بنایا گیا ہے اور اسی امتیاز کے ربط اور نسبت سے مرثیے کو اصلاح کا رُخ اور رنگ دیا گیا ہے، لیکن اس طرح کہ ممدوح کے دوسرے اوصاف اور مخصوص وصف کے درمیان جس کا تعلق قومی اصلاح و فلاح سے ہے، صحیح ربط قائم ہو، علامہ رشید ترابی کی خطابت کے اوصاف بیان کرتے ہوئے مرثیہ نگار نے جہاں تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے وہاں ان کے بیان میں ادبی ایجاز کو بھی برابر ملحوظ رکھا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ان کی شخصیت کو بہت سے اوصاف کا مجموعہ

بناتے ہوئے ایک بند کے چار مصرعوں میں بہت سی باتیں یکجا کر دی ہیں :- ؎

فقہ و اصول و فلسفہ و منطق و کلام　　سیرت، خبر، رجال، معانی، ادب تمام
اخلاق، علمِ نفس، تمدن کے سب نظام　　افکارِ شرق و غرب کا خوش ذائقہ قوام

ـــ ایک اور بند میں بعض اوصاف کا ذکر اس طرح آیا ہے :-

اس جامعیّت اور تبحّر کے باوجود　　وقفِ مطالعہ تھا ہر اک لمحۂ وجود
فکرِ معاملات، نہ ذکرِ زیان و سود　　ہر شئے بقیدِ وقت، کتابیں بلا قیود

دریائے معرفت میں غریقِ حدیث تھے
دو سو طُرُق سے خضرِ طریقِ حدیث تھے

اس سے آگے کے بندوں میں جہاں علّامہ کے دل نشیں طرزِ بیان، ذوقِ شعری اور مضموں آفرینی کی روشِ جداگانہ اور اُن کی شیریں زبانی، جادو بیانی اور نکتہ دانی، نیز اقبالؔ، انیسؔ اور غالبؔ کے کلام سے ان کے شغف کی طرف اشارے کیے گئے ہیں، وہاں سیاستِ ملکی سے ان کے تعلقِ خاطر کا ذکر کر کے حُبِّ وطن کے احساس کو ابھارا گیا ہے۔ ایک شعر ہے۔ ؎

مسلک میں اپنے مجلس و ماتم کے ساتھ تھے
حُبِّ وطن میں قائدِ اعظم کے ساتھ تھے

ـــ اور اس شعر کے بعد کا اگلا بند ہے :-

ملکی معاملات میں بزمِ دکن کے رُکن　　یعنی وہاں کی سب سے بڑی انجمن کے رکن
اس حال میں بھی منبرِ قلعہ شکن کے رکن　　کانٹوں میں گھر کے بھی رہے آخر چمن کے رکن

بہرِ فلاحِ قوم قیادت قبول کی
یہ ان کا ظرف تھا نہ وزارت قبول کی

نسیمؔ امروہوی کے شخصی مرثیوں کے تعارف میں کسی قدر تفصیل سے کام لینے کی ضرورت

اس لیے تھی کہ اکابرِ قوم اور خصوصاً علمائے ملت کے مرثیے لکھنے کا رجحان اُردو کے جدید مرثیے کا بڑا اہم رجحان ہے، اور اس رجحان کا آغاز کرنے اور مستقل مزاجی کے ساتھ اس رجحان پر قائم رہنے کا سہرا نسیم امروہوی کے سر ہے۔ نسیم نے شخصی مرثیوں کو اپنی کاوشِ فکر، ندرتِ تخیل مہارتِ فن، اور قدرتِ بیان سے جو وقیع اور حسین صورت دی وہ مرثیہ گوئی کی تاریخ میں ایک مستقل اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ حقائق کی جستجو میں تحقیق و تدقیق اور حقائق کے بیان میں مبالغے سے اجتناب ان شخصی مرثیوں کی دو اہم خصوصیتیں ہیں۔ مرثیے کو اخلاق کی تلقین اور قومی اصلاح کا ذریعہ بنانے کے رجحان سے پیدا ہونے والی ایک اور خصوصیت جو ان مرثیوں میں مشترک ہے یہ ہے کہ خیالات اور تصورات کے بیان کے لیے اظہار کے زیادہ سے زیادہ متنوع وسائل اختیار کیے گئے ہیں، بات موقع اور محل کی مناسبت سے کبھی قصیدے کے پُرشکوہ اسلوب میں کہی گئی ہے اور کبھی غزل کے رنگین اور مترنم لہجے میں۔

شخصی اور توصیفی مرثیوں سے قطعِ نظر ہم ان کے دوسرے مرثیوں کا جائزہ لیں تو بہ حیثیت مجموعی ان میں دو رجحانات کا عکس ملے گا۔ اوّل تو یہ کہ مرثیہ نگاری کے ہر دور میں مرثیے کے مضامین اور موضوعات کا دائرہ وسیع کیا اور دوسرے یہ کہ اظہار و بیان کے نقطۂ نظر سے اس میں بعض ایسی چیزیں داخل کیں جن سے یا تو مرثیے میں قطعی کام نہیں لیا گیا یا لیا گیا تو بڑے محدود پیمانے پر۔ نئے مضامین اور موضوعات کو مرثیے کا موضوع بنانے کے رجحان نے جو مختلف صورتیں اختیار کیں ان میں سے دو کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ ایک تو تاریخِ اسلام کی ایسی شخصیتوں کے حال میں مرثیے لکھنا جن کے حال کو کسی اور مرثیہ نگار نے موضوعِ سخن نہیں بنایا تھا اور دوسرے مرثیے میں ایسے مضامین کا داخل کرنا جو تربیتِ اخلاق اور قومی اصلاحِ احوال کا وسیلہ بنیں، لیکن نئے موضوعات اختیار کرنے کی روش کی پابندی نے اردو مرثیے میں بعض ایسے مضامین داخل کیے جن سے ایک طرف تو اس کے معنوی حدود میں وسعت پیدا ہوئی اور دوسری طرف مرثیہ نگار کے اصلاحی مقصد اور نصب العین کو تقویت پہنچی۔ نئے مضامین کی اسی تلاش نے اردو مرثیے کے

سرمائے میں ان مرثیوں کا اضافہ کیا جن میں سے ایک میں حضرت فاطمہؑ کے عقد کو اور دوسرے میں اُمّ المومنین حضرت خدیجہ کے عقد کو موضوع بنایا گیا ہے۔ حضرت خدیجہ والے مرثیے کا ذکر کسی اور ضمن میں اس سے پہلے آچکا ہے، لیکن سیدۃ النساء کے عقد والے مرثیہ کا تفصیلی ذکر اب تک نہیں ہوا، اس بات کا ذکر البتہ ضمناً ہے کہ یہ مراثیٔ نسیم کی جلد اوّل میں شامل ہے اور ان مرثیوں میں سے ایک ہے جو ۱۹۳۳ء اور ۱۹۴۲ء کی درمیانی مدت میں لکھے گئے ہے۔ ساسٹھ بند کے اس مرثیے کا آغاز سیدۃ النساء کے فضائل کے بیان سے ہوا ہے۔ عقیدت کے رنگ میں ڈوبا ہوا مرثیے کا یہ حصہ زبان وبیان کی سلاست اور پاکیزگی کا بڑا دلکش نمونہ ہے اور اس لحاظ سے قابلِ توجہ کہ مرثیہ نگار نے مرثیے کے اس ٹکڑے میں جو باتیں کہی ہیں انھیں تاریخ کی تائید حاصل ہے۔ تیرھویں بند سے عقد کا بیان شروع ہوتا ہے، اور آخری پانچ بندوں کے علاوہ جن میں شاعر نے شادی کی مسرتوں کے پس منظر میں، تقابل کی صورت میں واقعۂ کربلا کے مناظر پیش کیے گئے ہیں اور محبانِ اہلبیتؑ سے اشکوں کا خراج وصول کیا ہے، پورے مرثیے میں عقد کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ ان تفصیلات کے بیان میں کچھ تو وہ واقعات شامل ہیں جو تاریخ کے وسیلے سے ہم تک پہنچے ہیں اور زیادہ تر وہ چیزیں جو شاعر کے مشاہدے اور تخئیل نے مہیا کی ہیں۔ مشاہدے نے ان رسموں کا احاطہ کیا جو شادی بیاہ کے موقع پر ہمارے معاشرے میں رائج ہیں اور تخئیل نے مناظر کی وہ تصویریں بنائیں جن سے عقد کی وہ رسم جو فقر اور سادگی میں آپ اپنی مثال ہے، حسن وشکوہ کی ایسی تقریب بن گئی جس پر شاہی کو بھی رشک آئے۔ تفصیلات کے بیان میں جہاں تخئیل کی نادرہ کاری کے کرشموں کو دخل ہے وہاں حسنِ بیان کے جملہ لوازم نے بھی آرستگی اور زیبائی کا پورا حق ادا کیا ہے۔ نازک اور لطیف تشبیہیں، سادہ لفظوں اور ترکیبوں کے نغماتی آہنگ اور تصویر کاری کے موزوں سلیقے سے عقد کی یہ تقریب واقعہ نگاری کا ایسا حسین مرقع بنی ہے جو مرثیوں کے نگارخانے میں اس سے پہلے کہیں آویزاں نظر نہیں آتا۔

؎ خود اس مرثیے کا سالِ تصنیف ۱۹۳۷ء ہے۔

مرثیہ کو نوع بہ نوع خیالات کا آئینہ خانہ بنانا نسیم کے منصبِ مرثیہ گوئی کا ایسا رخ ہے جس کا عکس ان کے بالکل ابتدائی تخلیقی نقوش میں بھی نظر آتا ہے۔ خیالات کی جدت اور ندرت اظہار کے نئے پیرایے کی طالب ہوتی ہے اور اکثر و بیشتر یہی ہوتا ہے کہ ہر خیال اپنا قالب اور اس قالب کا سامانِ تزئین خود اپنے ساتھ لاتا ہے۔ چنانچہ نسیم کی مرثیہ گوئی میں جدتِ خیال اور جدتِ بیان کے رجحانات ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے اور نئی نئی صورتیں اختیار کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اظہار و بیان کو ہمیشہ ایک نئی، مؤثر اور دل نشیں صورت دینے کی عادت خود ایک مستقل رجحان کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ حسنِ بیان کے ان رجحانات کا سراغ لگانے کا عمل بڑا دل خوش کن اور روح پرور عمل ہے۔ یہ عمل میں مراثی النسیم کے ایک مرثیہ سے شروع کر رہا ہوں، مراثی النسیم کا دسواں مرثیہ "خلق میں بندۂ معبود نما ہیں احمدؐ" ۱۹۴۲ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس کا آغاز نعتِ رسولؐ سے ہوا ہے، لیکن نسیم نے مرثیہ میں جہاں گلدستۂ نعت کو فکر و خیال کے خوش رنگ اور خوش بو پھولوں سے سجایا ہے اس کی تزئین و ترتیب میں اظہار کی جدت آرائیوں سے بھی کام لیا ہے۔ مرثیے کے بندوں کی تقسیم کچھ اس طرح ہے کہ شروع کے سولہ بند نعتیہ ہیں جن میں قدم قدم پر گلہائے عقیدت نثار کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد خیال کا رُخ غمِ ملت کی طرف پھر جاتا ہے جسے مرثیہ میں "افسانۂ غم" کا نام دیا گیا ہے۔ غمِ ملت کے اس افسانے یا داستان کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ شاعر کی ذات اور اس کا دل افسانے کے دو کرداروں کی صورت میں ہم کلام ہوتے ہیں۔ اس ہم کلامی کا انداز یہ ہے:

کبھی ملت کا جو چھڑ جاتا ہے افسانۂ غم — دل مجھے دیتا ہے پہلو سے تسلی ہر دم
میں جو کہتا ہوں جماعت کی ہیں زلفیں برہم — دل یہ کہتا ہے سنور جائیں گی قرآں کی قسم

میں جو کہتا ہوں اماں کب ہے ان آفات کے بعد
دل یہ کہتا ہے کہ دن ہوتا ہے ہر رات کے بعد

——— گفتگو کا یہ سلسلہ سترھویں بند سے چھبیسویں بند تک جاری رہتا ہے اور اس طرح جاری

رہتا ہے کہ پڑھنے اور سننے والے کی خلشِ شوق بڑھتی رہتی ہے اور اگلے بند میں کوئی نئی بات سننے کی امید اسے آگے بڑھاتی رہتی ہے، یہاں تک کہ یکایک حسنِ ترتیب کا کرشمہ پڑھنے والے کو شوق کا ایک نیا راستہ دکھاتا ہے، شاعرانہ گریز اسے یکایک حسین دنیا میں لے جاتی ہے۔ سفرِ شوق کا یہ مرحلہ توسنِ تخیل کے لیے مہمیز بنتا ہے اور خیال ہی خیال میں مہر و انجم کی دنیا کی سیر شروع ہو جاتی ہے۔ اس سیر کے حال کا آغاز اس بند سے ہوتا ہے ؎

سیرِ نیرنگیٔ افلاک جو تھی مدِ نظر — رقص پر زہرہ و ناہید کی ماری ٹھوکر
نظرِ بد سے بھی مریخ و زحل کی بچ کر — بالا بالا مہ و انجم سے ہوا میرا گذر
دم بدم راہ تھی پُر پیچ تو دم لے کے پڑھا
یعنی ادریس و مسیحا کے قدم لے کے بڑھا

—— تپشِ دل بڑھتی رہی اور راہ کی مشکلیں آسانیٔ سفر کا باعث بنتی رہیں اور مسافرِ شوق اس منزل کی طرف بڑھتا رہا جو "ماورائے مہ و خورشید تھی"، "تمنائے ارم" نے "دل میں چٹکیاں" لیں اور ایک ایک قدم طاقتِ پرواز میں "شہپرِ روح الامین" بن گیا۔ "رنگِ اسرار" میں ڈوبے ہوئے "حیرت انگیز مناظر" سامنے آتے رہے اور بالآخر ایسا مرحلہ آیا جہاں "مکان و لامکاں" کے فاصلے مٹ گئے۔ یہی عالمِ تحیر طاری تھا کہ ناگہاں ایک صدائے غیب نے چونکا دیا۔ بیداری کے اس عالم میں ایک منظرِ عجیب سامنے آیا اور "نادِ علیؑ" کا وِرد مشکل کشائی کا باعث بنا، پھر ایک نظارۂ فرحت آثار سامنے تھا اور کوئی آواز یہ نویدِ جاں فزا سنا رہی تھی کہ یہ جنت ہے ؎

کوئی بولا یہی جنت ہے بصد جاہ و حشم — ابنِ آدم کے لیے ارثِ جنابِ آدم
جس کے دروازۂ عالی پہ یہ کلمہ تھا رقم — بے عمل کوئی درِ خلد پہ رکھے نہ قدم
اس مکاں میں کس و ناکس کی مدارات نہیں
حق پرستی کا صلہ ہے کوئی خیرات نہیں

—— سیرِ ارم کے ولولۂ شوق نے قدم آگے بڑھائے ہی تھے کسی نے للکار کر کہا کہ "تھم!"

تجھے جنّت میں داخلے کی اجازت نہیں، اس کے بعد ایک طویل مکالمہ شروع ہوتا ہے۔

ابتدائی بندوں میں مکالمے کی صورت یہ ہے ؎

بولا میں کون ہے یہ مانعِ ایوانِ ارم ! ۔۔۔ آئی آواز کہ "یہ میں ہوں نگہبانِ ارم"

مسکرا کر یہ کہا میں نے کہ "رضوانِ ارم! ۔۔۔ مجھ پہ ممنوع ہے کیوں سیرِ گلستانِ ارم

اہلِ جنت کو ہے ماضی کا تصوّر باقی

کیا ابھی ہے بنی آدم سے تنفّر باقی

میری اس طنز پہ رضواں نے صدا دی یہ ہمیں ۔۔۔ اہلِ جنّت کی کوئی تجھ میں علامت ہی نہیں

عرض کی میں نے کہ یہ شکلِ تقدس آئیں ۔۔۔ یہ مرا خرقۂ اسلام، یہ پیراہنِ دیں

داغِ سجدہ ہے عیاں جبہۂ نورانی پر

نقش ہے زہد و ورع کا مری پیشانی پر

میرے چہرے پہ نظر ڈال کے رضواں نے کہا ۔۔۔ بارک اللہ یہ پُر مکر لباسِ تقویٰ

سجدۂ زہدِ ریائی کا جبیں پر دھبّا ۔۔۔ ظاہری شکل و شباہت کی کشش کیا کہنا

روح بھی پاک ہے کیا جامۂ تقویٰ کی طرح!

دل بھی پُر نور ہے ریشِ رخِ زیبا کی طرح

——— انسان اور رضوان کا یہ مکالمہ ۱۵ ۔ ۱۶ بندوں میں پھیلا ہوا ہے اور ان بندوں میں مسلمانوں کے اخلاقی اور معاشرتی انحطاط پر بڑی تیز طنز ہے جو کہیں کہیں تو طعن و تشنیع بن گئی ہے۔ یہ سب بند اخلاقی مقصد کے اس رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں جسے نسیم نے اپنی مرثیہ نگاری کا نصب العین بنایا ہے۔ مرثیے کے اس حصّے میں جابجا جوابِ شکوہ کے مطالب اور لہجے کا عکس بھی نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر صرف ایک بند ملاحظہ کیجیے ؎

تم میں لیکن وہ ارادوں کی جوانی نہ رہی ۔۔۔ نام جس سے ہے سلف کا وہ نشانی نہ رہی

روحِ جرأت کی وہ ہنگامہ فشانی نہ رہی ۔۔۔ خون وہی ہے مگر اس خوں میں روانی نہ رہی

وہ بھی لڑتے تھے مگر حق کی حمایت کے لیے
تم بھی لڑتے ہو مگر جہل و حماقت کے لیے

—— یہ مکالمہ جس بند پر ختم ہوتا ہے اس میں ایک شعر یہ بھی ہے ۔ ؎

بولا رضوان کہ اے ہاشمی و مُطّلبی
فخرِ اسلاف ہے بے حسنِ عمل بے ادبی

—— شاعر اس طعنے پر پیچ و تاب کھاتا ہے لیکن مصلحت اسے نرمی پر مائل کرتی ہے اور وہ اس بات پر فخر ظاہر کرتا ہے کہ اسے اہلبیتؑ کی نسبت کا شرف حاصل ہے۔ شرف کے اس اظہار کے دوران شاعر اپنے مرتبۂ شاعرانہ کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے اور خصوصاً اس بات پر زور دیتا ہے کہ اس نے مرثیے کے ذریعے عزم و عمل کی راہ دکھائی، فخر و مباہات کا یہ سلسلہ جاری رہا اور بالآخر شاعر کو جنت الفردوس کے مناظر دیکھنے کی اجازت مل گئی۔ یوں اسے ان مناظر کی تصویر کشی کا موقع مل گیا اور اس نے جنت کے حسنِ دلفریب کی نثار خوانی کا عمل اس طرح شروع کیا ۔ ؎

اللہ اللہ وہ چمن زارِ ارم کا منظر — وہ تجلّی کہ نگاہوں کو نہ تھی تابِ نظر
وہ چھلکتی ہوئی پُر نور شرابِ کوثر — نخلِ طوبیٰ میں وہ حیدرؑ کی ولایت کے ثمر
فَادْخُلُوھَا کی بشارت جو صبا لاتی تھی
وَاشْرَبُوْا کی لبِ کوثر سے صدا آتی تھی

جام میں دیدۂ مخمور کا جلوہ دیکھا — ہر روش شاہدِ مستور کا جلوہ دیکھا
ہر شجر میں شجرِ طور کا جلوہ دیکھا — بھر گئے زخم جو انگور کا جلوہ دیکھا
ساز و ساماں تھے خدا ساز دل افروزی کے
سبز پودے علمِ سبز تھے فیروزی کے

چشمِ تصور نے جنت کے قصر و ایوان و سائبان کے، کیاریوں میں کھلے ہوئے گل ہائے بوقلموں کے کلیلیں کرتے ہوئے سرشار طیور کے، اور حورانِ بہشتی کے زلف و عارض کے

جو جلوے دیکھے انھیں شاعرانہ رنگیں بیانی نے محاکاتی مرقعوں کی صورت دی جن کی تخلیق و تزئین میں قصیدے کی ثنا خوانی کا عکس بھی ہے اور تغزل کی رومان انگیز کشش بھی، مرقع کشی میں تغزل کا رنگ کس طرح قصیدے کے شکوہ سے ہم آہنگ ہوتا ہے اس کی ایک مثال یہ بند ہے ؎

ان حسینوں کے وہ غرفوں سے اشاراتِ حسین   ماہ رو، عربدہ جو، غالیہ مو، زہرہ جبیں
پیکرِ حسن و نزاکت، نمکین و شیریں   ان کی تعریف ان الفاظ میں ممکن ہی نہیں
لاکھ مضمون تراشے کوئی مدحت کے لیے
استعارے ہیں سب اظہارِ حقیقت کے لیے

—— اور تغزل سراپا کے بیان میں رومانی وارفتگی کا کیا لہجہ اختیار کرتا ہے اس کا اندازہ ان دو بندوں کے مطالعے سے کیجیے ؎

الفتِ آلِ محمد کا ہے ذوق اتنا عام   کوئی لیتا ہوا گذرا جو یداللہ کا نام
گل نے صلوٰۃ پڑھی، شاخ جھکی بہرِ سلام   ہو گئے اک نگہِ مہر سے غلمان غلام
حور شرما کے پکاری کہ میں قربان گئی
جانے والے اِدھر آ، جان چلی، جان گئی

وہ لبِ حور کہ غنچوں کی نزاکت صدقے   زلف و عارض پہ شب و روز کی طاعت صدقے
صفِ مژگاں پہ فرشتوں کی جماعت صدقے   وہ قیامت قد و قامت کہ اقامت صدقے
یہ ادا صورتِ دل کش کی غضب ڈھاتی ہے
جیسی ہم چاہتے ہیں ویسی ہی بن جاتی ہے

جنت کی تصویر کشی کے منظر سے مصائب کے بیان کی طرف گریز کرتے ہوئے شاعر نے لکھا ہے کہ خواب کے عالم میں جب اس نے رضوان کو یہ کہتے سنا کہ ؎

عالمِ خواب میں فردوس کی تصویر ہے یہ
کام لے دیدۂ بیدار سے تعبیر ہے یہ

تو طلسمِ غفلت ٹوٹا، اس حالت میں اس کے دل کی جو حالت ہوئی اس کا اظہار اس بند میں ہوا ہے ؎

یہ سخن سُن کے جو ٹوٹا وہ طلسمِ غفلت
کیا بتاؤں جو ہوئی قلبِ حزیں کی حالت
آنکھیں مل کر جو نظر کی یہ نگاہِ حسرت
نہ وہ جنت ہے نہ رضوان نہ صحبت و محبت

کش مکش ہے نہ کشاکش میں سفینہ باقی
غیرتِ بے عملی کا ہے پسینہ باقی

یہ بند مرثیہ کا ۹۲ واں بند ہے۔ اس کے بعد کے ۸ بندوں میں مصائب ہیں۔ ۹۲ بندوں میں سے نعت کے ۱۶ بند نکال دیے جائیں تو ۷۶ بند باقی رہتے ہیں، سو وہ ان جدت آرائیوں کے لیے وقف ہیں جن کی طرف میں نے مرثیے کے تعارف میں اشارہ کیا تھا اور جن کی تفصیل پچھلے چند صفحات میں بیان ہوئی ہے۔ اس تفصیل میں دو چیزوں کا ذکر آیا ہے، ایک شاعر اور رضوان کے مکالمے کا اور دوسرے جنت کے مناظر کی تصویر کشی کا۔ ان دو چیزوں میں سے دوسری کو میں نسیم کی مرثیہ نگاری کے اُس رجحان کا عکس سمجھتا ہوں جس کے تحت انھوں نے مرثیے میں نئے مضامین داخل کیے اور اس کے موضوعات کے دامن کو وسعت دی، پہلی چیز یعنی دو افراد کے درمیان ایک خیالی مکالمہ ان کے اُس رجحان کی ایک دلکش صورت ہے جس کے زیرِ اثر خیال اظہار و ابلاغ کے نئے نئے پیرایے اختیار کرتا ہے۔ مرثیے میں شاعر اور رضوان کا مکالمہ جس انداز سے شروع ہوا ہے اور اسے شروع کرنے سے جو فضا بنائی گئی ہے وہ حقیقت میں افسانے اور داستان کی فضا ہے کہ جس کی کشش سے افسانہ نگار یا داستان گو قاری کی توجہ کو اسیر کرنا چاہتا ہے، قاری کو اپنی طرف متوجہ کر کے افسانہ کہنے والے کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس شوق اور اشتیاق کے ساتھ قاری اس فضا کی طرف متوجہ ہوا ہے نہ صرف یہ کہ وہ قائم رہے بلکہ اس میں برابر اضافہ ہوتا ہے۔ یہی صورت اس مرثیے میں شاعر اور رضوان کے مکالمے کی ہے جو مرثیے میں آنے والے روایتی مکالموں سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں

ایک واضح اور بیّن افسانوی رنگ ہے، مکالموں کے ذریعے مرثیوں میں افسانوی رنگ کا داخل کرنا نسیم کا ایک اور فنی اجتہاد ہے، جو آگے چل کر ان کے مرثیوں میں نئی نئی صورتیں اختیار کرتا رہا، اس فنی رجحان کی نشاندہی اور وضاحت کے لیے نسیم کے تین مرثیے پیشِ نظر ہیں، ان تین مرثیوں کے پہلے مصرعے یہ ہیں :-

(۱) عہدِ رفتہ کی طرح گو منتشر اب ہم نہیں

(۲) ذرّہ ہوں آفتاب سے گرمِ سخن ہوں میں

(۳) بفطرتِ ازلی بے غبار ہے پانی

یہ تینوں مرثیے نسیم کی مرثیہ گوئی کے آخری دَور کے مرثیے ہیں اور ۱۹۶۸ء اور ۱۹۷۱ء کے درمیان لکھے گئے، پہلے مرثیے میں چاند کی زبان سے، دوسرے میں سورج کی زبانی اور تیسرے میں یہ باتیں ملے جلے بیانیہ اور افسانوی انداز میں کہی گئی ہیں اور اس طرح یہ تینوں مرثیے ان جملہ مقاصد کے ترجمان بن گئے ہیں جن کا تعلق شاعر کے عقیدے، اس کے فلسفۂ حیات اور فنی نقطۂ نظر سے ہے۔

پہلے مرثیے میں کل ۵۰ بند ہیں۔ شروع سے آخر تک مربوط اور مسلسل اور فنی ترتیب و تنظیم کے اعتبار سے مکمل، اس مرثیے کے خاص موضوعات تین ہیں۔ قوم کے ماضی کے حوالے سے اس کے حال اور مستقبل پر پُر امید تبصرہ اور اصلاحی پیغام کی وضاحت، واقعاتِ کربلا، کی اہمیت کا بیان اور اس سلسلے میں شہدائے کربلا کی سیرت و شخصیت اور اوصاف و فضائل کی طرف سبق آموز اور رقت آور اشارے، اور گریہ اور اس کے مقاصد کی جذباتی و فکری توجیہہ۔ ابتدائی دس گیارہ بندوں میں قوم کی موجودہ حالت کی نقشہ کشی کا انداز یہ ہے کہ مسلمانوں کی اب سے چند برس پہلے کی حالت کو پیشِ نظر رکھ کر یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی حالت اب پہلے سے بہتر ہے لیکن اب بھی ان میں بہت سی خامیاں ہیں اور ان خامیوں کو دور کرنے کیلئے توجہ ضروری ہے کہ حال کی اصلاح ہی مستقبل کی ترقی کا پیش خیمہ بنے گی، یہ ساری بات بڑے

اختصار اور سادگی کے ساتھ نہایت واضح اور غیر مبہم انداز میں کہی گئی ہے۔ ؎

عہدِ رفتہ کی طرح گو منتشر اب ہم نہیں — پھر بھی رفتارِ عمل مربوط و مستحکم نہیں
خیر جو کچھ کھو چکے، کھو ہی چکے، کچھ غم نہیں — ہو گیا تنظیم کا سودا، یہ قیمت کم نہیں

ذکرِ ماضی برطرف فی الحال کرنا چاہیے
بڑھ کے مستقبل کا استقبال کرنا چاہیے

اصلاحِ احوال کی اس شاعرانہ کوشش میں شاعر نے اپنے لہجے کو حدِ اعتدال میں رکھا ہے اور جذبات کو کہیں تعقل و تفکر کی حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا اور اگلے بندوں میں مختلف اسالیب میں انھیں اوصاف کی طرف توجہ دلائی ہے جو انسان کو آگے بڑھنے اور انقلاب کی رو کے ساتھ قدم بہ قدم چلنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان اشعار میں بات کا لہجہ کہیں نرم ہے اور کہیں گرم، کہیں دھیما اور کہیں جوشیلا اور حسبِ ضرورت کہیں خطیبانہ ہے اور کہیں شاعرانہ۔ مثلاً اگلے دس بندوں میں اس طرح کے شعر اور مصرعے بار بار آئے ہیں ؎

کر رہے ہیں روحِ ملت سے عمل کا احتساب — فکر و دانش کے فرشتے بے حساب و بے کتاب
چہرۂ آیاتِ قدرت سے الٹتے ہیں نقاب — عزمِ محکم، سعیِ پیہم، آزمائش، انقلاب

منزلِ جہد و طلب میں تھا جو کچھ کچھ مضمحل — اب دھڑکتا ہے نئے احساسِ قوت سے وہ دل

ہو رہا ہے امتحانِ جرأت و عزم و ثبات — مل رہی ہے تا بکے جستجو غم سے نجات

کروٹیں لیتی ہے ذہنوں میں ترقی کی امنگ — منزلِ تقدیر میں تدبیر کا جمتا ہے رنگ

ع قوم کے جذبات دب سکتے ہیں، مر سکتے نہیں

قوم کے کردار کی نقشہ کشی کے وقت واقعۂ کربلا کے عوامل، مقاصد اور نتائج کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے

ع قوم بھی وہ قوم جو تیغوں کے سائے میں پلی

ے زندگی جس کی شجاعت، جس کا عنواں کربلا
تن مدینہ، سر نجف، دل سامرہ، جاں کربلا

ع جس کی شمعِ راہِ منزل اسوۂ شبیرؑ ہے

——— اور جہاں کہیں جوشِ عقیدت نے شعر میں قصیدے کا آہنگ پیدا کر دیا ہے وہاں بات اس طرح کی گئی ہے ے

مرکزِ عرفانِ حق ہے جس کا ذوقِ جستجو جس کے ماتھے کا پسینہ ہمسرِ آبِ وضو
ہر قدم پر جس کا رہبر ان شہیدوں کا لہو رن میں جو مردانِ میدانِ عمل تھے سرخرو

مر مٹے جو زندہ دل انسانیت کے نام پر
خون کی جن کے ہیں مہریں دفترِ اسلام پر

اس کے بعد کے بندوں میں شہدائے کربلا اور ختم المرسلینؐ کے فضائل و اوصاف کے حوالے سے شاعر نے اپنے عہد کے سیاسی مسائل کی طرف گہرے معنوی اشارے کیے ہیں اور قومی عظمت اور "گردوں نشینی" کو رسولِ مقبول آنحضرتؐ کی نسبت کا صدقہ بتا کر، انسان کی خلانوردی اور فضا پیمائی کے ذکر کے ساتھ چاند سے گفتگو کا موقع نکالا ہے۔ پہلے چاند شاعر سے مخاطب ہو کر اسے کچھ نصیحتیں کرتا ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ اس کا رشتہ رسولؐ، علیؑ اور اہلبیتؑ سے ہے کہتا ہے کہ ے

ہیں انھیں جلووں کے سائے آدمی کے خضرِ راہ جن کی بیدار عمل راتوں کا میں عینی گواہ

اور پھر چاند کی یہ شہادت عینی تاریخ کے اوراق الٹتی اور داعیانِ اسلام کے افعال و اعمال کے نقش کو ابھارتی ہوئی واقعاتِ کربلا کی راوی بنتی ہے، اسی شہادت کے دوران چاند کی زبان سے گریے کے فلسفے پر بصیرت افروز باتیں کہلوائی گئی ہیں، انھیں باتوں کے درمیان ایسے شعر بھی آتے ہیں ؎

میں ہوں شاہد اور اجرامِ سماوی سب گواہ　　　گریۂ حُبِّ ملت سے کتنے ہی اٹھے اہلِ نگاہ
فلسفی، شاعر، مورخ، اہلِ دل، اہلِ سپاہ　　　فاتحِ عالم، مصنف، موجدِ فن، باج خواہ
خود بھی ابھرے، کفر کی کشتی ڈبوتے بھی رہے
اور یہ سب مظلوم کی مجلس میں روتے بھی رہے

مرثیے کے آخر تک چاند یوں ہی مصروفِ کلام رہتا ہے اور کربلا میں ہونے والے ولولہ خیز اور دردانگیز واقعات کے رخ سے پردے اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ واقعات اور حقائق کی تفصیلات یہی ہیں جو اس سے پہلے بھی مرثیوں میں بیان ہوتی رہی ہیں، لیکن یہاں اسلوبِ اظہار کی ایک جدت اور ندرت نے سننے والے کے لیے افسانے کی کیفیت پیدا کر دی ہے اور اس نے پہلے کی سنی اور پڑھی ہوئی باتوں کو اس طرح سنا ہے جیسے وہ خود اس کی نظر کے سامنے ہیں اور وہ ان سے براہِ راست تاثر قبول کر رہا ہے۔

اس سلسلے کا دوسرا مرثیہ "ذرّہ ہوں آفتاب سے گرمِ سخن ہوں میں" قصیدے کی آن بان اور طمطراق سے شروع ہوتا ہے اور شاعر بوتراب اور خاندانِ بوتراب کی روحانی نسبت اور مداحیِ اہلبیتؑ کے شرف کے رشتے کی بنا پر فخریہ لہجے میں اپنی شاعرانہ عظمت و وقار کا اعلان کرتا ہے۔ اپنی عظمت و بزرگی و شرف کے اس اعلان میں اس کا تخاطب آفتاب سے ہے ؎

ذرّہ ہوں آفتاب سے گرمِ سخن ہوں میں　　　خاکی نژاد اور فلک انجمن ہوں میں
خورشیدِ آسمانِ ولا کی کرن ہوں میں　　　اے شمس دیکھ، خاکِ درِ پنجتنؑ ہوں میں
صد شکر، لبتۂ کششِ بوتراب ہوں
جو رد نہ ہو کسی سے میں وہ آفتاب ہوں

آفاق میں ہے خطِ شعاعی مرا قلم | جس سے ظہورِ صبحِ سعادت ہے دم بدم
میرا علوے فکر و تخیّل، فلک حشم | تارے بکھیرتا ہوں ورق پر دمِ رقم

یہ ضو فشاں رسولؐ کے پیاروں کی بزم ہے
میری بیاض چاند ستاروں کی بزم ہے

اگلے بندوں میں اپنے شرفِ ذاتی کا یہ احساس بلند سے بلند تر ہوتا ہے اور پرشکوہ لفظوں اور چست ترکیبوں کی موزوں صف آرائی سے بیان کا زور بڑھتا رہتا ہے۔ اسی زورِ کلام میں شاعر یہ دعویٰ کرتا ہے ؎

میں دعبل و فرزدق و حسان کی طرح
مدّاحِ اہلبیتؑ ہوں قرآن کی طرح

— یہاں تک کہ تکبیرِ ذات کا احساس تخاطب کی یہ صورت اختیار کر لیتا ہے ؎

تو اوجِ فکر میں، نہ عروجِ نظر میں ہے
بجھتا سا اک چراغ مری رہ گذر میں ہے

سورج، شاعر کی باتوں سے بہت متاثر ہوتا ہے اور اس کی بنائے افتخار کو تسلیم کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ جس کی نسبت سے تیرے وجود کو شرف ملا ہے اسی کی ضیا سے میرا وجود بھی منور ہے اور اس لحاظ سے مجھ میں اور تجھ میں کوئی فرق نہیں، لیکن ایک بات ہے جو تیرے مقابلے میں میرے لیے باعثِ امتیاز بنی ہے، وہ بات یہ ہے کہ تو نے جن واقعاتِ کربلا کی مصوری کی ہے وہ تجھ تک روایتہً پہنچے ہیں، اس کے مقابلے میں میرے علم کی بنیاد ذاتی مشاہدہ ہے ؎

تو واقعہ نگارِ امامِ شہید ہے
تیری شنید، میرے لیے چشم دید ہے

— اس کے بعد سورج واقعاتِ کربلا کا حال بیان کرتا ہے اور اپنے بیان کا آغاز واقعۂ کربلا کے اسباب و محرکات کے ذکر سے کرتا ہے، اس ذکر میں تاریخی واقعات اور مستند روایات کے حوالے

بھی آتے ہیں، ان تمہیدی بندوں کے بعد واقعاتِ کربلا کا حال شروع ہو جاتا ہے، اور سورج کہتا ہے کہ جب میں بامِ افق پر ضوفشاں ہوا تو میں نے نمازیوں کے رخوں پر تجلیاں پھیلی ہوئی دیکھیں، جوانانِ شیر دل صف بستہ و سربکف نظر آئے، ایسے شیر دل کہ ان میں سے ہر ایک بیداری، خلوص اور متانت، وفا شعاری اور دلیری میں یکتائے روزگار تھا۔ فضیلتوں کے بیان میں یہاں بھی ایجاز و اختصار کی کارفرمائی ہے اور یہاں بھی مدحت سرائی کا وہی مہتم بالشان لہجہ ہے جس نے نسیم کے مرثیوں کو قصیدوں کا ہمسر و ہم پلّہ بنایا ہے۔ ایک بند میں یہ اوصاف اس طرح یکجا کیے گئے ہیں۔ ؎

چیدہ وہ حق شناس و حق آگاہ و حق گزار ذی علم و ذی فضیلت و ذی جاہ و ذی وقار
جاں باز، سرفروش، عمل کوش، جاں نثار باعزم، باشعور، جواں مرد، مردِ کار
تصویر تھے جلالتِ بدر و حنین کی
انساں کے بھیس میں تھی شجاعت حسین کی

اگلے بندوں میں بھی ذکرِ فضائل کا یہ سلسلہ اسی روانی اور قوّتِ کلام کے ساتھ جاری رہتا ہے اور "پیرانِ خم کمر" کے شوکت و احتشام اور جوانانِ جانباز و سرفروش کی جرأت و شجاعت کو موضوعِ سخن بنایا جاتا ہے۔ میدانِ جنگ کے معرکوں کی چشم دید اور دل ہلا دینے والی تفصیلات بیان کی جاتی ہیں، مرثیہ غم کے آہنگ پر ختم ہوتا ہے اور اسلوب کی جدّت پڑھنے والے پر وہی کیفیت طاری کرتی ہے جو کوئی حزن انجام کہانی کو پڑھ کر طاری ہوتی ہے، واقعات کا بیان چونکہ سورج کی زبان سے ہوا ہے اس لیے شاعر بیچ بیچ میں ایسے ٹکڑے لگاتا گیا ہے کہ راوی کی حیثیت نمایاں ہوتی رہے۔ مثلاً سورج کے مخصوص اوصاف کی مناسبت سے ایک جگہ اس کی زبان سے کہلوایا گیا ہے ؎

آندھی اٹھی سیاہ، مجھے لگ گیا گہن

ایک بند میں جنگ کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے۔ ؎

بعد اس کے امتحان کا وہ آگیا مقام — روتا ہوں خون یاد میں جس کی میں صبح و شام
تنہا تھا قتل گاہ میں حیدرؑ کا لالہ فام — اب میری انتہائے تمازت تھی اور امام

گرمی تھی اپنے نقطۂ اوجِ کمال پر
میں چترِ زر لگائے تھا زہراؑ کے لال پر

جنت میں رضوان سے مکالمے کے علاوہ چاند اور سورج کی گفتگو کی اساس پر لکھے جاتے والے مرثیوں میں جو افسانوی کیفیت اور اس افسانوی کیفیت سے پیدا ہونے والی جو مخصوص کشش ہے اس سے قطعِ نظر مرثیوں کے مختلف حصوں میں جو مضمون آفرینی ہے اور ان مضامین کو نئے انداز سے بیان کرنے کی جو کوشش ہے اس سے ان مرثیوں کے ادبی اور شاعرانہ حسن اور مجموعی دل آویزی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ مضمون آفرینی سے پیدا ہونے والی اس شاعرانہ کشش اور دل آویزی کا ایک اور نمونہ وہ مرثیہ ہے جس کا پہلا مصرعہ ہے۔ ع

بفطرتِ ازلی بے غبار ہے پانی

—— اس مرثیے میں مکالمے کی بجائے مضمون آفرینی کی جدت اور قوت سے جو کیفیت پیدا کی گئی ہے اس میں بھی اجتہادِ فن کی شان نمایاں ہے۔ ۸۰ بند کے اس مرثیے کے پچاس بندوں میں پانی کے متعلق جتنی باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے کچھ ایسی ہیں جن کا تعلق خالص سائنسی مشاہدات، تجربات اور نظریات سے ہے اور کچھ ایسی ہیں جو علم، مشاہدۂ انسانی سے تعلق رکھتی ہیں، ان دونوں طرح کی معلومات کو یکجا کر کے شاعر نے گوناگوں تلازمات قائم کیے، اور مضمون کی خلاقی اور جدتِ ادا کے جوہر دکھائے ہیں، اور اس سارے عمل میں زبان اور محاورے کی نزاکتوں سے اس کی گہری شناسائی اور ان کے صرف پر اس کی قدرت اس کی ہم عناں رہی ہے۔ مرثیہ شروع اس طرح ہوتا ہے ؎

بفطرتِ ازلی بے غبار ہے پانی — جمالِ قدس کا آئینہ دار ہے پانی
فضا میں خالقِ ابرِ بہار ہے پانی — زمیں پہ رحمتِ پروردگار ہے پانی

نگاہِ خلق سے غائب جو ہے فضاؤں میں
امامِ غیب کا بھرتا ہے دم ہواؤں میں

تمام خلق کا خدمت گزار ہے پانی — رگوں میں خون، بدن میں پکھا ہے پانی
گلوں میں حسن، چمن میں بہا ہے پانی — نمو کی بزم میں، پروردگار ہے پانی
یہ آب و رنگ، یہ سب تگ و تُو ہے پانی سے
عروسِ خاک! تری آبرو ہے پانی سے

——— پہلے بند کے تیسرے شعر کے حسنِ تعلیل سے قطعِ نظر دونوں بندوں میں سائنسی مشاہدات کو شاعری کی زبان ملی ہے۔ چھٹے بند سے پانی اور لغت کے تعلق کا ذکر شروع ہوتا ہے، ؎

عجیب چیز زبانِ لغت میں پانی ہے — کہ جس کے ذکر میں آمد ہے اور روانی ہے
قلم بھی وقتِ رقم محوِ درفشانی ہے — یہ ایک لفظ اور اک قلزمِ معانی ہے
چڑھے جو بامِ فلک پر سحاب ہو جائے
جو کھینچ لیں تو عرق ہو، شراب ہو جائے

——— اگلے کئی بندوں میں پانی اور پانی کے مترادفات سے پیدا ہونے والے محاورات کے شاعرانہ تلازمات کی صف بندی ہے اور ایک کے بعد دوسرا بند روانیٔ دریا کا سماں دکھاتا چلا گیا ہے، پھر ایک بند میں اس کے بہت سے اوصاف کو یکجا کر کے اس میں سے ایک اصلاحی نکتہ پیدا کیا گیا ہے ؎

سبک، مُفرّحِ دل، جاں فزا، روح نواز — لطیف و خوش مزہ و خوش گوار و نرم و گداز
کبھی یہ خاک نشیں اور کبھی فلک پرواز — قدم قدم پہ ہے دیکھے ہوئے نشیب و فراز
زمیں سے اٹھ کے جو گردوں کی راہ لیتا ہے
یہ ارتقا کا زمانے کو درس دیتا ہے

اس کے بعد پھر علمی نقطۂ نظر ابھرتا ہے اور بڑے آسان لفظوں میں بعض علمی مشاہدات

یوں بیان کیے جاتے ہیں ؎

یہ کائنات حقیقت میں ہے دُخان و شرر — اسی دُخان و شرر سے بنے ہیں شمس و قمر
زمیں بھی پارۂ آتش تھی ابتدا میں مگر — یہ آگ راکھ بنی مدتوں میں بجھ بجھ کر

تلا بہ امرِ مشیّت جو لاگ پر پانی
سحابِ فضل نے چھڑکا اس آگ پر پانی

؎ علم اور مشاہدے کی بنا پر قائم کیا ہوا معنی آفرینی کا یہ سلسلہ پچاس بندوں تک بے روک ٹوک سیلِ رواں کی طرح جاری رہتا ہے اور اس روانی سفر میں شاعری کے رنگ میں ڈوبے ہوئے شعر اور مصرعے فضا کو حسن اور تصورات کو یقین کی دولت سے مالامال کرتے چلے جاتے ہیں ؎

کبھی افق کی تراوٹ، کبھی ہے رنگِ شفق
کبھی شراب، کبھی شیخ کی جبیں کا عرق

شفق کے رنگ سے تازہ یہ گل کھلاتا ہے
کہ آسماں کو حنائی زمیں بناتا ہے

جو موج میں ہے تو گویا چُنا ہوا جامہ — حباب میں ہے تو آبِ رواں کا عمامہ
قلم میں ہے تو نویدِ نگارشِ نامہ — دوات میں ہے تو سجدہ گزارِ ہر خامہ

رُکا رہے تو مزاجِ خسیس ہے پانی
رواں ہو جب تو زبانِ انیس ہے پانی

یہ پچاس بندوں کے بعد بھی پانی کے خواص کا ذکر ہوتا رہتا ہے، لیکن ہر بند کے آخر میں ایک ہلکا سا اشارہ واقعاتِ کربلا کی طرف ہے، بالآخر یہ ہلکے اشارے مصائب کے بیان کی مسلسل

روداد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ان بندوں میں شاعرانہ واقعہ نگاری کے جملہ تقاضے پورے کیے جاتے ہیں، مرثیہ بالآخر غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے ان بندوں پر ختم ہوتا ہے ؎

غضب کی جا ہے کہ یہ کلفتیں اٹھائے حسینؑ　　علیؑ کی تیغ سے خود اک لحد بنائے حسینؑ
اتارے قبر میں بیٹے کو باپ، ہائے حسینؑ　　بجز رضا بقضا کچھ نہ لب پہ لائے حسینؑ
نہ تھا چھڑکنے کو پانی پسر کی تربت پر
چڑھائے آنسوؤں کے پھول ننھی تربت پر

خیالِ آب جو تھا یاد آگئے بھائی　　نگاہِ یاس ترائی سے جا کے ٹکرائی
زمیں لرز گئی، غازی کی لاش تھرائی　　تڑپ کے غیرتِ انسانیت یہ چلائی
ارے فرات کے کم ظرف و بد گہر پانی
نہ مل سکا علی اصغرؑ کو ڈوب مر پانی

شاعر نے بات "پانی" کے بیان سے شروع کی تھی اور اسی کے بیان پر ختم کی کہ مرثیے میں پیش کیے ہوئے سارے تصورات پھر ایک نقطہ پر آکر مرتکز ہو جائیں اور بکھرے ہوئے تاثرات ایک واحد تاثر کی صورت اختیار کر لیں۔

نسیم نے ۱۹۲۳ء اور ۱۹۷۱ء کی ۴۸ سالہ مدت میں جتنے مرثیے لکھے ان کے تجزیے، تبصرے اور تحسین کے ضمن میں ان مراثی کی اہم فکری اور فنی خصوصیات اور مرثیہ نگار کے بعض مخصوص فکری و فنی رجحانات کی طرف کہیں اجمالی اور کہیں تفصیلی اشارے کیے گئے، اس تبصرے اور تحسین میں جو باتیں کہی گئیں ان کا خلاصہ بیان کیا جائے تو یہ ہوگا کہ نسیم نے مرثیے کی روایت میں جو انھیں کچھ تو بزرگانِ خاندان کے فیضِ تربیت سے اور زیادہ مراثیِ انیس کے دقیق مطالعے سے ورثے میں ملی، اپنے فکری اور فنی اجتہاد سے بعض تبدیلیاں پیدا کیں اور بعض اضافے کیے، اضافوں کی فہرست میں نمایاں طور پر جو چیزیں شامل ہیں ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ انھوں نے مرثیے کو اساسی طور پر تربیتِ اخلاق اور اصلاحِ معاشرت کا ذریعہ بنایا اور اپنے عہد

کے قومی مسائل کو، جن میں سیاست اور معیشت کے مسائل کے علاوہ شخصی اور اجتماعی اخلاق کے مسائل بھی شامل ہیں، اپنے مرثیوں کا موضوع بنایا اور مرثیوں میں کہیں مجملاً اور کہیں بالتفصیل ان مسائل پر تواتر اور تسلسل کے ساتھ شاعرانہ انداز میں اظہارِ خیال کرتے رہے۔ دوسری بات جس کا عکس انیس کے مرثیوں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے یہ ہے کہ نسیم نے اصلاحی نکات کی وضاحت کے لیے برابر تاریخ کی شہادت کو اپنے نقطۂ نظر کے استدلال کا ذریعہ بنایا اور یوں واقعۂ کربلا محض تاریخِ اسلام کا ایک اہم واقعہ ہونے کی بجائے عالمی انقلاب کی تاریخ کا ایک واقعہ بنا۔ ایک اور بات جو پچھلے مرثیہ گویوں کے یہاں صرف کہیں کہیں نظر آتی ہے اور جسے انیس نے اکثر و بیشتر اپنے مراثی کی اساس بنایا ہے سید الشہداءؑ اور اہلبیتؑ کے فضائل و اوصاف کی مدّاحی و ثناخوانی ہے۔ اس بات کو بھی مراثیِ نسیم میں ایک مستقل رجحان کی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے حلقۂ مدّاحی کو وسیع تر کیا بلکہ مدح کو محض حصولِ ثواب کا وسیلہ بنانے کی بجائے اسے انسان کی ذہنی، اخلاقی اور روحانی تربیت کا وسیلہ بنایا۔ انیس کے یہاں بھی مدّاحی ہے لیکن انیس اور نسیم کی مدّاحی میں بڑا فرق یہ ہے کہ یہاں مدح محض جذبات کی نہیں بلکہ جذبے اور تعقل کے ملے جلے عمل کی پابند ہے اور اس کا رشتہ ہر صورت میں شخصی اور اجتماعی اصلاح سے منسلک ہے۔ مدّاحی کے اس رجحان سے پیدا ہونے والا ایک اور رجحان جس کا اظہار نسیم کے مرثیوں میں قدم قدم پر ہوتا ہے یہ ہے کہ وہ اوصاف و فضائل کے بیان میں اور تاریخی واقعات سے استنباط کرتے ہوئے بھی ہمیشہ قرآن اور حدیث کی شہادت سے تقویت حاصل کرتے ہیں۔ قرآن حکیم اور حدیثِ اقدس کو منطق اور استدلال سے تقویت دینے کے اس رجحان سے نسیم کے مراثی کی علمی سطح بلند ہوئی ہے۔ مرثیے کے مزاج میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی ہے اور ہمارے عہد کا مرثیہ جسے ہم جدید مرثیہ کہتے ہیں آہستہ آہستہ ایک وقیع علمی صنف بن رہا ہے۔

نسیم نے اپنے اصلاحی، مقصدی اور علمی رجحانات کو اپنے مراثی میں مستقل مقام دیتے وقت

یوں تو اسی روایت فن کی پابندی کی ہے جس کے آخری مظہر بہت سی حیثیتوں سے میر انیس ہیں، لیکن انیس کی فنی روایت کو مقتدا بنانے کے باوجود[1] نسیم نے موقع، محل اور موضوع کے اعتبار سے اسالیبِ اظہار میں تبدیلیاں بھی کیں اور ان میں بھی بعض نئی راہیں نکالیں[2]۔ ان نئی راہوں کا ذکر بعض مرثیوں کے تجزیے کے سلسلے میں آ رہا ہے اور اس ضمن میں خصوصیت سے ان کے مکالماتی اظہار اور اس اظہار کے افسانوی تاثر کا ذکر تفصیل سے ہو چکا ہے۔

ایک بات جس کا ذکر نسیم کے مرثیوں کی ساخت کے سلسلے میں اب تک نہیں آیا یہ ہے کہ انھوں نے مرثیے کی اس ہیئت کو جس کا آغاز ضمیر کے مرثیوں سے ہوا، اس کی ہیئت کا لازمی جزو سمجھتے ہوئے بھی سختی سے اس کی پابندی نہیں کی۔ ضمیر کے بنائے ہوئے سانچے کے مطابق اس کی روایتی صورت یوں متعین ہوتی ہے کہ ابتدا "چہرے" سے ہوتی ہے جو گویا مرثیے کی تمہید یا (تشبیب) ہے۔ اس کے بعد سراپا، رخصت، رجز، رزم اور اس ضمن میں گھوڑے اور تلوار کی تعریف، پھر شہادت اور بین۔ نسیم نے مرثیے کی ہیئت کے ان اجزا کو اس کے مسلمات سمجھتے ہوئے

---

[1] اسی بات کا اظہار مراثیِ نسیم میں بار بار ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ فرمایئے، مراثیِ نسیم جلد اول کے مرثیے "خلق میں بندۂ معبود نما ہیں احمدؐ" کے بند نمبر ۶۸ و ۶۹ ؎

میرے شعروں سے ہوئی حق کی حمایت سو بار | چل گئی ہے مرے مصرعوں سے عدو پر تلوار
خندق و بدر و احد پر جو کہے ہیں اشعار | پھول ہیں مدحِ شجاعت کے جو باغی کو ہیں خار

حالِ خیبر صفِ اعدا میں بہ تفصیل پڑھا
اڑ گئے رنگ جو ذکرِ پرِ جبریل پڑھا

اس قدر کیوں نہ مؤثر ہو مری نظمِ سلیس | فیضِ جبریل مرے ذہنِ رسا کا ہے جلیس
میرا استاد دمِ فکرِ سخن، طرزِ انیس | وہ انیس ایک جو تھا خالقِ ہر رنگِ نفیس

ہر گِ گل میں ہوں، وہ اک نخلِ برومندِ سخن
خسروِ مملکتِ نظم، خدا وندِ سخن

[2] یہ بات بھی نسیم نے مذکورہ مرثیے کے بند نمبر ۷ میں اس طرح کہی ہے۔ ؎

راہ ڈھونڈی جو نئی میں نے کوئی حسبِ محل | ہر قدم اس کے مراثی نے دکھائی مشعل
عقدۂ فکر و نظر، مسئلۂ عزم و عمل | بادۂ مرثیہ گوئی میں کیا میں نے حل

بھی اپنے مراثی کی ترتیب و تنظیم میں سختی سے ان کی پابندی کبھی نہیں کی "سراپا" کو انھوں نے اپنے مرثیوں میں وہ مقام دیا جو قصیدے میں مدح کے حصّے کو حاصل ہے۔ "سراپا" ان کے مراثی میں اکثر و بیشتر فضائل و اوصاف کی تفصیلات کے بیان اور ان تفصیلات سے اخلاقی اور اصلاحی نکات اخذ کرنے کا منصب ادا کرتا ہے۔ رخصت، شہادت اور بین کے حصّوں میں غم انگیز مضامین کے بیان کا مقصد محض یہ نہیں کہ وہ رقت، گریہ اور آہ و بکا یا حصولِ ثواب کا وسیلہ بنیں، اگر یہ نسیم کے نزدیک گداز کا اور گداز عزم و عمل کی قوتوں کا محرّک بنتا ہے، رزم کے مضامین اور گھوڑے اور تلوار کی تعریف کے مضامین کو عموماً ان کے مراثی میں بہت کم جگہ ملی ہے۔

لیکن نسیم کو مرثیے میں ان عناصر کی اہمیت کا پورا اندازہ ہے اس لیے انھوں نے اپنے عام مرثیوں کی اس کمی کی تلافی کرنے کے احساس کے تحت بعض ایسے مرثیے لکھے جو اپنے مضامین اور مجموعی مزاج کے اعتبار سے رزمیہ مرثیے ہیں۔ ان مرثیوں کی ترتیب و تنظیم، ان کے اسلوبِ اظہار اور اس اظہار کے حیلۂ شاعرانہ اور فنی وسائل کے استعمال میں انھوں نے اپنے استادِ معنوی انیس کی روش اختیار کی ہے، البتہ مضمون آفرینی اور جدتِ ادا میں جگہ جگہ اپنی خلاقی اور مشاقی کے جوہر دکھائے ہیں۔ یوں تو نسیم نے کئی ایسے مرثیے لکھے جو اس فنی معیار کی رو سے جو ہم نے اپنی فنی روایت میں رزمیہ مرثیوں کے لیے مقرر کیے ہیں، خالصتہً رزمیہ مرثیے ہیں، لیکن اس جگہ خصوصیت سے ایک رزمیہ مرثیے کا تعارف کرانا چاہتا ہوں جو نسیم نے انیس کی صد سالہ برسی کی تقریبات کے موقع پر ۱۹۷۳ء میں کہا تھا۔ یہ مرثیہ جہاں ایک طرف نسیم کی جانب سے انیس کی خدمت میں ایک طرح کا نذرانۂ عقیدت ہے، دوسری طرف نسیم کی مرثیہ گوئی کے ادبی اور شاعرانہ محاسن کا ایک حسین مظہر اور مرقع بھی ہے، "مرثیہ پیامِ انس ہے انساں کو داستاں نہیں" میں نسیم نے مرثیہ گوئی کی تاریخ میں انیس کے مقام اور ان کی فکری، فنی اور شاعرانہ عظمت کی خصوصیات کا ذکر اس انداز میں کیا ہے جسے میں نے اس سے پہلے شاعرانہ حقیقت نگاری کہا ہے۔ اس سلسلے میں چند اشعار اور مصرعے ملاحظہ فرمائیے:

ع وہ مرثیے کی شریعت کا ابنِ مریم ہے

ع ہوا یہ شاعرِ فطرت شعورِ فطرت سے

ع کمالِ فکر کا اک معجزہ انیسؔ کا فن

ع جہاں نشیبِ سخن ہے وہاں بھی پست نہیں

ع انیسؔ فطرتِ آدم کا آئینہ بردار

ے رموزِ جذبہ و احساس کا مبصّر تھا
ضمیر و نفس و دل و روح کا مصوّر تھا

ے وہ اعتدال مزاجِ سخن کو حاصل ہے
جو داستان و حقیقت کی حدِ فاصل ہے

ے اسی کی شمعِ تجدّد کا نور ہیں فی الحال
نسیمؔ و نجمؔ و رضاؔ، جوشؔ و دعاؔ و اقبالؔ

پیمبری تو ہوئی ختم اب خلافت ہے

شاعری میں پیغمبری کا یہ مقام انیسؔ کو منظر کشی کے حسن، جذبات نگاری کی نزاکت، تیر کشی

میں حفظِ مراتب اور واقعات کے بیان میں جزئیات کے حسنِ انتخاب اور بیان میں لفظ و معانی کے رشتے کے لطیف احساس کی بنا پر ملتا ہے۔ نسیم کا جو مرثیہ اس وقت ہمارا موضوعِ سخن ہے اس میں انھوں نے چہرے کے بعد مرثیے کے ہر جزو کو یہ کہہ کر شروع کیا ہے کہ انیس صبح کہتا ہے تو اس طرح، رخصت کہتا ہے تو اس طرح، آمد کہتا ہے تو اس طرح، جنگ کہتا ہے تو اس طرح، وغیرہ وغیرہ، چنانچہ وہ چہرے کے بعد اصل مرثیہ اس طرح شروع کرتے ہیں ؎

منظر کشی صبح کا سماں:

وہ جو بھی لفظ کرے جس مقام پر تحریر
وہ سنگِ میل وہ پتھر کی اک لکیر ہے لکیر

کبھی جو منظرِ فطرت کی کھینچ دے تصویر
تو متن سے بھی وضاحت میں بیش ہو تفسیر

شفق کا رنگ سیاہی میں جب وہ بھرتا ہے
طلوعِ صبح کچھ ایسے شروع کرتا ہے

نقاب رخ سے جو حورِ سحر اٹھانے لگی
خزاں کی تیغ کے کشتوں میں جان آنے لگی

کرامتِ دمِ عیسیٰ صبا دکھانے لگی
شگوفے کھلنے لگے، صبح رنگ لانے لگی

ہوا سنکنے لگی، ڈالیاں لچکنے لگیں
چمن مہکنے لگا، بلبلیں چہکنے لگیں

وہ پھول اوس کے بھیگے نجوم جن پہ نثار
وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کی جانفزا رفتار

بہار کی وہ جوانی، وہ پتیوں کا نکھار
وہ بلبلیں رخِ گل پر رکھے ہوئے منقار

یہ وصل کے جو مناظر نظر پہ چڑھنے لگے
چٹک چٹک کے شگوفے درود پڑھنے لگے

مناظر صبح اور اذان و نماز کے بعد:-

بصد خضوع سحر کی نماز کر کے تمام
انیس آگے بڑھتا ہے اور ذکرِ امام

دکھا کے فوجِ حسینی کا نظم و ضبط و نظام
بہ ایں روش ہے رواں کلکِ و زباں کی حسام

اٹھا کے نیزہ جو سلطانِ خاوری نکلا
تو پسلیوں کو سپر کرکے ہر جری نکلا

جذبات نگاری، سیرت کشی اور مکالمے :

پسر کے داغ کی دنیا میں کچھ دوا ہی نہیں
اس امتحاں میں کسی کا قدم جما ہی نہیں
مگر حسینؑ سا صابر کوئی ہوا ہی نہیں
سکون و صبر و تحمل کی انتہا ہی نہیں
خوشی سے دل پہ یہ جبر اختیار کرتے ہیں
جوان بیٹے کو حق پر نثار کرتے ہیں

یہیں سے دیکھ رہی ہے یہ فطرتِ غمگیں
کہ جیسے طالبِ اذنِ دفاع ہے وہ حسین
زبانِ حال میں فرماتے ہیں یہ سرورِ دیں
پھوپی کا اذن ہو بیٹا تو ہم کو عذر نہیں
نہ دھوپ چھاؤں میں گھر سے کبھی نکالا ہے
تمھیں تو جوگ کما کر انھوں نے پالا ہے

کیا یہ سن کے ادب سے پسر نے شہ کو سلام
کمر کو کس کے رکھی ڈاب میں جری نے حسام
حرم سرا میں گیا شاد ہو کے وہ گلفام
کلیجہ تھام کے بس رہ گئے امامِ انام
پسر کو دیکھ کے بانو دعائیں دینے لگیں
جبیں کو چوم کے زینبؑ بلائیں لینے لگیں

جھکا کے سر کو جو بیٹھا جری پھوپی کے پاس
وہ بولیں خیر تو ہے میرے لال کیوں ہو اداس
میں صدقے ابڑھ گئی کیا دھوپ کی تپش سے پیاس
منگاؤ نہر سے پانی، کہاں گئے عباسؑ
یہ بولے ہائے انھیں کو تو رن میں کھو بیٹھے
کہاں کی پیاس کہ چھوٹے چچا کو رو بیٹھے

رخصت کے بعد :

بیانِ رخصتِ اکبرؑ کی راہ طے کر کے
حرم سرا کی صفِ آہ آہ طے کر کے

کتابِ صبرِ شہِ دیں پناہ طے کر کے
خیال رن پہ چڑھا خیمہ گاہ طے کر کے
زمینِ شعر کی لرزش کا مرحلہ آیا
حروف زیر و زبر تھے وہ زلزلہ آیا

اٹھایا در کا جو پردہ کنیز نے بڑھ کر
فرس پہ چڑھ کے روانہ ہوا وہ رشکِ قمر
دکھا دیا جو تصور نے رزم کا منظر
اب اس مقام پہ بدلے انیس کے تیور
سماں وہ باندھ دیا بزم کے شبستاں میں
کہ جیسے شیر کوئی گونجتا ہے میداں میں

انیس مہرۂ انقلابِ شعر و سخن
کلیمِ طورِ تجلّی مآبِ شعر و سخن
درِ علوم کی سرحد میں بابِ شعر و سخن
بیانِ رزم ہیں اُمّ الکتابِ شعر و سخن
سوارِ اسپِ تصور جو رَن کو تن کے چلا
تو خامۂ دو زباں ذوالفقار بن کے چلا

وہ آمد اور وہ سراپائے دلبرِ شبیرؑ
رجز، حسام، فرس، پہلوان، جمِّ غفیر
سپاہِ شر میں تلاطم، فرارِ فوجِ کثیر
کھنچی تھی ان کی قضا کے ورق پہ جو تصویر
اسی سے کھینچ کے تازہ مُرقّعِ ثانی
کچھ ایسے لکھتا ہے آمد کا مطلعِ ثانی

ہٹو ہٹو کہ شبیہِ نبیؐ وغا کو چلے
پدر سے رَن کی اجازت ملی وغا کو چلے
اٹھے، فرس پہ چڑھے، باگ لی وغا کو چلے
نبیؐ کے بھیس میں گویا علیؑ وغا کو چلے
سمندِ ختمِ رسل پر جو شیر تن کے چلا
عُقابؔ فوجِ عدو پر عقاب بن کے چلا

گھوڑے کی تعریف :-

فرس جو حور تو سر شمعِ طور، کلغی لَو
ایال کرنوں کا جھرمٹ کہ مو بمو پُر ضو

لے فرسِ علی اکبر کا نام

وہ نرم چال، وہ چھل بل وہ شوخیٔ تگ و دو   جبیں پہ چاند ہے روشن تو زیرِ سُم مہِ نو

بڑھا تو نعل کا جلوہ نظر پہ چڑھنے لگا
خود آفتاب دعائے ہلال پڑھنے لگا

وہ رن کے شوق میں مثلِ پرند اُڑ کے چلا   ہوا بھی رُک گئی تھک کر، سمند اُڑ کے چلا
وہ بے پری میں پری سے دو چند اُڑ کے چلا   خود اپنے مرغِ نظر سے بلند اُڑ کے چلا

لہو میں جیسے روانی ہو یوں روانہ ہے
وفا کے خون سے جو رگ ہے تازیانہ ہے

سراپا:-

فرس ہے خوب تو فارس حسین منقبِ نفیس   یہاں پہنچ کے چمن بند باغِ رزم، انیسؔ
بحسنِ نظم و بالفاظِ دلنشین و سلیس   بکلکِ عشق و بجذباتِ معرفت تاسیس

جمالِ اکبرِ ہیرو کے گیت گاتا ہے
نبیؐ کے حُسن کو یوں آئنہ دکھاتا ہے

وہ روئے پاک تجلّی میں طور کی صورت   وہ خال و خط کہ رسولِؐ غیور کی صورت
شہود و غیب میں بالکل حضور کی صورت   کہاں ہے دیکھ لے قرآن نور کی صورت

عمل وسیلے سے ان کے قبول ہوتے ہیں
کہ ایسی شکل کے انساں رسولؐ ہوتے ہیں

وہ لوحِ عرش عبارت جبینِ آئنہ رو   نشانِ سجدۂ رب لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُو
وہ گوشِ پاک کی لو تک مُڑے ہوئے گیسو   قریبِ آیتِ واللیل ہے اِذا سَمِعُوْ

سرِ صحیفۂ رُخ خطِ خوش نمط دیکھو
شبابِ احمدِ مرسل کے دستخط دیکھو

آمد :-

کچھ اس طرح سے سراپا کی کھینچ کر تصویر — نظر انیس کی اٹھی جو سوئے فوج کثیر
یہ کہہ اٹھا کہ۔ وہ آتی مثالِ قہر قدیر — جلالِ سورۂ توبہ کی بولتی تفسیر

جو روبرو تھے وہ رودا رن سے مڑنے لگے
کہ رنگ بن کے رخوں کا، حواس اڑنے لگے

جھپٹ کے شیر کی صورت جری اِدھر سے چلا — دبک کے شام کا ہر پہلوان اُدھر سے چلا
جلال سر کو جھکائے جِلو میں ڈر سے چلا — علیؑ کا شیر محمدؐ کے کر و فر سے چلا

زمیں پکاری کہ گردوں وقار آتے ہیں
براق پر شہِ دلدل سوار آتے ہیں

یہ دبدبہ ہے کہ گردوں ہے سر جھکائے ہوئے — یہ وسوسہ ہے کہ سورج ہے منہ چھپائے ہوئے
علیؑ کا شیر جو ہے آستیں چڑھائے ہوئے — فلک کھڑا ہے زمیں کے پرے دبائے ہوئے

یہی ہے شور کہ چرخِ بریں کی خیر نہیں
ابوتراب سنبھالو، زمیں کی خیر نہیں

تلوار کی تعریف :

چلی وہ چال کہ لاکھوں کو پائمال کیا — رخوں کا رنگ اڑایا، بدن کو لال کیا
نگاہ جس سے لڑی اس کو خستہ حال کیا — ادا سے ذبح کیا، ناز سے حلال کیا

یہ دل جلا گئی اس دل کی آس توڑ گئی
جدھر گئی کوئی تازہ شگوفہ چھوڑ گئی

لہو سے اور بھی رنگت چمکتی جاتی ہے — نزاکتوں سے کمر بھی لچکتی جاتی ہے
جو اونگھتے ہیں یہ ان کو تھپکتی جاتی ہے — جراحتوں پہ نمک بھی چھڑکتی جاتی ہے

روش میں سیل ہے، بجلی شرر فشانی میں
وہ شوخ ہے کہ لگاتی ہے آگ پانی میں

جدھر چلی یہ ہزاروں کے سر اُڑا کے چلی　　نظر جھکا کے چلی اور بدن چُرا کے چلی
تڑپ تڑپ گئے جلوہ جنھیں دکھا کے چلی　　تباہ کرکے چلی، حسن پر مٹا کے چلی
چلی جو وہ تو چھری دل پہ ایک بار پھری
کہ جیسے عاشقِ غمگیں سے چشمِ یار پھری

پہلوانوں سے جنگ:

سپہ گری جو دکھانے لگا وہ بد گوہر　　چمک کے تیغِ جری نے بجھا دیے تیور
سرِ وہی اس کی جو اٹھی بسانِ دردِ جگر　　حسام ان کی چلی اُڑ کے مثلِ مُرغِ نظر
سلف کا خون دو طرفہ اثر دکھانے لگا
یہ مسکرانے لگے وہ نظر چُرانے لگا

لپک کے تیغِ جری اس کے سر میں در آئی　　سرِ لعیں سے جو سرکی تو بر میں در آئی
مرادِ دل جو بر آئی جگر میں در آئی　　جگر میں جی نہ لگا تو کمر میں در آئی
کمر کو کاٹ کے گھوڑے کے زین تک پہنچی
چمک کے زین سے دم میں زمین تک پہنچی

ذکرِ مصائب:

جھپٹ کے شوم سے جھپٹے جو فوج پر اک بار　　کسی سے کچھ نہ بن آئی بجز گریز و فرار
ہوا یہ شور کہ سب مل کے گھیر لو اک بار　　یہ سن کے ٹوٹ پڑے تشنہ لب پہ وہ غدار
عرب کی رسم سے منہ ظالموں نے پھیر لیا
شبیہِ احمدِ مرسل کو سب نے گھیر لیا

کچھ اور واں سے جو آگے بڑھے امام ہدا　　نظر پڑی وہ قیامت کہ لاکھ ضبط کیا
مگر تڑپ کے یہ فطرت نے کہلوا ہی دیا　　بس اب حسینؑ کے جینے پہ خاک ہے بیٹا
ہم آئے ہیں پئے دیدار السّلام علیک
اٹھو مرے جرّار السّلام علیک

سنی جو نزع کے عالم میں باپ کی یہ صدا — کہا پسر نے علیک السّلام اے بابا
زمیں پہ بیٹھ کے، میری زباں میں، شہ نے کہا — کلیجہ پکڑے ہو کیوں دونوں ہاتھ سے بیٹا
عدو نے تیغِ جفا کس جگہ لگائی ہے
کہا پسر نے کہ سینے پہ برچھی کھائی ہے

اب الوداع کہ آئے رسولؐ اے بابا — سرھانے ہیں یہ علیؑ و بتولؑ اے بابا
وہ پائنتی ہیں حسنؑ دل ملول اے بابا — ہوئی ہماری شہادت قبول اے بابا
پھوپی کو جا کے ہمارا اسلام کہہ دینا
اخی جو غش سے اٹھیں یہ پیام کہہ دینا

وطن میں ان کو جو لے جائے خالقِ اکبر — یہ ہاتھ جوڑ کے صغرا سے کہہ دیں رو رو کر
نہ آسکا تجھے لینے کو عفو کر خواہر — یہ اک وصیتِ آخر نہ بھولنا دم بھر
ہجومِ رنج میں تڑپیں کہ اشکبار رہیں
ہماری عمّہ کے پردے سے ہوشیار رہیں

"پیامِ انس ہے انساں کو داستانِ انیس" ۴۹ ابند کا مرثیہ ہے۔ میں نے اس کے مختلف حصّوں کے اقتباس پیش کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس کی کہ قارئین کو نسیم کی مرثیہ نگاری کے اس رخ کا اندازہ بھی ہو جائے کہ نسیم نے مرثیے کو اصلاحی مقاصد کے اظہار کا وسیلہ بنانے اور اس سے معاشرتی اصلاح کا کام لینے کے جس عمل کو اپنا معمول بنایا اس پر وہ بڑی مستقل مزاجی سے قائم رہے، اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے کبھی مرثیے میں قصیدے کی شان اور کبھی داستان کی دلکشی پیدا کی، اسی بلند مقصد کے حصول کے پیشِ نظر انھوں نے اکثر و بیشتر مرثیے کی ترتیب میں اس کے روایتی حصّوں کی پابندی نہیں کی اور ان حصّوں میں سے جن کے متعلق یہ محسوس کیا کہ وہ ان کے مقصد کے اظہار کا زیادہ مؤثر وسیلہ بن سکتے ہیں، انھیں مرثیے میں زیادہ سے زیادہ جگہ دی، لیکن روایت سے اس انحراف کے

باوجود وہ ایسا مرثیہ لکھنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں جو مرثیے کے روایتی معیار پر پورا اترتا ہے۔

"پیامِ انس ہے انساں کو داستانِ انیس" نسیم کی مرثیہ گوئی، اس روایتی فنی رجحان کا بڑا کامیاب اور مکمل نمونہ ہے اور یہاں موضوع اور بیان کے امتزاج کا وہی رنگ و آہنگ ہے جس کے خاتم کئی حیثیتوں سے انیس تھے۔

نسیم کے مرثیوں میں اس طرح کے رزمیہ مرثیے اور بھی ہیں، مثلاً ایسے مرثیوں میں سے ایک اور مرثیہ جو حضرت قاسمؑ کے حال میں ہے رزمیہ مرثیہ نگاری کا بڑا دلکش مرقع ہے۔

اس مرثیے کا پہلا مصرعہ ہے: ع

کیا باوفا رفیقِ شہ ذی وقار تھے

یہ ہے داستان، نسیم کی ۵۱ سالہ مرثیہ نگاری کے ارتقائی مراحل کی۔ نسیم کے مرثیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض نقادوں نے ان ۵۱ سالہ تاریخ کو مختلف رجحانات کے تحت کئی ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ چنانچہ ایک فاضل نقاد نے ان ادوار کی تقسیم اس طرح کی ہے۔

پہلا دور ۱۹۳۰ء تک اِس دَور میں ان کے مراثی پر ان کے دادا حضرت شمیم امروہوی کے رنگِ سخن کا اثر دکھایا گیا ہے اور اس رنگِ سخن کی سب سے نمایاں خصوصیت رعایتِ لفظی کو بتایا گیا ہے۔

دوسرا دور لکھنؤ آکر شروع ہوا اور قریب قریب ۱۹۳۹ء میں ختم ہو گیا۔ اِس دَور میں ان کے مرثیوں پر انیس اور آتش کے اثر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ نسیم نے اس دَور میں جو مرثیے لکھے ہیں ان میں واعظین کا استدلال، اسلام کی تبلیغ، احادیث و آیات کے ترجمے شاعرانہ لطافتوں کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔

تیسرا دور قریب قریب ۱۹۴۰ء سے شروع ہوا۔ یہ دَور موضوع اور اندازِ بیان کے لحاظ سے پچھلے ادوار سے مختلف ہے۔ اس دَور میں انھوں نے نئی طرز کے مرثیے کہے۔ ان مرثیوں کے متعلق یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ "نسیم مرثیہ کو قومی نظم کی طرف لے جا رہے ہیں، جس کی

وجہ سے مرثیت کا پایہ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔"

میرے نزدیک ادوار کی تعین کے سلسلے میں صحت اور یقین کے ساتھ کچھ کہنا اس لیے ممکن نہیں کہ نسیم کی مرثیہ گوئی میں جن رجحانات کی نشان دہی کی گئی ہے ان میں سے کوئی ایسا نہیں جو ایک خاص وقت تک جاری رہ کر ایک خاص وقت میں ختم ہو گیا ہو۔ یہ مستقل رجحانات نسیم کی مرثیہ گوئی کے ہر دور میں موجود ملتے ہیں اور اسی لیے شاید یہ کہنا بھی درست نہیں کہ نسیم نے قومی طرز کے مرثیے ۱۹۴۰ء میں لکھنے شروع کیے۔

خود نسیم صاحب نے اپنی مرثیہ گوئی کے رجحانات کے متعلق ایک خط میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اس لحاظ سے قابلِ قبول ہیں کہ ان کے ۱۵ سالہ مرثیے ان کی کہی ہوئی باتوں کی تائید و تصدیق کرتے ہیں، اس سلسلے میں ان کے خیالات یہ ہیں :-

"اپنی مرثیہ گوئی کے گزشتہ ۱۵ ۱/۲ برس میں، میں نے چار رنگ کے مرثیے کہے :-

۱ ۔ میر انیس اور آتش کی زبان میں، اور انیس کے خاکے کے مطابق، صرف مضامین میں تنوع پیدا کیا ہے۔

۲ ۔ قرآن و احادیث کے تراجم و مفاہیم، علم الکلام کے لہجے اور منطقیانہ و شاعرانہ استدلال کے پیرائے میں۔

۳ ۔ افرادِ مرثیہ کے کردار کو اس طرح اجاگر کر کے کہ اس سے سننے والے سبق لیں اور عقل کی روشنی میں ان کی حیثیت سے باخبر ہوں۔

۴ ۔ اخلاقِ اجتماعی، تمدن، معاشرت، تہذیب، اقتصادی حالت اور سیاسی شعور کی اصلاح سے متعلق بہت سی چیزیں جا بجا کہیں۔

آخر کے تین رنگ ایک دوسرے کے دوش بدوش چلتے رہے اور اب تک برقرار ہیں۔

مندرجہ بالا بیان میں جن رجحانات کی طرف اشارہ ہے ان کی تفصیل میں مراثیِ نسیم کے اس تبصرے میں بیان کرتا رہا ہوں اور اس سلسلے میں اس بات پر سب سے زیادہ زور دیا ہے

کہ نسیم کے مراثی کا مرکزی رجحان وہ ہے جسے خود مرثیہ نگار نے اخلاقِ اجتماعی، تمدن، معاشرت، تہذیب، اقتصادی حالت اور سیاسی شعور کی اصلاح " کہا ہے۔ افراد مرثیہ کو ایک خاص طرح اجاگر کرنے کا رجحان بھی اصل میں پہلے رجحان کا تابع ہے، اور ایک لحاظ سے علم الکلام کے لہجے اور منطقی اور شاعرانہ استدلال کے پیرائے میں بات کہنے کا سبب بھی یہی احساس ہے کہ اصلاح، منطق اور استدلال کے بغیر مؤثر اور نتیجہ خیز نہیں ہوتی۔

نسیم نے اپنے تجزیے میں انیس اور آتش کی زبان اور انیس کے خاکے کے مطابق مرثیے لکھنے کے جس رجحان کی طرف اشارہ کیا ہے وہ البتہ ایک منفرد چیز ہے۔ یہ رجحان اصلاح کے رجحان سے الگ ہر دور میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا رہا۔ اصلاحی مرثیوں میں تو اس کا عکس صرف خاص خاص حصوں میں ملتا ہے۔ اور صرف وہیں ملتا ہے جہاں اس طرز کو اختیار کرنے میں کوئی فنی مصلحت ہے، لیکن کبھی کبھی یہ اپنی مکمل جامع صورت میں بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔ ایسے مرثیے مرثیہ نگاری کے فن کے بڑے دلکش نمونے ہیں، جیسا کہ ع

" پیامِ انس ہے انساں کو داستانِ انیس "

اور

" کیا باوفا رفیقِ شہِ ذی وقار تھے "

—— جیسے مرثیوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

نسیم کے مرثیوں کے اصلاحی رجحان کے متعلق یہ رائے کہ " وہ مرثیے کو قومی نظم کی طرف لے جا رہے ہیں، جس کی وجہ سے مرثیت کا پایہ کمزور ہوتا جا رہا ہے "! اس حد تک تو یقیناً صحیح ہے کہ نسیم کے اصلاحی مرثیوں میں مرثیت کا وہ انداز نہیں جو ہمارے روایتی مرثیے میں ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے مرثیت کو، اظہارِ غم کو، یا گریہ بکا

کو محض حصولِ ثواب کے لیے وقف کرنے کی بجائے اِصلاحِ نفس اور اصلاحِ معاشرہ کے اعلیٰ اور ارفع مقصد کے حصول کا ذریعہ بنایا اور یوں اس کے فکری اور فنی منصب کو وہ وسعت دی، جس سے وسعت و ترقی کی مزید راہیں کھلتی ہیں۔

ڈاکٹر مسلم

لاہور، ۱۲ نومبر ۱۹۷۴ء

نسیمؔ امروہوی نے اُردو مرثیے کو کیا دیا؟

حسین اعظمی

دنیا کی ہر قابل ذکر زبان میں رثائی اور رزمیہ شاعری کا وافر ذخیرہ موجود ہے' لیکن جس طرح اردو میں رثائی شاعری اور رزمیہ شاعری کو ایک دوسرے میں سمو کر مرثیے کے قالب میں ڈھالا گیا ہے اس کی مثال کسی زبان میں یہاں تک کہ فارسی اور عربی میں بھی نہیں ملتی۔ اردو کے مشہور اور ممتاز نقاد ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے "رثائے محسن الحکیم" کے مقدمہ میں تحریر کیا ہے کہ :

> "اردو شاعری کے مورخین اور ناقدین نے بالاتفاق لکھا ہے کہ اصناف سخن میں اردو مرثیہ ایک ایسی صنف ہے جو خاص اردو شعرا کی اپنی ایجاد ہے اور ہیئت، موضوع اور اسالیب کے اعتبار سے جو وسعت اور تنوع اس صنف کو اردو مرثیہ گو شعرا کی کاوشوں سے حاصل ہوا اس کی مثال کسی اور صنف میں نظر نہیں آتی۔"

—— یہ تنوع اور شاعری کے دامن کو وسیع کرنے کا یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق توسیع اور تنوع کا یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو زبان کو ایک زندہ اور ترقی پذیر زبان بنانے میں دیگر عوامل کے دوش بدوش مرثیہ گو شعرا کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ اس بنیادی حقیقت کے علاوہ کہ۔ مرثیہ نے عوام الناس کے ذہنوں میں حق وصداقت کے شعور کو اجاگر کیا' حق وصداقت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی خندہ پیشانی سے دینے کے لیے ذہنوں کی تربیت' انسانیت دوستی' ظلم سے نفرت' اصول

پرستی، وفاداری، حق کوشی، اور حق پروری کی شمعوں کو ظلم وستم، اور حرص و آز کی تیز آندھیوں کے مقابلے میں روشن رکھا۔ مرثیے کی وجہ سے اردو زبان و ادب کو اور اس کے توسط سے ہمارے معاشرے کو تین بڑے فائدے اور بھی پہنچے :

۱۔ چونکہ مرثیے کا دائرہ عمل ناول اور ڈرامے سے بھی زیادہ وسیع ہے اس لیے اس میں گوناگوں کیفیات، بوقلموں مناظر، متنوع خیالات و نظریات، اخلاقی اقدار، فلسفیانہ نظریات، اور ہر طرح کے واقعات کی روشنی میں تصویر کشی کے لیے الفاظ کا غیر معمولی ذخیرہ استعمال ہوا ہے۔ یہ بات، مَیں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جتنے الفاظ مفرد اور مرکب، اردو مرثیوں میں استعمال ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں، نیز نئی نئی بندشوں کے ذریعے جو نئے مرکبات تشکیل پذیر ہو کر زبان کا جزو بن رہے ہیں، اتنے لفظ اردو غزل، مثنوی، قصائد، ہجویات، طنزیات، قطعات، رباعیات، اور دیگر اصناف سخن میں نہیں مل سکتے۔ اسی طرح جتنی نادر اور انوکھی تشبیہات، استعارات، روایتی تلمیحات، تاریخی واقعات کے حوالے، اور لفظی اور معنوی صنعتیں اردو مرثیے میں استعمال کی گئیں، تمام اصناف سخن میں ان کا عشر عشیر بھی نہیں۔ بالفاظ دیگر مرثیہ کی وجہ سے اردو زبان کے ذخیرۂ الفاظ اور اسالیب بیان میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے جسے تاریخ ادب میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ مرثیہ اور اس کے ضمنی شعبوں (سلام، رباعی، مناقب و قصائد وغیرہ) نے اردو شاعری کو (جس کے دامن میں ایک عرصے تک گل و بلبل، شمع و پروانہ، قاتل و بسمل، ہجر و وصال، اور اس کے بعد کنگھی چوٹی محبوب

کے سراپا، اور فرضی عشقیہ داستانوں اور اغراق وغلو سے بھرے ہوئے قصائد کے علاوہ کچھ نہیں تھا) نہ صرف متین اور پُروقار علمی لب ولہجہ عطا کیا بلکہ اعلیٰ درجے کے فلسفیانہ خیالات اور بلند پایہ علمی نظریات کے موتیوں سے مالا مال کر دیا۔ کہاں اردو زبان کی تنگ دامانی کا وہ عالم کہ غالب جیسا نابغۂ روزگار اور قادر الکلام شاعر اس کی تنگ دامانی کا شکوہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

اور کہاں دوسری طرف ایک مرثیہ گو شاعر کی یہ صلائے عام:

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

—— اور وہ یہ دعوت کیوں نہ دیتا اس لیے کہ نہ تو اس کی شاعری کا میدان تنگ تھا اور نہ اس کی خلاق طبیعت کی جولانی کی کوئی انتہا تھی۔ اس کو دعویٰ تھا اور یہ دعویٰ مجذوب کی بڑ نہ تھا بلکہ صداقت پر مبنی تھا کہ:

ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کردوں
بحرِ مواج فصاحت میں تلاطم کردوں
ماہ کو مہر کروں ذرّے کو انجم کردوں
گنگ کو ماہرِ اندازِ تکلم کردوں

—— اس کے اس دعویٰ کا سرچشمہ اور منبع مرثیہ ہی تھا، جس طرح بقول علامہ سید ابن حسن جارچوی مرحوم "اگر اسلام کے دامن سے محمدؐ و آلِ محمدؐ کی تعلیمات اور سیرتوں کو علیحدہ کر دیا جائے تو اس میں جنگ و جدال اور

خون خرابے کے سوا باقی کیا رہ جاتا ہے۔" بالکل اسی طرح اگر اردو ادب کے خزانے سے مرثیہ اور اس کے متعلقات کو الگ کر دیا جائے تو اردو ادب کا سرمایہ چند پھولوں اور بے شمار کانٹوں تک محدود ہو کر رہ جائے گا ـــ اردو زبان و ادب پر مرثیہ کا یہ احسان عظیم ہے کہ اس نے مناظر سے لے کر انسانی نفسیات، اخلاقی اقدار، فلسفیانہ خیالات و نظریات، تاریخی حقائق تک، اور اس کے بعد اب معاشی، تنظیمی اور سیاسی مسائل کو اپنا موضوع بنا کر اردو کو اس قابل کر دیا کہ وہ ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں سینہ تان کر اور سر اونچا کر کے کھڑی ہو سکے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اردو مرثیہ کی موجودہ ہیئت نے اردو کی قومی شاعری کو ایک مستقل سانچا (PATTERN) فراہم کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس دور کے فاضل نقاد پروفیسر وقار عظیم نے بجا طور پر فرمایا ہے کہ:

"مرثیے کی وہ ہیئت جسے انیسؔ سے پہلے بھی مسلسل خیال کے اظہار کے لیے استعمال کیا جاتا رہا تھا، انیس کے فن کارانہ تصرف کے بعد قومی شاعری کا ایک مستقل سانچا بن گئی۔ حالی کے مسدس اور اقبال کے "شکوہ و جواب شکوہ" میں اس کا عکس ہے۔"

۳۔ مرثیے کا اردو زبان و ادب پر بھی اور معاشرے پر بھی یہ ایک گراں قدر احسان ہے کہ اس نے اس عرصہ حیات میں جو روز ازل سے رزم گاہ خیر و شر ہے اور ہمیشہ رہے گا، شر کے مقابلے میں خیر کی طاقتوں کو منظم کرنے، حیوانیت و بربریت کے مقابلے میں انسانیت کو فروغ دینے، اعلیٰ دینی و اخلاقی قدروں کے تحفظ کے لیے جدوجہد کرنے، اہلبیت کے مقابلے میں للٰہیت کو ابھارنے، اور للٰہیت اور خیر کل کے مثالی کردار کے ذریعہ عزم و حوصلہ، جوش و خروش

اور تحریک عمل کا درس لینے کے لیے ایک مرکز اور محور فراہم کردیا ہے۔ جس کا جی چاہے اس سرچشمے سے فیضیاب ہو۔

یہ صحیح ہے کہ مرثیہ کی موجودہ شکل وصورت، خدوخال، رنگ روپ، وضع قطع اور لباس یعنی ہیئت مجموعی میں مسلسل تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی، اس کا مزاج بھی ثناً فوثناً بدلتا رہا ہے، کبھی حزن محض تھا، کبھی مکمل نوحہ، کبھی یہ رزم کے مردِ میداں کی حیثیت سے ہتھیار سج کر شر کے مقابل صف آرا ہوا، اور کبھی اس نے "بزم" کی محفلیں سجائیں، لیکن ہر دور میں اس کی روح یا بنیادی مقصد اور نصب العین یعنی واقعات کربلا، ذکر اہل بیتؑ، ظلم کی مذمت اور ہمدردی مظلوم میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ ابتداً اردو مرثیے کا آغاز جب دکن میں ہوا تو وہ اپنی وضع قطع، لب ولہجہ، اور مزاج کے اعتبار سے خالص نوحہ وماتم تھا۔ اس وقت کے مرثیوں میں ہر شعر غزل کے اشعار کی طرح علیحدہ ہوتا تھا اور اس میں کسی واقعہ غم کی طرف اشارہ کردیا جاتا تھا۔ ابھی یہ طویل یا مسلسل نظم کے سانچے میں نہیں ڈھلا تھا۔ یہ اردو مرثیہ کا عہد طفولیت تھا، اس کے بعد مرثیے میں تسلسل پیدا ہونا شروع ہوا اور طویل نظم کی صورت اختیار کرنے لگا۔ اس کی ہیئت میں بھی تبدیلی آئی۔ اور غزل کی ظاہری صورت کی جگہ چار چار مصرعے کے بند کہے جانے لگے لیکن مضامین کے لحاظ سے مجموعی مزاج میں کوئی فرق نہ آیا، کچھ دن کے بعد وہ اپنے مولد (دکن) سے شمالی ہند کے دارالسلطنت دلّی پہنچا۔ اور سوداؔ کے عہد تک اس نے مسدس کی شکل اختیار کرلی۔ اگرچہ اس دور میں میرؔ، نظیرؔ اکبرآبادی اور سوداؔ جیسے قادرالکلام اور مانے ہوئے اساتذہ فن نے مرثیے کہے، لیکن ان کی مشاقی اور مہارت بھی مرثیہ کو کوئی ممتاز اور پر وقار ادبی

مقام نہ دے سکی۔ جس کا اندازہ اُس دور کی اس کہاوت سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ "بگڑا گویا قوال اور بگڑا شاعر مرثیہ گو" دلی ہوتا ہوا جب مرثیہ لکھنؤ پہنچا تو اس کے دن پھر گئے۔ مرزا دبیرؔ کے استاد میر ضمیرؔ نے، اور میر انیسؔ کے والد میر مستحسن خلیقؔ نے اس کے حدود متعین کیے۔ مرثیہ کو باقاعدہ ایک طویل مسلسل نظم کا درجہ عطا کیا، اس کے بنیادی عناصر ترکیبی مثلاً چہرہ، رخصت، آمد، رجز، جنگ، گھوڑے اور تلوار کی تعریف، شہادت اور بین وغیرہ مقرر کیے۔ مرثیے کے حدود متعین ہو جانے کے بعد میر انیسؔ اور میرزا دبیرؔ کو اپنی خلاق طبیعتوں کے جوہر دکھانے کے مواقع فراہم ہوئے، انھوں نے مرثیے کے اجزا کو چار چاند لگا دیے اور اسے بلندیوں کی اس منزل پر پہنچا دیا جس سے آگے نکل جانا تو بہت بڑی بات ہے، دوسروں کے لیے ان بلندیوں کو چھونا بھی تقریباً ناممکن ہو گیا۔ مرثیہ کے اس دور میں جو غیر معمولی اور مثالی ترقی ہوئی اس میں ان دونوں فرید روزگار شعرا، میر انیسؔ اور میرزا دبیرؔ کی معجزانہ اور فنکارانہ صلاحیتوں کے علاوہ اس دور کے ماحول کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔

دوسری قابل ذکر بات یہ کہ اس دور کی سرکاری، درباری، دفتری، علمی ادبی اور بول چال کی زبان کم و بیش ایک سی تھی، نیز شاعری کا چرچا گھر گھر تھا، اس لیے عالم سے لے کر عامی تک، اور شعرا سے لے کر ارباب حرفت اور مختلف پیشے کرنے والے افراد تک سب شاعری لطافتوں، زبان و بیان کی خوبیوں اور شاعرانہ موشگافیوں سے کماحقہ محظوظ ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ علاوہ بریں طرز تعلیم ایک جیسا تھا، معاشرہ نسبتۃً ہموار تھا اس لیے اچھائیوں اور برائیوں کے معیاروں اور اخلاقی قدروں میں یکسانیت تھی، ان تمام وجوہ کی بنا پر شاعر اور عام قاری اور سامع کے درمیان مضبوط

ذہنی ربط اور رشتہ قائم تھا۔ تیسری اہم بات یہ تھی کہ اس دور کے اہلِ فکر اور حساس افراد اس بات کو شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ رفتہ رفتہ ایک غیر ملکی طاقت اور تہذیب کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جارہی ہے۔ خواص سے لے کر عوام تک سب کو اپنے فرماں رواؤں سے (ان کی کمزوریوں کے باوجود) انسیت اور محبت تھی اور وہ دیکھ رہے تھے کہ امورِ سلطنت میں بیرونی طاقت یعنی انگریزوں کا اثر و رسوخ بڑھتا جارہا ہے' اور اودھ میں نوابی کی شمع چراغِ سحری بن چکی ہے۔ انیسؔ اور دبیرؔ نے بھی اس کیفیت کو محسوس کیا تھا اور انھوں نے اپنے مرثیوں میں رزم کے ذریعے پوری قوم میں عسکری روح اور مجاہدانہ جذبے کو ابھارنے کی بالواسطہ کوشش بھی کی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں میں رزمیہ مضامین اور حق و صداقت کی حمایت کرنے کی ترغیبات اور ظالم اور غاصب کے خلاف نبرد آزما ہونے کی تعلیمات اس دور کے سیاسی حالات سے بالکل غیر متعلق نہیں تھے۔ رزم کے بیان میں انیسؔ و دبیرؔ اور دیگر شعرا کو یہ سہولت بھی حاصل تھی کہ اس وقت تک تیغ زنی' شہسواری اور اس کے متعلقات محض لغت کے الفاظ نہیں تھے بلکہ شعرائے کرام بھی عملی طور پر ان سے واقف تھے اور سامعین کی بھی بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو فن سپہ گری سے اچھی طرح آشنا تھے، بنابریں یہ بزرگ رزمیہ مضامین تبرکاً یا مرثیے کی روایت کو برقرار رکھنے کے لئے نظم نہیں کرتے تھے۔ بلکہ فن سپہ گری کو زندہ رکھنے کے لئے بھی نظم کرتے تھے اس لیے ان میں حقیقت اور واقعیت تھی۔ سامعین ان مضامین سے خاطر خواہ لطف اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ بالآخر فروری ۱۸۵۶ میں وہ منحوس گھڑی آگئی جس کا دھڑکا اس دور کے بہت سے باشعور اور حساس لوگوں کو تھا۔ یعنی جنرل

اودھ م نے آخری تاجدار اودھ نواب واجد علی شاہ کو معزول کر کے مٹیابرج میں جلاوطن کر دیا۔ اس واقعہ سے پورے اودھ میں صف ماتم بچھ گئی۔ ہر شخص کا دل محزون اور آنکھیں اشکبار تھیں، نواب واجد علی شاہ کی مقبولیت کا اندازہ اس حقیقت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ دوسرے سال یعنی ۱۰ ر مئی ۵۷ کو جب میرٹھ میں بغاوت ہوئی تو اودھ کے بیشتر اضلاع اور خود لکھنؤ بھی اس میں شریک ہو گیا۔ چونکہ انیس اور دبیر نے نواب واجد علی شاہ کی بیدخلی اور اودھ کی تاراجی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اور ان کا دل بھی اودھ کی پوری آبادی کے ساتھ اس حادثے پر نوحہ کناں تھا، اس لئے انہوں نے دوسرے شعرا کی طرح اپنے تاثرات کو شہر آشوب کی شکل میں تو نظم نہیں کیا لیکن اپنی دلی کیفیات اور اپنے ذاتی اور قومی غموں کو بھی غم امام مظلوم میں ضم میں کر دیا جس کی وجہ سے مرثیہ کے تاثر اور تاثیر میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا چونکہ انھوں نے انتزاع سلطنت اودھ کے دل دوز مناظر کو بچشم خود دیکھا تھا اور ان تباہ کاریوں، کشت و خون اور لوٹ کھسوٹ کا مشاہدہ کیا تھا، اسلیے جب انھوں نے معرکۂ کربلا کی خوں ریزی اور لوٹ مار کے مناظر کی تصویر کشی کی تو اس میں شعوری اور غیر شعوری طور پر واقعیت اور صداقت بھر دی۔ میری یہ مراد نہیں ہے کہ انیس و دبیر نے واقعات کربلا کی شکل میں اودھ کا مرثیہ کہا ہے بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ واقعات کربلا کی تصویر کشی کرتے وقت ان کا دل امام مظلوم کی مظلومیت پر بھی رو رہا تھا اور اودھ کی تباہی پر بھی، جو مرثیے کا گہوارہ تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مرثیت اور مرثیے کو ان کے ہاتھوں جو عروج نصیب ہوا وہ اس کی ترقی کا انتہائی نقطہ تھا۔ ان کے بعد آنے والے شعرا اسی ڈگر پر چلتے رہے، کوئی نئی بات پیدا نہ کر سکے۔

انیسؔ و دبیرؔ کے بعد کچھ عرصے تک تو سابقہ روایات برقرار رہیں، لیکن انتزاعِ سلطنت کے فوراً بعد معاشرے کے مزاج کی طرح مرثیہ گوئی میں بھی تنزل شروع ہوا۔ انیسؔ و دبیرؔ کے بعد ان کے لائق فرزندوں میں میر خورشید علی نفیسؔ اور مرزا محمد جعفر اوجؔ نے بڑی حد تک اپنے نامور بزرگوں کی روایات کو برقرار رکھا۔ لکھنؤ کے باہر بھی فرزدقِ ہند حضرت شمیمؔ امروہوی، علی محمد شادؔ عظیم آبادی اور دوسرے شعرا نے اس شمع کو فروزاں رکھنے کی کوشش کی، لیکن حالات بدل جانے کی وجہ سے وہ اس فطری تنزل کو نہ روک سکے۔ زمانہ نہایت تیزی سے آگے بڑھنے لگا، ہندوستان میں آزادی کی تحریک نے زور پکڑا، پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی جو چار سال تک جاری رہنے کے بعد ۱۱ر نومبر ۱۹۱۸ کو ختم ہو گئی۔ جس کے نتیجے میں نہ صرف ہندوستان بلکہ متعدد ملکوں میں نئی نئی تبدیلیاں ہوئیں۔ روس میں مزدوروں اور کسانوں نے بغاوت کر کے زارِ روس کا تختہ الٹ دیا، مشرقِ وسطیٰ کے حصے بخرے ہو گئے۔

اس افراتفری کے دور میں نسیمؔ امروہوی نے میدانِ مرثیہ گوئی میں ایک نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ قدم رکھا۔ انہوں نے ۱۹۲۳ء میں جب کہ وہ اپنی عمر کا پندرھواں سال طے کر چکے تھے پہلا مرثیہ کہا جس کا مطلع تھا:

تجھ میں اے باغِ وطن اب گلِ خوش رنگ نہیں

—— اس مرثیے کا سنِ تصنیف اس کے مقطعے میں مادۂ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے۔ مقطعے کا بند درج ذیل ہے:

بس قلم روک لے اے مرثیہ گوئے شبیر
غش نہ ہو جائیں عزادارِ امامِ دلگیر
شکر کر اب کہ بافضالِ خداوندِ قدیر
باپ دادا کی مجھے مل گئی اصلی جاگیر

اس عطا کا سنِ تصنیف یہ لکھا قایم
آفریں خوب ہے یہ مرثیہ پہلا قایم
۱۹۲۳

—— اس وقت تک نسیم صاحب اپنے نام "قایم" کو ہی بطور تخلص استعمال کرتے تھے۔

جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں اشارۃً عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کی سیاسی، سماجی، اور ادبی زندگی میں اہم تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ سرسید، آزاد، حالی اور شبلی نعمانی وغیرہم نے ہوا کے رخ کو پہچان کر جو کوششیں شروع کی تھیں ان کے ٹھوس نتائج اب سامنے آنا شروع ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور اور علامہ اقبال کی شاعری نے بھی ذہنوں کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان دونوں کی شاعری اور فکر و فن کے امتزاج اور ان کے عمل ورد عمل سے جوش ملیح آبادی کی شاعری کا خمیر تیار ہو رہا تھا، اردو غزل میں اصلاح کی تحریک نے اتنا زور پکڑا کہ لکھنؤ اسکول بھی، جو اپنی روایت پسندی اور قدامت پسندی میں اپنی مثال آپ تھا، اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مولانا صفی، (ان کے شاگرد) مرزا محمد ہادی عزیز، میرزا ثاقب اور نواب جعفر علی خاں اثر نے لکھنؤ اسکول کی غزل کو جو ابھی تک کنگھی چوٹی میں الجھی ہوئی تھی، آئینہ حیات دکھایا اور اس میں خارجیت کے اثرات کو کم کر کے داخلیت کے عناصر کو شامل کیا۔ لیکن تمام حالات اور تبدیلیوں سے لکھنؤ کے مرثیہ گو شعرا تقریباً لاتعلق رہے، بظاہر اس کی وجہ یہ تھی کہ انیس و دبیر نے اردو مرثیہ کو جس بلندی پر پہنچا دیا تھا وہ مرثیہ کی ترقی کی آخری حد تصور کی جاتی تھی۔ اس حقیقت کو بہت سے شاعروں اور نقادوں

نے فراموش کر دیا تھا کہ مرثیہ کے بنیادی اور اساسی قالب میں اتنی قوت اور توانائی ہے کہ وہ بدلے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انیسؔ و دبیرؔ کے بعد نفیسؔ، اوجؔ، وحیدؔ اور تعشقؔ وغیرہ نے مرثیے کے معیار کو برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کی اور بڑی حد تک وہ اپنی کوششوں میں کامیاب بھی رہے، لیکن ان کے بعد وہ بھرم بھی باقی نہ رہ سکا۔ کسی نے بڑا تیر مارا تو بہاریا ساقی نامے کا اضافہ کرکے مرثیہ میں رنگ تغزل کو شامل کر دیا۔ حالانکہ رزمیے میں ایسے موقعے پر جب کہ حریف مقابلے کے لئے ہتھیار سنبھالے کھڑے ہوں اور ایک دوسرے کو تہہ تیغ کرنے پر تلا ہوا ہو، ساقی نامہ بری طرح کھٹکتا ہے اور کبھی کبھی تو اس کی وجہ سے رزم کا سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے کیونکہ اس سے مرثیے کا عمل (ACTION) بری طرح متاثر ہونے لگتا ہے۔ گو کہ اس زوال کے دور میں بھی پیارے صاحب رشیدؔ نے جو میر انیسؔ کے نواسے، میر عشقؔ کے پوتے اور تعشقؔ کے بھتیجے تھے، اور ان کے شانہ بشانہ، علی محمد عارفؔ نے جو میر نفیسؔ کے نواسے تھے اور پھر دولھا صاحب عروجؔ اور مرزا طاہر رفیعؔ نے جو علی الترتیب میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے پوتے تھے، مرثیے کو اپنی پوری طاقت صرف کرکے سنبھالا، اور ان کا سہارا پاکر مرثیہ کے انحطاط کی رفتار کسی قدر سست پڑ گئی۔ مگر کسی قسم کا اضافہ یا ترقی نہ ہو سکی۔

اسی زمانے میں عارفؔ صاحب کے مقابلے پر ایک نئے شاعر میر نواب علی قدیمؔ، جو میر انیسؔ کے صاحبزادے میر سلیسؔ کے فرزند تھے، اچانک مرثیہ گو کی حیثیت سے منظر عام پر آتے اور لکھنؤ کی فضا پر چھا گئے۔ چند ہی سال میں ان کا طوطی بولنے لگا اور ان کے مرثیوں کی دھوم

مچ گئی۔ انہوں نے بہار کہی تو اس طرح :

وہ لال لال بھبھوکا سے ارغوانی پھول　　نظر کا زور بڑھاتے ہیں آسمانی پھول

ہنسائے دیتے ہیں غنچوں کو زعفرانی پھول　　سفید ہو گیا سبزہ کھلے جو دھانی پھول

نظر اٹھا کے جو دیکھو تو نشہ چھا جائے

نسیم پاس سے گذرے تو لڑکھڑا جائے

ان کے ساقی نامہ کی بھی بیت سنیے اور سر دھنیے :

آنکھ جو مجھ سے ملائے وہ شرابی ہو جائے

صاف پانی کو جو دیکھوں تو گلابی ہو جائے

——غرض قدیم کے مرثیوں نے پورے شہر میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ جب وہ نیا مرثیہ پڑھتے تو پورا شہر امڈ آتا یہ اور بات ہے کہ جلد ہی یہ حقیقت بھی عالم آشکارا ہو گئی کہ :

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں[1]

---

[1] اس سلسلے میں میں نے لکھنؤ کے بعض بزرگوں سے یہ روایت سنی ہے کہ لکھنؤ میں فرنگی محل کے پل پر واقع پولیس چوکی سے ملحق امام باڑے میں علی محمد عارف مرحوم اپنا نو تصنیف مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ مرثیہ خوانی کے دوران کچھ نوجوان جو غالباً مدرسۂ ناظمیہ عربیہ لکھنؤ کے طالب علم تھے مرثیہ سننے کی بجائے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ عارف صاحب کو یہ بات ناگوار گذری۔ وہ آداب محفل کے خلاف کوئی غلط بات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے فوراً ان نوجوانوں کو ٹوک دیا۔ یہ نوجوان اس وقت تو خاموش ہو گئے لیکن چند ہی روز کے بعد عارف صاحب سے انتقام لینے کے لئے انھیں کے خاندان کے ایک گمنام شخص میر نواب علی قدیم کو ان کے حریف کی حیثیت سے میدان میں لائے۔ ان بزرگوں کے قول کے مطابق "میر قدیم جو مرثیہ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نواب علی قدیم کی مرثیہ نگاری کا ردعمل یہ ہوا کہ مرثیہ گویوں میں پھر ایک نئی لہر دوڑ گئی اور دوسرے شعرا بھی زیادہ محنت کرنے لگے۔

۱۹۱۶ یا ۱۹۱۵ء میں علی محمد صاحب عارف کا اچانک انتقال ہو گیا۔ وہ حکیم مجتن صاحب کی سالانہ مجلس پڑھنے جا رہے تھے کہ راستے میں ان پر دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ عارف صاحب کے انتقال کے بعد، یہ نزلہ پیارے صاحب رشید پر گرنا شروع ہوا۔ وہ اس صورت حال سے اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ انھوں نے بھی اپنے نانا میر انیس کی طرح کچھ عرصہ کے لیے لکھنؤ میں مرثیہ خوانی ترک کر دی، یہاں تک کہ رحلت فرما گئے۔ ان حقائق کے ذکر سے میرا مقصد کسی تنقیص نہیں، بلکہ غرض یہ ہے کہ ان حقائق کو، جو اب بھی لوگوں کی زبانوں پر تو ہیں، مگر ضبط تحریر میں نہیں آئے محفوظ کر دوں، ممکن ہے ان سے ادب کے کسی طالب علم یا نقاد کو کوئی مدد مل سکے۔

جہاں تک دولھا صاحب عروج کا تعلق ہے وہ بڑے باپ کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) پڑھتے تھے وہ اس دور کے تین باکمال اور ذی علم شاعر۔ علی میاں کامل، خطیب اعظم جناب سبط حسن صاحب اور مولانا ناظم حسین صاحب ناظم کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہوتا تھا۔ اس بیان میں کتنی صداقت ہے اس کا علم تو اللہ تعالیٰ کو ہوگا البتہ یہ حقیقت ہے کہ مذکورہ بالا بزرگوں کے انتقال کے بعد سے نواب علی قدیم نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی ترک کر دی تھی۔ نیز یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ علی میاں کامل اور علی محمد صاحب عارف کے درمیان شاعرانہ چشمک نے اتنا طول کھینچا تھا کہ عارف صاحب نے اپنے ایک مرثیہ کے چہرے میں نام لیے بغیر علی میاں کامل کی شاعری اور شاعرانہ صلاحیتوں پر سخت تنقید کی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ حسین عظمی

بیٹے اور بڑے دادا کے پوتے تھے۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا بیان کرنے کے لیے صرف درج ذیل چند مصرعے ہی کافی ہیں:

نام مردوں کا رقم باڑھ پہ تلوار کی ہے

تلوار کاٹتی ہے مگر ہاتھ چاہیئے

لشکر بڑھا کر لوہے کی دیواریں کھنچ گئیں
ہنگامہ گرم ہو گیا تلواریں کھنچ گئیں

خاک پر گرتے تھے دنیا سے گذرنے کے لیے
طرفہ لذت تھی کہ تڑپا کیے مرنے کے لیے

اس میں شک نہیں کہ دولھا صاحب عروج کی طبیعت میں بڑی اپچ تھی، لیکن ساتھ ہی ساتھ لاابالی پن بھی بہت تھا اس لئے انہوں نے اس فن پر اتنی توجہ نہیں دی جتنی دینا چاہیے تھی۔ پھر بھی جو کچھ کہا وہ ان کے کمال فن کا بین ثبوت ہے۔ آخر کار وہ بھی غالباً ۳۰-۱۹۲۹ میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اور اب لکھنؤ کے خاندانی بزرگوں میں صرف محمد طاہر رفیع اور سید صاحب مودب رہ گئے، جو مرثیہ تو بہترین کہتے تھے مگر اسلاف کی حدبندیوں سے باہر قدم رکھنے کے قائل نہ تھے۔ یہ حالات تھے جب نسیم امروہوی نے میدان مرثیہ گوئی میں قدم رکھا تھا۔ اس وقت اردو مرثیے کا زوال اپنے عروج پر تھا۔ مذکورہ بالا اشاروں سے یہ اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں کہ جب لکھنؤ میں مرثیے کا یہ عالم تھا جو اس فن شریف کا مرکز اور سرچشمہ تھا تو دوسرے

علاقوں میں کیا حالت ہوگی۔ اور جب یہاں کے وہ بزرگ بھی جن میں سے بعض کو "ادبی مجتہد" کی حیثیت حاصل تھی، پرانی ڈگر سے سرمو ہٹنا، مسلک ادب میں "کفر اور شرک" تصور کرتے تھے تو بیرون لکھنؤ کے شعرا، جو اساتذہ لکھنؤ کا تتبع کرنا باعث فخر سمجھتے تھے، ان میں سے کس میں اتنی جرات و ہمت ہوتی کہ وہ قدیم مسلک کو خیرباد کہے اور کسی نئی راہ پر گامزن ہو کے قبولیت عام کی سند حاصل کرے۔ لیکن وقت اور زمانے کے پاؤں میں زنجیر کس نے ڈالی ہے۔ ہم تبدیلیوں کو پسند کریں یا نہ کریں، ان تبدیلیوں کے لیے ذہنی طور پر آمادہ ہوں یا نہ ہوں، تبدیلیاں آکر رہتی ہیں۔ اردو مرثیہ بھی فطرت کے اس قانون سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ اس میں بھی تبدیلیاں آنا ناگزیر تھیں جو آکر رہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جو تبدیلیاں پہلے آنا چاہیے تھیں کچھ دیر سے آئیں۔ مگر آئیں ضرور۔

اس پس منظر میں تغیر پسندانہ عناصر کے ساتھ نسیم امروہوی کی مرثیہ گوئی کا آغاز اور وہ بھی صرف پندرہ سال کی عمر میں بہت لوگوں کے لیے یقیناً حیرت انگیز ہوگا، کیونکہ مرثیہ نگاری کے لیے محض ناظم و شاعر ہونا کافی نہیں بلکہ بالغ نظری بھی درکار ہوتی ہے جو اس عمر میں شاذ و نادر ہی کسی کے حصے میں آتی ہے۔ علاوہ بریں ایک کامیاب اور اچھے مرثیہ گو شاعر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ زبان و ادب میں دستگاہ کامل رکھتا ہو، اور وہ اسلامی تاریخ، حضور صلعم اور اہل بیت علیہم السلام کے سوانح، قرآن پاک، حدیث شریف، تفسیر و فقہ، عروض، بیان، بدیع اور فارسی و عربی زبانوں سے اچھی طرح واقف ہو، جس کی توقع آج کل کے معیار کے مطابق ایک پندرہ سالہ نوجوان سے نہیں کی جا سکتی لیکن نسیم امروہوی

اس سلسلے میں بڑے خوش نصیب ہیں کہ انہوں نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں ان تمام علوم کا چرچا مدت سے تھا۔ ان کے قریبی اعزہ میں حضرت نجم الملت، سمیت بیک وقت تین مجتہد تھے ان کے دادا حضرت شمیم امروہوی خود عالم فاضل اور اپنے دور کے بڑے مرثیہ گو شاعر تھے، پر دادا سید حیدر حسین یکتا بھی امروہہ کے خوش فکر شاعر اور ممتاز علماء و فضلا میں شمار کئے جاتے تھے، جن خواتین کی آغوش میں نسیم امروہوی کی پرورش ہوئی (خصوصاً والدہ اور پھوپی) وہ بھی تعلیم یافتہ، مرثیہ خواں اور شاعرہ تھیں۔ خاندان کے بیشتر افراد ذی علم تھے اور ہیں، اس لیے انہوں نے بزرگوں کی توجہ اور تربیت، غیر معمولی ذاتی شوق اور مسلسل کوشش کے ذریعہ بہت کم سنی میں متعدد علوم میں مہارت حاصل کرلی۔ انہوں نے تیرہ برس کی عمر میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی، اور اس کے بعد چودہ اور پندرہ برس کی عمر میں الہ آباد بورڈ سے منشی اور مولوی کے امتحانات پاس کرلئے تھے، جن کے نصاب میں ادبیات اور فارسی و عربی کی اہم کتابوں کے علاوہ منطق، اور علم کلام وغیرہ کی کتابیں بھی شامل تھیں۔ اس لیے اگر کم عمری میں علوم متداولہ حاصل کرنے کے بعد انھوں نے مرثیہ گوئی کے میدان میں اعتماد کے ساتھ قدم رکھا تو چنداں تعجب کی بات نہیں۔ البتہ یہ بات واقعی قابل حیرت ہے کہ ۱۹۲۳ میں جب انھوں نے پہلا مرثیہ کہا تھا اس وقت سے انھوں نے مرثیہ کو نئے رنگ میں ڈھالنے کی ضرورت کا احساس کرلیا تھا۔ اور اپنے پہلے ہی مرثیہ میں جس کا مطلع ہے:

تجھ میں اے باغ وطن اب گل خوش رنگ نہیں

—— اس امر عظیم کی جانب پہلا قدم بڑھایا تھا۔

مذکورہ بالا مرثیہ ۹۶ بند پر مشتمل ہے لیکن اس کے ابتدائی ۲۷ بند

نئے تصورات اور رجحانات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان ۲۷ بندوں میں مولانا حالی کے شہرہ آفاق مسدس "مدو جزر اسلام" اور علامہ اقبال کے مشہور مسدس "شکوہ اور جواب شکوہ" کا اثر قبول کرنے کی جھلکیاں ملتی ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نسیم امروہوی نے مذکورہ بالا مسدسوں سے متاثر ہو کر یا ردِ عمل کے طور پر اردو مرثیہ کو اسی قالب میں ڈھالنے کی پہلی کوشش کی تھی۔ بہر حال یہ اردو مرثیہ میں پہلی آواز اور پہلا تجربہ تھا اس سے پہلے یہ انداز کسی دوسرے مرثیے میں نہیں ملتا۔ اور ملتا بھی کیسے قدیم یا کلاسیکی مرثیے کے پرستاران موضوعات کو مرثیے کے حدود سے خارج سمجھتے تھے۔

اس مرثیہ پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قوم کی بے عملی، بے حسی، محنت و مشقت سے جی چرانے اور حسب و نسب پر بے جا افتخار، پدرم سلطان بود، والی ذہنیت سے شاعر کو سخت ذہنی اذیت اور روحانی تکلیف ہے اس لئے اس نے ان رجحانات پر نکتہ چینی ہی سے اپنے مرثیہ کا آغاز کیا ہے:

تجھ میں اے باغ وطن اب گل خوش رنگ نہیں
کس روش پر گل و بلبل میں یہاں جنگ نہیں
تن پہ کس غنچے کے ہستی کی قبا تنگ نہیں
طنطنے ہیں وہی ماضی کے، وہ اورنگ نہیں
آنکھ با وصف تکدر جدھر اٹھ جاتی ہے
فقر کی شاہی بے ملک نظر آتی ہے
ہائے کیسی یہ ہوا میرے گلستاں میں چلی
کوئی بے داغ شگوفہ ہے، نہ گل ہے نہ کلی

ہر طرف بے عملی، بے عملی، بے عملی
دھوپ بھی سرد مزاجی کے ہے سانچے میں ڈھلی

تھا جو سرمایۂ اسلاف وہ سب کام آیا
آفتاب آج ریاست کا لب بام آیا

میں ہوں یا اور جوانان فہیم و عاقل
علم و فن کے ہیں نہ طالب نہ ہنر پہ مائل
سب کے سب کسب معیشت کی طرف سے غافل
ہیں فقط ایک فن بے ہنری میں کامل

جور گردوں کے ستائے ہوئے فریادی ہیں
یہ وہ مظلوم ہیں جو عدل[1] کی اولادیں ہیں

پختہ کاروں کے سنے کوئی خیالات یہ خام
دستکاری کو، تجارت کو سمجھتے ہیں حرام
کوئی پوچھے جو سبب، کہتے ہیں یہ برسر عام
شان سادات کے شایاں نہیں ادنیٰ یہ کام

جیتے جی اب تو یہ آثار ہیں سب مرنے کے
فاقے کرلیں گے مگر کام نہیں کرنے کے

—— انھوں نے صرف قوم کی بے عملی کا ماتم ہی نہیں کیا ہے بلکہ انبیائے کرام و ائمۂ اطہار علیہم السلام کی محنت و مشقت کی مثالیں دے کر قوم کو عمل پر اکسانے کی کوشش بھی کی ہے۔

---

[1] میر عدل عہد اکبری میں سندھ کے قاضی القضاۃ تھے۔

ان بزرگوں کو یہ سمجھائے کوئی غیرت دار
جو بھی فن شرع کی حد میں ہو نہیں موجب عار
جد ہمارے جو براہیمؑ نہ ہوتے معمار
کون پھر خانۂ کعبہ کی اٹھاتا دیوار
ہیزم خشک کلیمؑ صمدی چنتے تھے
نوحؑ نجار تھے، داؤدؑ زرہ بنتے تھے
دور کیوں جاؤ چلو احمدؐ مختار کے گھر
آب پاشی کا کیا کام علیؓ نے دن بھر
جَو، جو اجرت میں ملے، گھر میں وہ لائے حیدرؓ
فاطمہؓ نے انھیں کس شوق سے پیسا اٹھ کر
حیف شرم آئے ہمیں محنت و مزدوری سے
آشیا فخر کریں جس پہ وہ چکی پیسے

—— یہ مثالیں دینے کے بعد شاعر نے مستقبل میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کھلے الفاظ میں انتباہ کر دیا ہے کہ قدامت پر تجدد غلبہ حاصل کر کے رہے گا۔ انھوں نے ایک حقیقت پسند شاعر کی حیثیت سے ان تبدیلیوں کو "سحر" سے تعبیر کرتے ہوئے ان کا خیر مقدم کیا ہے:

عالم نزع میں ہے ماضی و حاضر کا نظام
زیر شمشیر تڑپتی ہوئی دنیا کو سلام
دامن کلفت و غم میں ہے دوامی آرام
شب تاریک کے ہونٹوں پہ سحر کا ہے پیام
روح کو خواب سے بیدار کریں گے ہم بھی
عزم، اور عزم علمدار کریں گے ہم بھی

— اس کے بعد انہوں نے نوجوانوں کی حوصلا فزائی کرتے ہوئے واقعات کربلا سے سبق حاصل کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

۲۷ بند تک اس مرثیہ کا لہجہ ایک معاشرتی اور اصلاحی مسدس سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن ۲۷ بند کے بعد سے باقی پورا مرثیہ اسلاف کے وضع کیے ہوئے اجزا پر مشتمل اور اسی رنگ میں ہے، البتہ اسلوب بیان میں جا بجا جدت اور ندرت نظر آتی ہے۔ اگر مرثیہ سے ان ۲۷ بندوں کو علیحدہ کر دیا جائے تو کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ کسی ایسے شاعر کا ہے جو قدما کی مرثیہ گوئی سے بغاوت پر آمادہ ہے، اس حصے میں مرثیے کی تمام خصوصیات کو نہایت سلیقے سے برتا ہے۔ چہرہ، بہار، گرمی کی شدت، ساقی نامہ، رجز، تلوار کی تعریف، قتال و جدال، فوج اعدا کی ابتری، شہادت اور روایت وغیرہ۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ نسیم امروہوی کا یہ بالکل پہلا مرثیہ ہے مگر اس کی بندشوں میں بڑی حد تک پختگی ہے اور ان کا رنگ صاف جھلکتا ہے:

صبح کا منظر:

آئی گلشن میں لہکتی جو نسیم سحری
پھول پھولے نہ سمائے ہوئی ہر شاخ ہری
چاندنی اٹھی تو غنچوں نے کیا فرش زری
نور پھیلا کوئی چمکا جو عقیق شجری
شجر طور کا ہر نخل میں جلوا دیکھا
دور سے چھپ کے ستاروں نے تماشا دیکھا

گرمی کی شدت:

وہ حرارت تھی کہ شاخوں پہ ثمر جلنے لگے
آگ کے پھول تھے جن میں وہ شجر جلنے لگے
بلبلیں پھول کے پاس آئیں تو پر جلنے لگے
پڑ گیا پاؤں جو ریتی پہ تو سر جلنے لگے
جل کے دامن میں پہاڑوں کے حجر لال ہوئے
چشمے سوکھے ہوئے سب دیدۂ دجال ہوئے

مذکورہ چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے مرثیہ کو معاشرتی اصلاح کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ مرثیے کی قدیم روایات کی بھی سختی سے پابندی کی ہے۔

ایک مرتبہ میں نے جناب نسیم امروہوی سے محولہ بالا مرثیہ کے دونوں حصوں میں اس واضح اور نمایاں فرق کی وجہ پوچھی تو انھوں نے اس کی یہ وضاحت کی تھی کہ میں شروع ہی سے مرثیہ کو زمانے کی ضروریات اور تقاضوں کا ترجمان بنانے کا خواہاں تھا لیکن میں نے جس وقت پہلا مرثیہ کہا اس وقت ماحول کچھ ایسا تھا کہ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ اگر پورا مرثیہ اسی انداز پر کہا تو یقیناً سامعین اسے پسند نہیں کریں گے۔ اور میری مجلسوں سے گریز کرنے لگیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو انقلاب ذہنیت میرا نصب العین ہے اس میں مجھے کامیابی نہیں ہو سکے گی' ذہنیت ایک دم سے نہیں بدلتی۔ اور برسوں کے نقوش یکایک نہیں مٹتے' ایسی تبدیلیوں کی تحریکیں لوگوں کے دلوں میں جگہ پیدا کرنے کے بعد ہی کی جا سکتی ہیں' اس لیے میں نے نفسیاتی اعتبار سے یہ مناسب سمجھا کہ پہلے صرف چند بند نئے طرز میں کہوں اور باقی مرثیہ روایتی انداز میں۔ تجربے نے میرے خدشات کو صحیح ثابت کیا! جب میں نے پہلا مرثیہ

اپنے وطن مالوف "امروہہ" میں پڑھا تو اس کے ابتدائی ۲۷ بند پر سوائے چند تعلیمیافتہ نوجوانوں کے عام لوگوں نے خاطر خواہ توجہ نہیں کی البتہ جب میں مرثیہ کے مطلع ثانی:

رُخ سے آنچل جو ہٹانے لگی سلمائے سحر

— پر پہنچا تو داد تحسین کی آوازوں نے عزاخانہ کو سر پر اٹھا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ایک عرصہ تک (تقریباً سترہ اٹھارہ سال) ہر مرثیہ کا ابتدائی حصہ یا درمیان میں چند بند اس انداز کے کہتا اور باقی پرانے انداز میں۔ کیونکہ میں جانتا اور سمجھتا تھا کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا' اور جب تک' دوسرے شعرا میری ہمنوائی نہ کرنے لگے میں اسی روش پر گامزن رہا۔

نسیم امروہوی کی مرثیہ نگاری کے چند منفرد اور ممتاز پہلو

نسیم امروہوی کے مراثی کا وسیع اور عمیق مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے قدیم مرثیے کے روایتی انداز کو برقرار رکھتے ہوئے متعدد نئے تجربات کئے ہیں جن کی وجہ سے مرثیہ گوئی کے دامن کو بڑی وسعت ملی ہے۔

جیسا کہ شروع میں سپرد قلم کیا جا چکا ہے۔ مرثیہ گوئی کا بنیادی مقصد رثا' تھا' اس لیے مرثیہ گو حضرات اسلاف کے کھینچے ہوئے دائرے سے قدم باہر نہیں رکھتے تھے اور مرثیے کو رزمیہ اور رثائی نظم تک محدود سمجھتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ وہ مرثیے کے چہرے میں نیرنگی روزگار' شاعرانہ تعلّی اور افتخار' اہل علم و ہنر کی ناقدری اور سفلہ پروری اور اسی قسم کی دوسری باتیں نظم کرکے' اپنے مضمون کو واقعات کربلا سے مربوط کر دیتے' یا پھر بغیر کسی چہرے کے اہل بیت اطہار کی سیرت' اقدام حسینی کی اہمیت و افادیت (جو بیشتر شفاعت

امت تک محدود تھی)، یزیدی فوج کے مظالم، فوجوں کی کثرت، گرمی کی شدت، جدال وقتال، شہادت اور شہادت کے بعد یا پہلے پیش آنے والے واقعات کو نظم کرتے تھے اور مرثیہ کا کم از کم ایک تہائی حصہ مصائب پر مشتمل ہوتا تھا۔ سامعین بھی اسی غرض سے ان کی مجالس میں جاتے تھے کہ فضائل سن کر ایمان تازہ ہو اور مصائب پر چار آنسو بہا لیں، مرثیے کے اس مقصد کو برقرار رکھتے ہوئے نسیم امروہوی نے اس سے اصلاح معاشرت کا بھی کام لینے کی کوشش کی، لیکن انھوں نے ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ اگر اسلاف کے رچے بسے رنگ سخن اور مرثیے کے جانے پہچانے مزاج میں کسی قسم کی اکھاڑ پچھاڑ کی گئی تو اس طرح وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس سلسلے کی سب سے پہلی اور اہم بات جو نسیم امروہوی کے انقلابی شعور، اور انسانی نفسیات میں رسوخ پیدا کر کے طبائع اور مزاج کو متاثر کرنے کی صلاحیت کی جانب ہماری رہنمائی کرتی ہے، یہ ہے کہ وہ مرثیے میں داخلی اور خارجی انقلابی تبدیلیاں لانے کی تحریک شروع کرنے سے پہلے اپنے سامعین وقارئین کے ذہنوں میں یہ حقیقت راسخ کرنا چاہتے ہیں کہ مجالس عزا، جن میں یہ مرثیے پڑھے اور سنے جاتے ہیں، ان کے انعقاد کا مقصد صرف وہی نہیں جو اب تک سمجھا یا سمجھایا گیا ہے یعنی صرف "بکاء علی الحسین" بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ اصلی اور بنیادی غرض کچھ اور بھی ہے:

مرکزی عزم ہے اعمال میں سرگرمی کا
اک وسیلہ ہے بکا دل کے لیے نرمی کا

— وہ صدہا سال کے اس عقیدے کو جو لوگوں کے دلوں میں گھر کر چکا تھا کہ مجلس کی غرض وغایت محض بکا ہے، سنگ انقلاب سے یکایک چکنا چور کرنے یا مجروح

کرنے کے قائل نہیں بلکہ اس کے لیے طرح طرح سے فضا ہموار کرتے ہیں:

رونے والے غم شبیر میں جی کھول کے رو
دل کو میزان محبت میں مگر تول کے رو

دامنِ جامۂ عرفاں میں اگر جھول نہیں
رونے والے کے پھر اشکوں کا کوئی مول نہیں

جن کے آنسو شرفِ خونِ وفا جانتے ہیں
حق تو یہ ہے کہ وہی حق کو بھی پہچانتے ہیں

حدیث، "من بکیٰ علی الحسین " کی حقانیت کو تسلیم کرتے ہوئے وہ اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

اس روایت کی وضاحت ہو اگر مدِ نظر
ترجمہ یہ ہے کہ جو روئے رلائے دم بھر
یا شریک غم سرور ہو بہ قلبِ مضطر
ہے یہ واجب کہ ہوں وا اس کے لیے خلد کے در
مگر اس وقت کہ حق شاہ کا پہچان بھی لے
روکے جس کے لیے دے جان اسے جان بھی لے

یوں تو رونے کو عدو کھینچ کے خنجر روئے
رونا اُن کا ہے کہ جو سوچ سمجھ کر روئے

انھوں نے "گریۂ محض" اور بامقصد گریۂ "شہادت آشنا" کا فرق بیان

کرتے وقت طعن و تشنیع سے کام نہیں لیا اور نہ اشتعالی لب و لہجہ اختیار کیا، بلکہ حقائق کو بڑے دل نشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ دراصل رفتہ رفتہ یہ نکتہ سامعین کے دل نشیں کرنا چاہتے ہیں کہ جب تک مظلوم کی معرفت نہ ہو، محض ایک مصیبت زدہ خیال کرکے رونا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ انسان کے پہلو میں اگر پتھر نہیں، دل ہے تو کسی کی بھی مصیبت کا حال سن کر اس کا دل ضرور پسیجے گا۔ ہزاروں افراد فرضی کرداروں کا حال پڑھ کر بے اختیار آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں حالانکہ وہ، یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ سارے واقعات اور افراد ناول یا قصہ کے مصائب کی داستان مصنف کے خلاق ذہن کا کرشمہ ہے۔ نسیم امروہوی سمجھتے ہیں کہ جسے مظلوم کی معرفت ہوگی، وہی اس کی تاسی کرے گا اور جو تاسی کرے گا وہی دنیا و آخرت میں صلاح و فلاح کی دولتوں سے مالا مال ہوگا، ترقی بھی پائے گا اور نجات بھی۔ وہ غالباً اسی مقصد کے تحت یعنی مرثیہ کو سامعین کے مفید مطلب بنانے کی غرض سے، مرثیہ گوئی میں انقلاب لانا چاہتے تھے اور چاہتے ہیں۔ وہ انسانی نفسیات کے مزاج شناس ہونے کی وجہ سے اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہیں کہ جب تک اس ذہنیت کو جو کئی صدی کی مسلسل تبلیغ و تلقین سے استحکام پا چکی ہے، نہ بدلا جائے گا اس وقت تک مرثیہ گوئی میں انقلاب کا تصور ایک خیال خام ہوگا اور اس سے ٹھوس نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔ اور اگر کوئی ایسے راسخ العقیدہ مجمع سے اپنی نافہمی یا کم فہمی کی بنا پر "انقلاب" کی بات کرے گا تو وہ بات ضائع جائے گی اور لوگ اسے سننے ہی سے احتراز کرنے لگیں گے۔ انسانی تاریخ شاہد ہے کہ جن لوگوں نے ذہنی انقلاب لانے سے پہلے جو بھی انقلابی اقدام کیا وہ زیادہ تر ناکام رہے، کیونکہ لوگوں کو ان تبدیلیوں کے لئے جن سے خود ان کی زندگیاں سنور جاتیں ذہنی طور پر تیار نہیں کیا گیا تھا، اس لئے عملی طور پر

ہر انقلابی اقدام کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ لوگوں کے ذہنوں کی صحیح خطوط پر تربیت کی جائے۔ یہی صورت حال مرثیہ گوئی میں انقلاب لانے کی بھی تھی، کیونکہ سامعین کی نظر میں مجلس کا جو مقصد متعین ہے اس مقصد کو فوت کرنے والی کسی چیز کو وہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتے، غالباً اسی وجہ سے نسیم امروہوی کی نظر میں یہ بات مرثیہ گوئی سے مقدم ٹھہری کہ صادقِ آل محمدؐ نے مجلس کے انعقاد کا جو مقصد حدیث "من بکیٰ" میں بتایا ہے اور جواب تک ادھورا منظر عام پر لایا جا رہا ہے:

زورِ تقریر سے جلسوں کو ہلا دیتے ہیں
شرطِ عرفاں کو روایت میں بھلا دیتے ہیں

—— اس پورے مقصد کو یعنی "بکا" بشرطِ عرفانِ امامؑ کو بار بار دہرایا جائے تاکہ ذہنوں میں اول مجلس کی صحیح غرض و غایت متعین ہو جائے، پھر اس کے بعد مرثیہ میں اس کی اساسی عقیدت کے تحت جو انقلاب لایا جائے گا وہ مقبول خاص و عام بھی ہوگا اور اس سے وہ دنیاوی اور دینی فوائد بھی پہنچیں گے جو کسی ترقی پسند قوم کو اس کے صالح ادب سے پہنچ سکتے ہیں۔

نسیم امروہوی جب اس صائب نظریے کے پیش نظر معرفت امام کے تقدم کا نکتہ اچھی طرح سامعین و قارئین کلام کے ذہن نشین کر چکے تو اب اخلاقی جسارت سے کام لے کر انھوں نے مجلس اور مرثیہ گوئی کی تاریخ میں پہلی بار منبر سے ایک آوازِ بلند کی اور اس شد و مد اور دل نشینی کے ساتھ بلند کی کہ جس نے ان کا یہ پیغام سنا بقول غالب (بہ تغیر لفظ)

اُس نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

—— انھوں نے اپنے مشہور مرثیے "سازِ حریت"[1] میں ڈنکے کی چوٹ کہا تھا۔

---

[1] یہ مرثیہ انھوں نے ۱۹۳۶ء میں کہا تھا اور ادارہ اشاعت اردو نے ۱۹۳۶ء میں کتابی شکل میں شائع کیا تھا اس کا مقدمہ پنڈت برج ناتھ شرغا ایڈوکیٹ نے بزبان انگریزی تحریر کیا تھا اور تبصرہ جناب جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے لکھا تھا۔ (عظمی)

بپا جو کرتے ہو تم مجلسیں عزا کے لیے
اشاعتِ غمِ مظلومِ کربلا کے لیے
یہ صرف بہرِ بکا ہیں نہ واہ وا کے لیے
یہ مدرسہ بھی تو ہیں دینِ مصطفےٰؐ کے لیے
نہیں یہ بزم، ہدایت کا باب ہے گویا
حسینؑ علم و عمل کی کتاب ہے گویا

اب وہ وقت آیا کہ مرثیہ گوئی میں خارجی اور داخلی ہر قسم کا انقلاب لانے کے لیے راستے ہموار ہو گئے۔ مزاجوں میں مقصدِ مجلس کی روح سرایت کر گئی اور اذہان ہر ایسے انقلابی کلام کو جو اُن کے مقصد کی روشنی میں ہو سننے اور سمجھنے پر آمادہ ہو گئے۔ مرثیے میں جو بھی انقلاب آیا اُس میں اس پُر تاثیر آواز کی گونج شامل ہے جس نے انقلابی نعروں کو سننے اور قبول کرنے پر آمادگی کی ایک عام فضا پیدا کر دی، بالفاظِ دیگر جدید مرثیہ کے لیے راہ ہموار کر دی۔

بات اب جدید اور قدیم مرثیہ کی چھڑ گئی ہے تو مناسب ہو گا کہ اس موقع پر مرثیہ کے عناصر کا تعین کر لیا جائے۔ یوں تو مرثیہ کے بارے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے لیکن میرے خیال میں ماہرِ ادب و لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم نے ہیئت کے لحاظ سے مرثیے کی جو حدود متعین کی ہیں وہ بڑی جامع اور واضح ہیں اس لئے ہم ان کو بنیاد بنا کر آگے بڑھتے ہیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم نے "سنہ ۱۹۶۲ء کے چند جدید مرثیے" کے پیش لفظ میں تحریر کیا ہے:-

"مرثیہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں گریہ و زاری اور میّت کی محاسن شماری۔ ادب میں مرثیہ وہ نظم ہے جس میں کسی مرنے والے کے حالات و اوصاف دردناک

لہجے میں بیان کئے ہوں۔ مرثیے کے لیے کسی خاص بحر کی قید نہیں۔ اردو میں مرثیے کو قریب قریب ہر صنف نظم کا ظاہری لباس پہنایا گیا ہے۔ چنانچہ اساتذہ کے دواوین میں جو مرثیے ملتے ہیں ان کی ظاہری صورت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ البتہ "مرثیت" ایک قدر مشترک ہے جس سے کوئی مرثیہ خالی نہیں۔"

اردو میں شہدائے کربلا کے مرثیے کی نوعیت عام مرثیوں سے مختلف ہے۔ عہد بعہد گوناگوں تصرفات اور تبدیلیوں کے بعد تاثیر و تاثر کے خیال سے ارباب ذوق نے مرثیے کی کچھ حدود و قیود مقرر کی ہیں اور اب اسی کو مرثیہ کہا جاتا ہے جو ان حدود و قیود کا حامل ہو مثلاً :

(۱) مرثیہ مسدس کی صورت میں ہوگا۔ رثائی نظمیں جو مسدس نہیں ہوتیں انھیں سلام یا نوحہ کہیں گے۔

(۲) مرثیے کے ہر بند کی بیت میں قافیے کے بعد ردیف کا ہونا ضروری ہے۔

(۳) مرثیے کے مختلف اجزا میں اُن کے مفہوم کی مناسبت سے زبان استعمال کی جاتی ہے۔ مثلاً بیان اوصاف میں جزالت ہوتی ہے، رجز اور رزمیہ میں جلالت، بزم میں سوز و گداز، تذکرہ اخلاق میں عجز و نیاز، وغیرہ

(۴) مرثیے کے مضامین میں تسلسل برقرار رہنا ضروری ہے۔

(۵) مرثیہ عموماً حسب ذیل پانچ بحروں میں کہا جاتا ہے۔

(الف) ہزج مثمن اخرب مکفوف (مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ
فعولُن)

(ب) رمل مثمن مخبون محذوف مسکن (فاعِلاتن
فعلاتن، فعِلاتن فِعْلن)

(ج) مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف
(مفعولُ فاعلاتُ مفاعیلُ فاعِلن)

(د) مجتث مثمن محذوف مسکن (مفاعِلن فعِلاتن
مفاعِلن فِعْلن)

(ہ) متقارب سالم (فعُولن فعُولن فعُولن فعُولن)[1]

معنوی اعتبار سے شہدائے کربلا کے مرثیے میں "رزم و بزم"
کو مرکزیت حاصل ہے۔ سانحۂ کربلا کے یہی دو اجزا ہیں البتہ
اس کے محرکات و اسباب و توابع کو بھی مرثیے کی تمہید میں
یا کسی اور مناسب مقام پر رزم و بزم کی اہمیت برقرار
رکھتے ہوئے نظم کیا جا سکتا ہے۔"

— مرثیے کی یہ حدود بڑی حد تک جامع و مانع ہیں۔ اگر ان میں ردّ و بدل یا حذف و اضافے کی گنجائش تسلیم بھی کی جائے تو بڑی محدود ہوگی۔ قدیم مرثیوں میں ان حدود کی نہایت سختی سے پابندی کی گئی ہے۔ جدید مرثیوں میں ان میں سے

---

[1] اس کے علاوہ مرزا دبیر نے بحر رمل تین رکن سالم چوتھا رکن محذوف (فاعِلاتن فاعِلاتن فاعِلاتن فاعِلن) میں بھی ایک مرثیہ کہا ہے جو ان کی جلد میں محفوظ ہے۔

بعض حدود کی تو سختی سے پابندی کی گئی مثلاً مرثیہ مسدس کی شکل میں ہو، مرثیہ کے ہر بند کی بیت میں ردیف ہو، نیز محولہ بالا پانچ چھ بحروں ہی میں مرثیے کہے گئے۔ نیا تجربہ کسی نے نہیں کیا۔ میرے خیال میں کسی ایسے مسدس کو جو واقعات کربلا یا اس کے متعلقات کے متعلق ہو جدید مرثیہ اس وقت تک کہنا درست نہیں ہے جب تک اس میں ان حدود کی کماحقہ پابندی نہ کی گئی جو معنوی حیثیت سے مرثیے کے بنیادی اور لازمی عناصر ترکیبی ہیں۔ چونکہ ابھی تک نقادوں نے قدیم و جدید مرثیوں کے درمیان کوئی قطعی حد فاصل قائم نہیں کی ہے اس لئے بعض لوگ واقعات کربلا کے متعلق صرف ان مسدسوں کو مرثیہ تسلیم کرتے ہیں جن میں ACTION ہو، رزم و بزم و شہادت ہو، بالفاظ دیگر جنگ کا سماں ہو، مناظر قدرت ہوں، گرمی کی شدت ہو، رخصت ہو، رجز خوانیاں ہوں، قتال و جدال ہو، گھوڑے اور تلوار کی تعریف ہو، اور آخر میں شہادت اور یزیدی فوج کے مظالم کا تذکرہ اس انداز سے کیا جائے کہ سننے والا یا پڑھنے والا بے اختیار رو پڑے۔ اگر ان کے نزدیک کوئی مسدس مذکورہ بالا عناصر سے عاری ہے تو وہ مرثیہ کہلائے جانے کا مستحق نہیں۔ اس کے برعکس کچھ نقاد ہر اس مسدس کو جدید مرثیہ تسلیم کرنے کو تیار ہیں جن کا موضوع واقعات یا متعلقات کربلا یا آئمہ اطہار کی سیرت ہو خواہ اس میں مرثیے کے دوسرے عناصر ترکیبی ہوں یا نہ ہوں چونکہ ایک عرصہ سے واقعات کربلا یا آئمہ اطہار کے متعلق متعدد شعرا مسدس کی شکل میں اپنے تاثرات اور خیالات کو نظم کر رہے ہیں اس لئے ہر اس مسدس کو جدید مرثیہ کہا گیا جو قدیم روش سے مختلف تھا مگر واقعات کربلا کے متعلق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد شعرا کو جدید اردو مرثیہ کا بانی اور موجد قرار دیا جا رہا ہے اس لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے قدیم اور جدید مرثیے کے درمیان ایک واضح

خط فاصل قائم کر دیا جائے اور اُن کی واضح حدود متعین کر دی جائیں اور دونوں کے ایسے نمایاں اور ممتاز پہلو اور خد و خال اجاگر کر دیے جائیں کہ عام قاری بھی کسی مرثیہ پر طائرانہ نظر ڈالتے ہی یہ اندازہ کرے کہ زیر نظر مرثیہ جدید رنگ کا ہے یا قدیم رنگ کا۔

میرے خیال میں قدیم مرثیہ اور جدید مرثیہ میں فرق صرف اتنا ہی نہیں کہ قدیم مرثیہ میں رزم بھی ہوتی تھی اور جدید مرثیوں میں رزم خال خال نظر آتی ہے کیونکہ انیسؔ و دبیرؔ اور دوسرے اساتذہ نے ایسے بھی مرثیے نظم کئے ہیں جن میں رزم نام کو نہیں اس کے باوجود وہ مکمل مرثیے ہیں' اسی طرح متعدد جدید مرثیے ایسے ہیں جن میں قدیم مرثیوں کے تمام عناصر موجود ہیں اس کے باوجود وہ جدید مرثیہ کہے جانے کے مستحق ہیں۔ دراصل قدیم اور جدید مرثیوں میں دو واضح اور نمایاں فرق ہیں جو ایک دوسرے کا منطقی نتیجہ ہیں۔

(۱) قدیم مرثیہ واقعات کربلا کی تصویر کشی کرتا ہے۔ امام مظلوم اور اُن کے رفقائے کار کی دین حق کے تحفظ کی راہ میں غیر فانی قربانیاں' یزیدی فوج کی بربریت' امام حسینؑ اور اُن کے رفقا کی شہادت' خیموں کی تاراجی' اہل حرم کی اسیری' وغیرہ وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ جب واقعات کی تصویر کشی کرنا مقصود ہوگی تو پھر اس میں جدال و قتال کا حال نظم ہوگا۔ جدال و قتال کا حال نظم ہوگا تو پھر یہ بھی دکھانا پڑے گا کہ یزیدی فوج کی کثرت بھی تھی اور اس کو تمام سہولتیں اور جنگ سر کرنے کے لیے وسایل پوری پوری طرح حاصل تھے اور فوج حسینی ان سے محروم تھی۔ ظالم کے ظلم کو اجاگر کرنے اور حق پرستوں کی قربانیوں کی اہمیت واضح کرنے کے لئے پانی کی بندش' گرمی کی شدت' فوجوں کی کثرت'

رخصت، رجز، معرکہ آرائی اور اس ضمن میں تلوار اور گھوڑے کی خوبیوں کا تذکرہ، شہادت اور شہادت پر اہل حرم کے بین وغیرہ سب کا ذکر ضروری

اس کے برعکس چونکہ جدید مرثیہ صرف واقعات کربلا کی تصویر کشی نہیں کرتا بلکہ اُن کا تاریخی تجزیہ بھی کرتا ہے، اس معرکہ کے اسباب وعلل اور نتائج سے بھی بحث کرتا ہے، اس حقیقت کا بھی جائزہ لیتا ہے کہ کربلا کی جنگ میں امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کے اسلامی اور انسانی تاریخ پر کیا اثرات مرتب ہوئے، کربلا میں فوج حسینی کے قتل عام سے حسینی اقدام یزیدیت کے لیے موت کا پروانہ بنا یا اس سے ملوکیت، آمریت اور بادشاہت کی جڑیں مضبوط ہوئیں، واقعۂ کربلا کے بعد عالم اسلام اور عالم انسانیت کی ہمدردیاں کس کو نصیب ہوئیں۔ حسینیت کا بول بالا ہوا یا یزیدیت کا۔ نیز جدید مرثیہ واقعہ کربلا کے ضمن میں متعدد سیاسی، معاشی مسائل اور دینی و اخلاقی گوشوں کو بھی اجاگر کرتا ہے اور واقعات کربلا کے پس منظر میں معاشرے کو درپیش سماجی اور سیاسی مسائل کا ایک پائدار اور مبنی برحق حل پیش کرتا ہے، اور ان تمام باتوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ واضح کرتا ہے کہ کربلا کے میدان میں یزیدیت اور طاغوتی طاقتوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے للّہیت اور حسینیت کے مقابلے میں شکست فاش ہوگئی۔ اس جنگ سے دو۲ قسم کے نتائج برآمد ہوئے:

(۱) وقتی (۲) دیرپا۔

— وقتی نتیجہ کے طور پر یزید غالب رہا اور امام مظلوم کو جام شہادت نوش کرنا پڑا اور اُن کے اہل بیتؑ قیدی بنائے گئے، خیمے جلائے گئے بالفاظ دیگر یزید فاتح اور امام حسین مفتوح۔

— دیرپا نتیجے کے طور پر امام حسین کے اقدام کی اہمیت اور افادیت اور

حقانیت ساری دنیا پر روشن ہوگئی' اسلام کو مسخ کرنے یا آمریت اور شخصی حکومت کو اسلامی رنگ دینے کی یزیدی کوشش ناکام ہوگئی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسلام کی اصل روح محفوظ ہوگئی اور واقعۂ کربلا کے بعد جو واقعات رونما ہوئے اُن کی وجہ سے حسینی کردار کی عظمت' اہمیت اور افادیت ساری دنیا پر روشن ہوگئی اور گھر گھر اور قریہ قریہ عظمتِ حسینی کے ڈنکے بجنے لگے اور:

حقا کہ بنائے لا الہٰ است حسین

— کا غلغلہ چار دانگ عالم میں بلند ہوا اس کے برعکس یزید اور یزیدیت رسوائے جہاں ہوگئی حتیٰ کہ ظالم سے ظالم شخص بھی یزید کو "اپنانے" اور اس کے اقدامات کو سراہنے کے لئے تیار نہیں' اس سے بڑھ کر ظالم کی اور کیا رسوائی ہوگی کہ بقول جوش:

نامِ یزید داخلِ دشنام ہوگیا

(۲) جدید اور قدیم مرثیے میں دوسرا بنیادی فرق جو پہلے فرق کا منطقی نتیجہ ہے' یہ ہے کہ قدیم مرثیے میں امام مظلوم کا کردار ایک مفتوح مظلوم کا ہے اور یزید کا کردار ایک ظالم فاتح کا اور جدید مرثیے میں امام حسین کا کردار ایک مظلوم فاتح اور یزید کا کردار ظالم مفتوح کا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ جدید مرثیہ کا وجود کسی فردِ واحد کے ذہن کی اختراع ہے یا تاریخی ارتقا اور حالات کے تقاضوں کا نتیجہ؟

تو میری رائے میں "قدیم مرثیے کی روح میں انقلابی تبدیلی" اور اس سے "جدید مرثیہ" کا ظہور وقت کا اہم تقاضا بھی تھا اور تاریخی ارتقا کا نتیجہ بھی۔ اگر مرثیہ جدید رنگ میں سامنے نہ آتا تو آپ یقین کیجئے کہ وہ وقت بہت جلد قریب آجاتا جب مرثیہ کا ذکر تاریخ ادب کی صرف کتابوں میں ملتا۔ قدیم مرثیے کتب

خانوں میں مل جاتے یا ایک آدھ مطبوعہ جلد بازار میں بھی مل جاتی لیکن مرثیہ گوئی کے نئے تجربے عملاً ناپید ہو جاتے۔

اگر ہم اس حقیقت پر غور کریں کہ لوگوں کے دلوں میں مرثیہ کو نئے رنگ میں ڈھالنے کا خیال کیوں آیا تو ہم اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ قدیم رنگ کے مرثیہ گوئے حالات کے تقاضوں اور نئی نسل کی افتادِ طبع اور ذہنی و نفسیاتی کیفیتوں سے نابلد تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ سامعین اور قارئین میں قدیم رنگ کے نئے مرثیے غیر مقبول ہوتے جا رہے تھے۔ اس بڑھتی ہوئی غیر مقبولیت کی کئی وجوہ تھیں۔

(۱) انیسؔ و دبیرؔ نے مرثیہ کو اس بلندی پر پہنچا دیا تھا کہ اس دور کے شعرا اُن کے قریب سے گذرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے اور چونکہ بیشتر قارئین اور سامعین کے پیش نظر انیس و دبیر اور اُن کے جانشین نفیسؔ، وحیدؔ اور اوجؔ وغیرہ کے مراثی موجود تھے، مجالس میں مرثیہ خواں حضرات ان ہی بزرگوں کے مراثی پڑھتے تھے اس لئے سامعین و قارئین کو ان مراثی کے مقابلے میں قدیم رنگ کے نو تصنیف مرثیے پھیکے معلوم تھے یہی وجہ تھی کہ اس دور میں قدیم رنگ کے مرثیہ گو شعرا کی کاوشیں عوام سے خراجِ تحسین حاصل نہ کر سکیں۔

(۲) قدیم رنگ کے نئے مرثیہ گو اور سامع و قاری کے درمیان ذہنی ہم آہنگی اور ذہنی رابطہ برقرار نہیں رہا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ برطانوی حکومت کی عملداری کے بعد سے مسلمانوں میں انگریزی زبان اور علوم و فنون کے حصول کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی کیونکہ انگریزی زبان سرکاری اور دفتری زبان تھی۔ انگریزی تعلیم حاصل کئے بغیر اس دور میں اچھے مناصب یا باعزت ذریعۂ معاش حاصل کرنا دشوار ہوتا جا رہا تھا، اس لیے انگریزی تعلیم نے زور پکڑنا شروع کیا۔ اس رجحان کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی علوم،

اور السنہ (فارسی و عربی) کی طرف سے لوگ بے اعتنائی برتنے لگے اور رفتہ رفتہ وہ منزل آگئی کہ متوسط طبقے کی اکثریت بھی مشرقی علوم، ادبیات نیز فارسی و عربی زبانوں سے تقریباً نابلد سی ہوگئی۔ اُدھر مرثیہ گو شعرا نے نہ تو جدید تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کی اور نہ اس حقیقت کا ادراک کیا کہ وہ جس فارسی و عربی آمیختہ ریختہ میں شاعری کر رہے ہیں وہ نئی نسل کے لیے آسانی سے قابل فہم نہیں رہی ہے۔ چونکہ ان کی تعلیم پرانے طرز پر ہوئی تھی اس لیے شعر و شاعری میں بھی وہ پرانی ڈگر سے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔ قدیم استعارات و کنایات، تلمیحات و تشبیہات ان کا سرمایۂ فن تھا۔ انھوں نے زبان کو وسعت دینے اور عربی و فارسی سے نابلد افراد کی ذہنی تربیت کے لیے اندازِ بیان میں بھی نیاپن پیدا کرنے، زبان کو آسان بنانے اور نئی تشبیہات و استعارات اور نئی علامات کو استعمال کرنے کی کوشش نہ کی۔ لہٰذا ان کی فکر و فن کا میدان وہی رہا جو انیسؔ و دبیرؔ اور بعد میں دحیدؔ، اوجؔ، نفیسؔ اور تعشقؔ وغیرہ کا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جو کچھ کہتے تھے نئی نسل کو نہ تو اس میں کوئی اُپج نظر آتی تھی اور نہ جدت۔ وہی پرانی باتیں، پرانا اندازِ بیان، پرانی تشبیہات و استعارات جو وہ بار بار سن چکے تھے اور جنھیں ان کے پیش رووں نے ہزار گنا بہتر طریقے پر پیش کیا تھا۔ بنابریں وہ رشتہ اور ذہنی رابطہ اور ہم آہنگی جو شاعر اور سامع یا قاری کے درمیان ہونا چاہیے، منقطع ہو گیا تھا۔ علاوہ بریں مرثیہ گوئی کے دورِ متاخرین میں غیر معمولی صلاحیتوں کا کوئی مرثیہ گو شاعر اُبھرا بھی نہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اکا دکا مستثنیات کو چھوڑ کر بیشتر مرثیہ گو شعرا صحیح معنوں میں دوسرے درجے کے بھی نہیں تھے اس لئے وہ جو کچھ کہتے تھے اسے سامعین اور قارئین ادبی ذوق کا معیار بدل جانے کی وجہ سے قدر کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ دوسری

طرف شعرائے کرام ایسا کلام پیش کرنے سے قاصر تھے جو سامعین اور قارئین سننا اور پڑھنا چاہتے تھے۔ انیسؔ دبیرؔ یا ان کے بعد نفیسؔ اور اوجؔ وغیرہ کی بہت خوش قسمتی یہ بھی تھی کہ ان کے زمانے میں سامعین اور قارئین اور شاعر کے درمیان ایک مضبوط ذہنی رشتہ قائم تھا کیونکہ جس انداز کی تعلیم ان بزرگوں نے حاصل کی تھی تقریباً اسی طرح کی تعلیم بالعموم اس دور کے سامعین و قارئین کو ملی تھی۔ آخری دور میں مرثیہ گو شعرا اور عام قارئین اور سامعین کے درمیان ذہنی رابطہ منقطع ہو جانے کی وجہ سے اردو مرثیہ کی روح میں ایک نمایاں تبدیلی آنا ناگزیر تھی جو آ کر رہی۔

اب رہا یہ سوال کہ قدیم مرثیہ اور جدید مرثیہ کے مزاج میں جو بنیادی فرق ہے یعنی قدیم مرثیہ کا مزاج یہ ہے:

کبھی لاش اٹھائی کبھی رو دیے
اسی شغل میں شاہ دن بھر رہے

اس کے برعکس جدید مرثیہ کا مجموعی مزاج یہ ہے کہ:

ہوئی نہ اتنی کسی ماں کے لال میں ہمت
جو اِن[1] سے بڑھ کے یہ کہتا کہ کیجیے بیعت

تو اس کی بنیادی وجہ ملک کے سیاسی حالات اور ترقی یافتہ قومی شعور ہے۔ اگر ہم انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کے ملکی اور سیاسی حالات کا، اور ان حالات کے نتیجے میں عوام کے طرزِ عمل اور قومی امنگوں کا جائزہ لیں تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ جو زمانہ اردو مرثیہ

---

[1] امام زین العابدین سے

کے انتہائی عروج کا ہے، وہی ہندوستان میں قومی وقار کی انتہائی پستی کا ہے۔ یہ وہی وقت تھا جب غیر ملکی طاقت یعنی برطانیہ کا ہندوستان پر تقریباً قبضہ مکمل ہو چکا تھا۔ ہر محاذ پر ملکی فرمانرواؤں کو انگریزوں کے ہاتھوں ذلت آمیز اور عبرتناک شکست اٹھانا پڑی تھی۔ اور جو اردو مرثیہ کا گڑھ تھا اور جہاں میر مستحسن خلیق، میر ضمیر، میر انیس، مرزا دبیر، میر عشق، میر نفیس، اوج اور تعشق جیسے باکمال مرثیہ گو پیدا ہوئے تھے، براہ راست انگریزوں کے تسلط میں آ چکا تھا، نواب واجد علی شاہ معزول ہو چکے تھے اور انہیں جلا وطن کر کے مٹیا برج بھیجا جا چکا تھا۔ بہر حال ان سب واقعات کا اثر اردو مرثیہ کے مزاج پر بھی پڑا۔ اگر انیس و دبیر کے مراثی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو کربلا کی تباہی کے مناظر میں بند کے بند ایسے ملیں گے جو وہی دکھا ہوا دل کہہ سکتا ہے جس کے سر پر یہ ساری مصیبتیں گزر گئی ہوں، بنابریں اردو مرثیہ میں مجموعی طور پر شکست کا احساس زیادہ نمایاں ہے، چونکہ انیس بہت بڑا فنکار تھا اس لیے اُس نے ذاتی اور قومی غموں کا رخ بھی کربلا کی طرف موڑ دیا ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ قدیم اردو مرثیہ میں جو سوز و گداز، یاسیت حق پرستوں پر باطل پرستوں کا عارضی غلبہ دکھایا گیا ہے وہ مبنی بر حقیقت ہونے کے ساتھ ساتھ ان سیاسی اور قومی حالات کا شعوری یا غیر شعوری رد عمل بھی ہے۔

اب آئیے بیسویں صدی کے نصف اول میں۔ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد پوری قوم میں نیا ولولہ، نیا عزم، نیا جوش نظر آتا ہے۔ ترکی اور ایران میں نئی تبدیلیاں آئیں، روس میں مزدوروں کا دور دورہ ہوا، زار روس کا خاتمہ ہوا اور سرمایہ داری جاگیرداری نظام دفن کر دیا گیا، دنیا کے تمام مظلوموں محنت کشوں کو ظلم کے خلاف جد و جہد کرنے اور ظلم کو نیست و نابود کرنے کے نعرے لگائے گئے، نئی تعلیم

نے ذہنوں کو جلا دی۔ ان تغیرات سے ہماری قوم میں بھی ایک نیا جوش و خروش پیدا ہوا۔ پوری اردو شاعری میں جو یاسیت اور شکست خوردگی کا شکار تھی، ایک فاتحانہ عزم اور مردانہ پن پیدا ہوا۔ ان حالات اور رجحانات سے اردو کے مرثیہ گو شعرا اور اُن کے سامعین و قارئین بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہی وہ حالات تھے جو مرثیہ کے پیکر میں انقلابی تبدیلی کے محرک بنے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ کس سال سے مرثیہ کا آغاز ہوا یا کس شاعر نے جدید مرثیہ کا ایوان تعمیر کیا، تاریخی حقائق اور تاریخی عوامل سے چشم پوشی کے مترادف ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رثائی ادب کے مزاج اور ہیئت میں تبدیلی کا احساس مختلف شعرا کو ہوا۔ البتہ قدیم رنگِ مرثیہ کے منجھے ہوئے شعرا' نہ تو ان سماجی اور آفاقی تبدیلیوں سے آگاہ تھے اور نہ ان کے لیے تیار تھے' اس لیے انہیں نئے آنے والوں کے لیے جگہ خالی کرنا پڑی' البتہ اس احساس کو عملی شکل دینے میں پہل کس نے کی اس کا تعین بھی آسان نہیں۔ نسیم امروہوی صاحب کا خیال ہے کہ اس سلسلے میں پہلا قدم حضرت شاد عظیم آبادی نے اٹھایا اور انہوں نے سب سے پہلے جدید طرز کا مرثیہ لکھا۔ علامہ جمیل مظہری کی خدمات کو بھی اس سلسلے میں آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ غالباً انھوں نے جدید طرز کا پہلا مرثیہ ۱۹۲۵ء میں کہا تھا چونکہ اردو مرثیہ کے مرکز لکھنؤ سے دور تھے اور اس وقت تک وہ معروف شاعر بھی نہیں تھے اور نہ ان کا مرثیہ شائع ہوا تھا اس لئے بہت سے لوگوں کو خبر نہیں ہوئی۔ بہر حال اُن کے بعد نسیم صاحب کے بقول ۱۹۳۱ء میں نواب جعفر علی خاں اثر نے بھی ایک جدید طرز کا مرثیہ کہا تھا۔ میرے خیال میں جدید طرز کے مرثیوں کی جانب شعرائے کرام کی توجہ مولانا صفی مرحوم کی قومی نظموں اور حضرت نجم آفندی کے جدید طرز کے نوحوں اور ماتموں نے منعطف

گرانی ہوگی، کیونکہ ان قومی نظموں اور نوحوں کا مزاج جدید رنگ کے مرثیوں کے مزاج سے ملتا جلتا ہے، حالانکہ خود مولانا صفی نے کبھی مرثیہ نہیں کہا اور حضرت نجم آفندی نے جدید طرز کا مرثیہ بہت بعد میں کہا ہے۔ حضرت نجم آفندی کے اس احسان کو بھی اہلِ ذوق عرصے تک نہیں بھلا سکیں گے کہ اردو کے نوحوں اور ماتموں کو انھوں نے بلا مبالغہ ادبی درجہ دیا ہے۔ اس طرح جدید مرثیہ کا آغاز ہوا البتہ جن شعرائے کرام نے بدلے ہوئے حالات کے مطابق مرثیے کی روح میں تبدیلیوں کا بیڑہ اٹھایا ان میں سے بیشتر کے ساتھ یہ مجبوری تھی کہ وہ جدید رجحانات سے تو واقف تھے لیکن اُن علوم سے جن پر مکمل دستگاہ حاصل کئے بغیر کوئی شاعر ایک ذمہ دار مرثیہ گو نہیں بن سکتا کماحقہ آگاہ نہ تھے، اس لیے انھوں نے سیاسی طرز کے مسدس لکھنے شروع کئے، اور روایت سے بالکل بغاوت کردی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے مرثیے واقعاتِ کربلا کے متعلق بڑے اچھے مسدس تو بن گئے لیکن مرثیے نہیں بن سکے، البتہ خال خال شعرا ایسے بھی تھے جنھوں نے نئے تقاضوں کو محسوس کیا، روایت سے بغاوت بھی نہیں کی اور روایت کو برقرار رکھتے ہوئے مرثیے کے قالب میں نئی روح ڈالی اور اس کے دائرہ عمل میں بتدریج تبدیلیاں شروع کیں، تاکہ مرثیہ باقی رہے، اس کا مقصد بھی فوت نہ ہو اور گوشت پوست برقرار رہتے ہوئے روح اور مزاج بدل جائے۔

اِن شعرا میں سرِ فہرست نسیم امروہوی کا نام ہے۔ انھوں نے مرثیہ کو حالات کے مطابق ڈھالنے کا کام تو ۱۹۲۳ء سے شروع کردیا تھا جب انھوں نے پہلا مرثیہ کہا تھا جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے لیکن انقلابی نعروں کو سننے اور قبول کرنے پر آمادگی کی ایک عام فضا پیدا کرنے کے لیے انھوں نے مسلسل چودہ سال جدوجہد کرنے کے بعد ۱۹۳۷ء میں خالصتہً جدید مرثیہ کہا جہاں

تک راقم الحروف کی نظر اور مطالعے کا تعلق ہے اس کے دو تین سال بعد قدیم طرز مرثیہ گوئی کا خاتمہ بالخیر ہونے اور باقاعدہ طور پر جدید انقلابی مرثیہ کے منصۂ شہود پر لائے جانے کا آغاز ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جن مرثیوں میں سے مرثیہ کی مقصدیت یعنی "بکا اور عرفان امام" کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ وہ خوب مقبول ہوتے لیکن جن مرثیوں میں اس مقصدیت کو پس پشت ڈال کر محض سیاسی تقاضوں کی روح پھونکی گئی انھیں آج تک علم وادب کی دنیا کے کسی گوشے میں کوئی شخص ایک مسلسل نظم یا مسدس کہنے کے سوا مرثیہ کہنے کے لیے تیار نہیں۔ اس سلسلہ میں میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ محض دعویٰ نہیں ہے بلکہ اُس کا جیتا جاگتا ثبوت نسیم امروہوی کا مرثیہ "روح انقلاب" ہے جو نظامی پریس لکھنؤ نے ۱۹۳۷ء میں کتابی شکل میں شائع کیا تھا۔ یہ مرثیہ[۱] سب سے پہلا مرثیہ ہے جس میں مصنف نے حقائق اور عقائد کو فلسفیانہ انداز بیان کے سانچے میں ڈھالا اور جدید تخیل کو قدیم فنی بلندیوں کے ساتھ سمو کر مرثیہ گوئی میں ایک نئے رنگ کی بنیاد ڈالی۔ اس مرثیہ میں انھوں نے قوم کو۔ دعوت "انقلاب" دی ہے۔ اور مختلف مثالوں اور تشبیہوں کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ "انقلاب" ہی اصل زندگی ہے، اگر عرصہ گاہ حیات میں "انقلاب" کی سرگرمیاں نہ رہیں تو زندگی فنا ہو جائے۔ انتہا یہ کہ انقلاب ہی معرفت الٰہی کا زینہ ہے:

اے انقلاب مژدۂ عزم و عمل ہے تو — رنگینئ حیات کے گلشن کا پھل ہے تو
تعمیر کائنات نہ صرف آج کل ہے تو — آدم کو باغ خلد کا نعم البدل ہے تو
گردش بتا رہی ہے یہ لیل و نہار کی
تو ہے دلیل ہستی پروردگار کی

---

[۱] دیکھیے "مراثی نسیم" جلد اوّل صفحہ ۱۱۷

قائم ہے بند و بست جہاں انقلاب سے
ہنگامۂ بہار و خزاں انقلاب سے
روحِ عمل رگوں میں رواں انقلاب سے
ہر دم ہے چرخ پیر جواں انقلاب سے
محرومِ انقلاب جو دورِ حیات ہو
دنیائے آب و گل میں نہ دن ہو نہ رات ہو
ہے عالمِ فنا کی بقا انقلاب سے
دلچسپ ہے چمن کی فضا انقلاب سے
ہیں دلربا نسیم و صبا انقلاب سے
خود معتدل ہے آب و ہوا انقلاب سے
خلوت کی حد جمود کی زد سے بلند ہے
ہر پھول اس چمن میں تغیر پسند ہے

فرسودگی مذاقِ مشیت پہ بار ہے
دورِ خزاں ہی وجہ نشاطِ بہار ہے

انقلاب کو اصل اصولِ حیات ثابت کرنے کے لیے انہوں نے فطرت کی تبدیلیوں اور مظاہر کی مثالیں دینے کے بعد پھر انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ مثلاً

انساں، کہ دو جہاں میں ہے اک عالمِ کبیر
تھا ابتدائے خلق میں یہ کس قدر حقیر
شکلیں بدل بدل کے بنا پیکرِ صغیر
پھر طفل سے جوان ہوا اور جواں سے پیر
یہ سلسلہ جو روز و شب و ماہ و سال ہے
دُنیا میں انقلاب کی زندہ مثال ہے

اس کے بعد وہ تہذیب و ارتقا اور انسانی تاریخ کی مدد سے انقلاب کی اہمیت و افادیت کو یوں واضح کرتے ہیں۔

یہ حرّیت یہ جذبۂ بیداریٔ اُمم — سب انقلاب ہی کے توابع ہیں بیش و کم
ہر گام پر ہیں جادۂ ہستی میں پیچ و خم — گذرا ہے کاروانِ تمدن قدم قدم
روحانیت ترقیِ کامل کا نام ہے
مذہب بھی انقلابِ اُمم کا پیام ہے

اور اس کے بعد انھوں نے یہ بتایا کہ اسلام جو ایک فطری مذہب ہے اور مکمل دین ہے یہ بھی انقلاب کا نقیب و علمبردار ہے:

اسلام جو ہے سارے مذاہب کا ماحصل — ہے یہ بھی انقلاب کا پیغمبرِ عمل
چونکا کے جس نے خوابِ تغافل سے برمحل — منوا دیا کہ عقل ہے اوہام کا بدل
پیدا یہ انقلاب کے سامان ہو گئے
اک دم میں بُت پرست مسلمان ہو گئے

اسلام کے انقلابی پیغام کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد انھوں نے مرثیہ کا رُخ بڑی خوبصورتی سے حضرت امام حسین کی جانب موڑا ہے:

یہ دینِ مصطفیٰؐ ہے اخوت کا ذمہ دار — علم و عمل سے رفعِ جہالت کا ذمہ دار
حقانیت سے کشفِ حقیقت کا ذمہ دار — صبر و رضا سے طاقت و عظمت کا ذمہ دار
جس میں جہاد عزم و عمل فرضِ عین ہے
بانی نبیؐ ہیں جز و متمم حسینؑ ہے

جو انقلابِ عالمِ فطرت تھا وہ حسینؑ — جو سر فروشِ حق و صداقت تھا وہ حسینؑ
جو فاتحِ جہانِ شہادت تھا وہ حسینؑ — جو محرمِ ضمیرِ مشیت تھا وہ حسینؑ
زیرِ قدم نجات کا جادہ لیے ہوئے
سینے میں کبریا کا ارادہ لیے ہوئے

جو بے نیازِ عالمِ فانی تھا وہ حسینؑ — جو دورِ جہاں میں حق کی نشانی تھا وہ حسینؑ

جو روح حریت کی جوانی تھا وہ حسین　　جو اک نئی حیات کا بانی تھا وہ حسین
وہ جس نے زندگی کا قرینہ سکھا دیا
مر کر خدا کی راہ میں جینا سکھا دیا

وہ کربلا کے بن میں چمن بند کائنات　　باطل کے اک ہجوم ضلالت میں حق کی ذات
وہ تین دن کی پیاس میں اک چشمۂ حیات　　وہ دوپہر کی دھوپ میں اک سایۂ نجات
ہستی کو جس نے شوق کا حامل بنا دیا
جو ذرہ چن لیا اسے اک دل بنا دیا

قصہ مختصر اُن کا یہ مرثیہ از اول تا آخر یعنی مطلع سے لے کر مقطع تک جدید رنگ میں ڈوبا ہوا ہے جیسا کہ انہوں نے اس کے مقطع میں خود دعویٰ کیا ہے:

بس اے نسیم روک لے خامہ کو اب ذرا　　سُن جبرئیل کہتے ہیں واللہ مرحبا
ہٹ کر جو طرز عام سے یہ مرثیہ کہا　　اس وادیٔ کہن میں یہ جادہ نیا بنا
اک تازہ طرزِ فکر کا سورج طلوع ہے
دور جدید مرثیہ گوئی شروع ہے

لیکن یہ مرثیہ اپنی روح کے لحاظ سے جدید مرثیہ ہے لیکن اس میں قدیم مرثیے کی تمام روایات کو برقرار رکھا گیا ہے اس کے بعد انھوں نے ۱۹۳۹ء میں جو مرثیہ لکھا اس کے چہرے میں قلم کو موضوع بنایا۔ اس مرثیہ کا ایک بند آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

کیوں کر ملے نہ تجھ کو ریاضت کا اپنی پھل
چلتا ہے راہِ علم و حقیقت میں سر کے بَل
ہے کوشش یہ جو اہلِ نظر کے ترا محل
سرگوشیوں سے کرتا ہے تو مسئلوں کو حل

نوکِ زباں سے دل کی گرہ کھولتا ہے تو
لکھنا فقط کمال نہیں بولتا ہے تو

نسیم صاحب کے بعد تو پھر جدید مرثیہ کا واقعی گلستاں کھل گیا۔ بعد میں آنے والے شعرا نے نئے رنگ میں رنگ رنگ سے اپنی طبیعت کی جولانیاں دکھائیں اور بعض بہت اچھے مرثیے تصنیف کئے۔ لیکن جس طرح کسی چیز کو قرار نہیں اور زمانہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اس لئے آج کا جدید مرثیہ کل کے جدید مرثیہ سے کہیں زیادہ آگے نکل گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے نقّاد اور قلم کار جدید مرثیوں کو بھی اپنا موضوع بنائیں ورنہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ جدید مرثیوں کو تنقید کا موضوع نہ بنایا گیا تو جدید مرثیہ، ایک خودرو اور بے ترتیب چمن بن کر رہ جائے گا۔ قصہ مختصر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ نسیم امروہوی نے قدیم مرثیہ کو نئے رنگ میں ڈھالنے کی جو کوشش ۱۹۲۳ء سے شروع کی تھی وہ ۱۶-۱۷ سال کی ریاضت کے بعد کامیاب ہوئی۔

یہ مرثیہ نسیم امروہوی نے کہنے کو تو کہہ لیا، اور اس کے کچھ حصے جستہ جستہ اپنے احباب کو سنا بھی دیے، جو ایک سے دوسرے تک، اور دوسرے سے تیسرے تک پہنچ گئے، لیکن نجی صحبتوں میں اس کے انداز پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں، اور طرح طرح کی باتیں کہی گئیں۔ "مرثیے کو یہ کہاں سے کہاں لے جا رہے ہیں، مسلمات کو فلسفے اور منطق کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے، منبر سے "انقلاب" کی آواز بلند کر کے ہندوستان کو ترکی بنا دینے کے ارادے ہیں، آج یہ ہے اور کل نماز روزے کا فلسفہ بھی اسی طرح بیان کیا جائے گا، اگر یہی مرثیہ ہے تو پھر میر انیس اور مرزا دبیر نے جو کچھ کہا ہے اسے اب کیا کہا جائے اس طرز کو رواج دیا گیا تو ہمارا سارا لٹریچر بیکار ہو جائیگا اب اس کے بعد دوسرا قدم دہریت اور الحاد کی طرف اٹھے گا، اس تحریک کو جڑ ہی

شدت اور طاقت کے ساتھ روکنا پڑے گا“ غرض جتنے منہ اتنی باتیں، یہ سب باتیں نسیم صاحب کے کانوں تک بھی پہنچیں، وہ اس وقت باورچی ٹولے میں رہتے تھے، جہاں جناب آرزو بھی سکونت پذیر تھے۔ نسیم صاحب نے انہیں پورا مرثیہ سنایا اور اس کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی، جناب آرزو نے فرمایا کہ اس میں شک نہیں کہ یہ سب باتیں جو اس مرثیے میں کہی گئی ہیں اگر کئی مرثیوں میں متفرق طور پر کہی جاتیں تو لوگ جلدی قبول کر لیتے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اب ایسے ہی مرثیے کہنے کا وقت آگیا ہے۔ نسیم صاحب نے اسی پر اکتفا نہ کی، مولانا صفی اگرچہ ان دنوں صاحب فراش تھے لیکن پورا مرثیہ انہیں بھی سنایا، مرحوم سن کر اچھل پڑے اور فرمایا کہ یہ ایسی چیز ہے جسے زیادہ سے زیادہ رواج دیجیے، میں علیل نہ ہوتا تو آپ کے ساتھ مجلسوں میں جاتا اور اس مرثیے کی داد دیتا، آپ کہے جائیے اور لوگوں کے کہنے سننے کی پرواہ نہ کیجیے، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ بھی کہتے رہیے جسے لوگ سننا چاہتے ہیں، ہم کانفرنس میں ویسی نظمیں پڑھتے ہیں جیسی ہم کہنا چاہتے ہیں، اور محفلوں میں ویسے قصیدے پڑھتے ہیں جیسے لوگ سننے کے خواہشمند ہیں اور ان کی تشبیب وغیرہ میں اپنے دل کی بات بھی کہہ جاتے ہیں۔ آپ بھی یہی صورت اختیار کیجیے، تاکہ رفتہ رفتہ پرانے نقوش بھی مٹتے رہیں اور طبیعتوں پر بار بھی نہ ہو۔ مولانا کی گفتگو سے نسیم صاحب کے دل کو بڑی قوت پہنچی اور اب انہوں نے اپنے نئے مرثیے کی سالانہ مجلس میں جو ”گلزار شمیم میں بہار نسیم“ کے عنوان سے ناظم صاحب کے امام باڑے میں آغا فرخ حسین مرحوم کے زیر اہتمام رجب کے آخری یکشنبہ کو منعقد ہوئی تھی، یہی مرثیہ پیش کیا۔ اس مجلس میں موجودہ وقت کے کل اساتذہ فن اور علمائے کرام حسب معمول تشریف رکھتے تھے۔ امام باڑے کا ہر گوشہ سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا لیکن چند ہی لوگ ایسے نکلے جنھوں نے اس مرثیہ کو

پسند کیا، گریہ و بکا میں بھی کمی رہی، مجلس تقریباً ناکامی پر ختم ہوئی۔ دوسرے تیسرے ہی دن سے مشہور قومی اخبار "نظارہ" نے وہی سب باتیں جو اس مرثیے کی مخالفت میں زبانوں پر تھیں، بڑے زور شور اور شد و مد سے شائع کیں اور مسلسل شائع کرتے رہے، جب اِدھر سے کوئی جواب نہ ملا تو "لفظی گرفت" کا سلسلہ شروع کیا ــــ "لہجہ دیہاتی تھا، تلفظ اس طرح نہیں کرتے تھے جس طرح اہل زبان کرتے ہیں"۔ مثال میں "زندگی" کا لفظ پیش کیا کہ ہم (اہل لکھنؤ) اس لفظ کی دال کو مکسور بولتے ہیں، نسیم صاحب نے بفتح دال ادا کیا۔ آخر کار مولانا صفی نے اس نکتے کی تصریح فرمائی کہ "زندگی" جب ترکیب فارسی میں ہو (جیسے: روحِ زندگی) تو دال کو زبر پڑھیں گے کیونکہ اصل لفظ فارسی ہے اور اہل ایران میں بفتح دال رائج ہے، لیکن جب ترکیب میں نہ ہو اور تنہا استعمال کیا جائے تو زبر بھی پڑھ سکتے ہیں اور زیر بھی۔ غرض کہ بڑی مشکل سے حضرت نصیر الملۃ مرحوم نے اس یکطرفہ بحث کو ختم کرایا۔ تاہم لکھنؤ میں اس وقت سے دو گروپ ہو گئے ایک گروپ اس طرز کے مرثیے کا حامی تھا اور دوسرا اُس طرز کے مرثیے کا جو پہلے سے رائج اور ذہنوں میں رچا بسا ہوا تھا۔ اول الذکر گروپ اُس وقت اقلیت میں تھا، لیکن رفتہ رفتہ تعداد بڑھتی گئی، دوسرے لوگوں نے بھی اس طرز کے مرثیے کہنا شروع کئے اور دیکھتے ہی دیکھتے دو تین سال کے قلیل عرصے میں اقلیت، اکثریت سے اور اکثریت اقلیت سے بدل گئی۔ اب نئے رنگ کا مرثیہ سکہ رائج الوقت قرار پایا اور پرانے ڈھنگ کا مرثیہ، جدید کہنے والوں کے لیے ٹکسال باہر ہوا۔ بایں ہمہ انیسؔ و دبیرؔ اور ان کے جانشینوں کے سابق مرثیوں کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا، جہاں ان کا مرثیہ پڑھا جاتا، لوگ ہزاروں کی تعداد میں ٹوٹ پڑتے۔ آج بھی ان بزرگوں کے کلام کی مقبولیت کا یہ سلسلہ جوں کا توں جاری ہے۔

جہاں تک نسیم صاحب کا تعلق ہے' ان کا بیان ہے کہ میں نے اس کے بعد مولانا صفی اور حضرت آرزو کے مشورے پر عمل کیا' یہ دونوں میرے بزرگ تھے اور قوم کی ذہنیت اور نفسیات کا مجھ سے کہیں زیادہ تجربہ رکھتے تھے' میں اس وقت بالکل نوجوان تھا اور مجھے ان سے عشر عشیر بھی تجربہ نہیں تھا غرض اس کے بعد نسیم صاحب کے مرثیوں میں بیشتر جدید وقدیم رنگوں کی آمیزش سے مرثیہ نگاری کی ایک ایسی طرح پڑتی ہے جو بالکل منفرد ہے' اس میں فکر و نظر کے پہلو بھی ہیں' انقلابی عزم بھی' اور ارتقا کی تحریک عمل بھی۔ اور وہ ان مقاصد کو آیات و احادیث کے شعوری اور غیر شعوری حوالوں سے محکم سے محکم تر بناتے چلے جاتے ہیں' جس سے دونوں ذوق تسکین پاتے ہیں' اگر اسے قدیم و جدید رنگوں کی درمیانی کڑی' یا نسیم اسکول کے نام سے تعبیر کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

نسیم امروہوی نے مرثیے کے دامن کو وسیع بلکہ وسیع تر کرنے کے لئے مرثیہ گوئی میں متعدد ٹھوس اور مفید مطلب تبدیلیاں کی ہیں' جن کی فہرست خاصی طویل ہے' لیکن ان میں سے چند ایک کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا' ان کے مرثیوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے مرثیوں میں آیات قرآنی' احادیث نبوی اور ائمہ طاہرین کے اقوال بکثرت نظم کرتے ہیں' لیکن زاہد خشک کی طرح نہیں' بلکہ ایسے انداز سے کہ ذوق سلیم اور شعور شعری اس سے بھرپور حظ اٹھاتا ہے' میرے اندازے کے مطابق اس دور کے شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے اپنی منظومات میں اتنی احادیث اور آیات قرآنی استعمال کی ہوں جتنی نسیم صاحب کے تصنیف کردہ مرثیوں میں ملتی ہیں' مراثی نسیم جلد اول و دوم' قران السعدین' راز غیب' روح انقلاب' رضوان جنت سے کشمکش' فلسفہ غم' چشمہ غم' تسبیح فاطمہ اور مومن آل ابراہیم کے نام سے ان کے جو مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ان سب میں یہ خصوصیت امتیازی طور پر نمایاں ہے ان مرثیوں سے قطع نظر ان کے غیر مطبوعہ مراثی میں ایک ایسا مرثیہ حالی

میں میری نظر سے گزرا جس کے مصائب کو چھوڑ کر باقی تمام اجزا اور مصرعے آیات و احادیث سے ماخوذ ہیں، یہ مرثیہ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے اپنی لکھنو کی پہلی مجلس میں پڑھا تھا، اور ثقۃ الاسلام حضرت مولانا بشیر انصاری صاحب قبلہ کے بیان کے مطابق اس کا موضوع خطیب اعظم شمس العلماء جناب سبط حسن صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ نے دیا تھا، اس مرثیے میں نسیم صاحب نے حضرت علیؑ کی شان میں ۱۱۴ مستند احادیث نبوی اور ۲۱ آیات قرآنی نظم کی تھیں جیسا کہ اس کے مقطع کے چوتھے مصرع سے ظاہر ہوتا ہے، جو مرثیہ مذکور کی تصنیف کا مادۂ تاریخ بھی ہے۔

مرثیہ ختم ہے کر شکر نسیمؔ خوش ذات
سالِ تصنیف رقم کر کہ بنے وجہِ حیات
امتحاں کا الف اُٹھ کر[1] یہ پکارا حق بات
ایک سو چودہ (۱۱۴) احادیث اور اکیس آیات

۱۹۳۱-۱ = ۱۹۳۰

بات کی بات بھی تاریخ کی تاریخ بھی ہے
قلب حاسد کے لیے خنجرِ مریخ بھی ہے

اس مرثیہ کے حسب ذیل چند بند مولانا مسعود الحسن نقوی واعظ (مقیم فیڈرل بی ایریا کراچی، بلاک نمبر ۲۰) کو بے حد پسند آئے تھے، اور انھوں نے اسی وقت نسیم صاحب سے لکھوا کر انہیں حفظ کر لیا تھا:

مالک مسندِ تطہیر و امامت ہیں علی — نورِ خالق ہیں علی، چشم رسالت ہیں علی
جسم اعجاز علی، روحِ کرامت ہیں علی — مادّی شکل میں اللہ کی طاقت ہیں علی

---

[1] تخرجے کی جانب اشارہ ہے۔

اس سے کیا بحث تفسیری انہیں کیا کہتے ہیں
ایسے کچھ ہیں کہ نبیؐ شیر خدا کہتے ھیں

شامل مقصد آیات شریفہ ہیں علی
امت احمد مرسل کا وظیفہ ہیں علی
ایک تو نائب قدرت کے خلیفہ ہیں علی
پھر جو مصحف سے مقدم وہ صحیفہ ہیں علی

جب علی عزم کی میزان میں پورے اترے
تب کہیں عرش سے قرآن کے سورے اترے

منزلِ سورۂ والنجم اذا بدر منیر
امر حق، آمر و ماموژ اولی الامر، امیر
طینت پاک میں اسرارِ کتاب و تفسیر
تن وفا، نفس رضا، روح عمل، صدق ضمیر

شان تخلیق میں خلقت سے جدا ہیں بخدا
نہ جدا ہیں یہ خدا سے، نہ خدا ہیں بخدا

والی سلطنت اہل ولا ہیں حیدر
جرم و عصیاں کے مریضوں کی دوا ہیں حیدر
شاملِ نور رسول دوسرا ہیں حیدر
اور اسی وجہ سے تو وجہِ خدا ہیں حیدر

یہ بھی طاعت ہے جو مولا کی اطاعت کر لی
ان کے چہرے پہ نظر کی تو عبادت کر لی

فقر پر اپنے انہیں فخر بھی ہے، شاہ بھی ہیں
بدر کے چاند بھی ہیں، کعبے کے یہ ماہ بھی ہیں
شارع شرع بھی ہیں، خضر بھی ہیں، راہ بھی ہیں
اسد اللہ بھی ہیں، اور من اللہ بھی ہیں

ایک ہیں بھی نہیں یہ ایک صفت حیدر کی
یہ صحابی بھی ہیں اور آل بھی پیغمبر کی

منظر لطف و جمال، آئینۂ قہر و جلال
افق حق پہ نمود شب نصرت کے ہلال
بت شکن، زندقہ و کفر و ضلالت کا زوال
ان کمالات سے ہیں دین محمد کا کمال

معنی آیۂ "بلغ" ھیں یہ پایا دیکھو
کس کو "اکملتُ لکم دینکم" آیا دیکھو

بعد محبوب خدا خلق میں ممتاز علی | ذات معبود کے ہمراز علی، راز علی
حق کے معشوق نبی، عاشق جانباز علی | مثل قرآں شہ لولاک کا اعجاز علی

فرق اتنا سا ہے قرآن میں اور حیدر میں
وہ پیمبرؐ کے گھر اترا، یہ خدا کے گھر میں

یہ کرامات مجسم ہیں، سراپا اعجاز | شکل آئینۂ قدرت، قد بالا اعجاز
خلق و حلم و کرم و جرأت و تقویٰ اعجاز | علم کے ساتھ عمل کا ہیں یہ گویا اعجاز

شکل انساں میں متشکل ہے کرامت دیکھو
قاریو مصحف اعجاز کی صورت دیکھو

اس ایک مرثیے پر کیا موقوف ان کا تصنیف کردہ کوئی مرثیہ ایسا نہیں ملے گا جس میں آیات قرآنی و احادیث نبوی استعمال نہ کی گئی ہوں، لیکن اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا ہے کہ نظم کی شگفتگی اور روانی پر اثر نہ پڑے اور مرثیہ آیات قرآنی اور احادیث نبوی کا منظوم ترجمہ بن کر نہ رہ جائے بلکہ اس کی ادبیت برقرار رہے۔ وہ اپنی اس کوشش میں اس حد تک کامیاب رہے ہیں جس سے ان کے مراثی میں انفرادیت پیدا کردی ہے۔ اس کوشش سے دو فائدے پہنچے۔ ایک تو یہ کہ آیات قرآنی اور مستند احادیث نبوی کے استعمال اور بعض اوقات حسب ضرورت اُن کی تفسیر و تشریح کرنے سے مرثیہ کی علمی اور تاریخی حیثیت میں چار چاند لگ گئے۔ دوسرے اردو زبان کو ان مرثیوں کی مدد سے ایسے الفاظ مل گئے جو بالعموم اردو میں استعمال نہیں ہوتے تھے۔

نسیم صاحب نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ متعدد بنیادی عقائد اور مسائل کو اپنے مرثیوں کا موضوع بنایا اور انہیں ہر قسم کے عقلی و نقلی، منطقی تاریخی اور نفسیاتی دلائل و براہین سے صحیح ثابت کیا لیکن کسی مقام پر مناظرانہ رنگ کی جھلک نہیں آنے دی مثلاً حدیث "من بکیٰ علی الحسین" وجود و غیبت امام عصر، اور ایمان ابوطالب وغیرہ

دیگر شعرائے کرام نے بھی بعض مسائل و معتقدات کو اپنے مرثیوں کا موضوع بنایا ہے لیکن جہاں تک مجھے علم ہے نسیم صاحب سے پہلے کسی نے ان موضوعات سے منطق و کلام کی روشنی میں بحث نہیں کی، انھوں نے حدیث "من بکی۔۔ الخ" کے بیان میں بکا و ابکا (رونے اور رلانے) کے اجزاء سے سیر حاصل بحث کرنے کے بعد تباکی (رونے کی صورت بنانے) کے ٹکڑے کا کس قدر فطری اور دلنشین انداز سے آغاز کیا ہے کہ بات دل میں گھر کر جاتی ہے:

مجلسِ غم میں سنیں غور سے ذکرِ شہدا ہے تباکی سے یہ مقصود کہ اربابِ عزا
مرنے والے کے عزیزوں میں ہوا شور بکا جس طرح موت کے گھر میں کوئی پرسے کو گیا

آہ و فریاد وہاں دل سے جو ٹکراتی ہے
شکل رونے کی بنا تا نہیں بن جاتی ہے

اسی طرح غیبتِ امام کو نسیم امروہوی نے اپنے کئی مرثیوں کا موضوع بنایا ہے، جن میں سے ایک کا مطلع ہے۔ ع "جنّت کی آرزو ہے نہ خوفِ سقر مجھے"

یہ مرثیہ انھوں نے ۱۹۴۵ء میں تصنیف کیا تھا اور دیئے ہوئے موضوع کے مطابق مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ کراروی (حال مقیم پشاور) کے گھر پر کراری ضلع الہ آباد میں پڑھا تھا، یہ مرثیہ، مراثی نسیم کی پہلی جلد میں شامل ہے:۔

معنی ہیں جس کے آلِ محمّد بہ استناد سوچو جو ہوں رموزِ الٓمّ یاد
لاریب فیہ، ہدی غائب سے ہے مراد ہے ذٰلک الکتاب جو ہادی ہے عباد

سمجھو نہ سمجھو ہم تو اک آیت سناتے ہیں
جو متقی ہیں غیب پہ ایمان لاتے ہیں

کس خوبصورتی سے انھوں نے ذٰلک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین الّذین یؤمنون بالغیب کی تفسیر اس بند میں نظم کر دی ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، ان چیزوں کا تذکرہ کیا ہے جو آنکھوں سے اوجھل ہیں لیکن ان پر یقین کیے بغیر مسلمان، مسلمان نہیں رہتا۔

عیسیٰؑ کو مانتے ہیں مسلماں، نہاں ہیں وہ
الیاسؑ کو بھی کہتے ہیں، ہاں ہیں جہاں ہیں وہ"

مہدیؑ کو ہم جو کہتے ہیں قائم یہاں ہیں وہ
دنیا سوال کرتی ہے ہم سے کہاں ہیں وہ

ہم کیوں کہیں امامِ زمانؑ سامرا میں ہیں
سید ہمارا یہ پتہ ہے کہ علمِ خدا میں ہیں

دوسرے مرثیے میں کسی قدر اور تفصیل سے یہی باتیں نظم کی ہیں، جو ۶۲ء یا ۶۳ء کی تصنیف ہے:۔

اس طرح بحرِ جہاں میں یہ گہر مخفی ہے
جس طرح وقت کے دامن میں سحر مخفی ہے

یا شبِ تار کی چادر میں قمر مخفی ہے
یا نمازی کی دعاؤں میں اثر مخفی ہے

عقلِ منکر کو یہی کیوں نہیں سمجھاتی ہے
کہیں آنکھوں سے مشیّت بھی نظر آتی ہے

قلبِ ہستی میں ہیں مستور اسی طرح جناب
جس طرح سینۂ گیتی میں گلستاں کا شباب

ہے یونہیں عارضِ پُر نورِ پہ غیبت کی نقاب
جس طرح برق کا جلوہ تہِ دامانِ سحاب

غور درکار ہے مضمون کی باریکی میں
نور ہے مردمکِ چشم کی تاریکی میں

اس طرح آپ ہیں موجود مگر مخفی بھی
جیسے ظاہر بھی ہے اور عقلِ بشر مخفی بھی

ہے نمایاں بھی، شمیمِ گلِ تر مخفی بھی
چلتی پھرتی بھی ہے اور بادِ سحر مخفی بھی

دل سے جانا ہے، قرائن سے انھیں مانا ہے
حق کو دیکھا تو نہیں عقل سے پہچانا ہے

کیف جو دل میں سماتا ہے نہاں ہے کہ نہیں
جوش جو خون بڑھاتا ہے نہاں ہے کہ نہیں

جذب جو کھینچ کے لاتا ہے نہاں ہے کہ نہیں
ذہن جو عرش پہ جاتا ہے نہاں ہے کہ نہیں

ولولہ زیست کا مقصود ہے اور غائب ہے
روح بھی، سانس بھی موجود ہے اور غائب ہے

بات، دشمن کی جو کھلتی ہے کہاں ہے دیکھیں
آگ جو سینے میں جلتی ہے کہاں ہے دیکھیں

یہ طبیعت جو مچلتی ہے کہاں ہے دیکھیں
منہ سے آواز نکلتی ہے کہاں ہے دیکھیں

اِس طرف کیوں نگہِ غور نہیں جاتی ہے
کبھی نیت بھی نمازی کی نظر آتی ہے

ہم بھی دیکھیں کوئی بتلائے اگر ہو ممکن
کس جگہ جسم میں پنہاں ہیں حواسِ باطن

رات کے وقت ہمیں کیوں نظر آتا نہیں دن
ذکر قرآن میں جن کا ہے کہاں ہیں وہ جن

کبھی پہلے انھیں دیکھا ہے کہ اب دیکھا ہے
کیوں ہوں جبریل کے قائل انھیں کب دیکھا ہے

مجھ کو سوجھے نہ اگر نور تو معدوم کہوں
خلد آنکھوں سے ہے مستور تو معدوم کہوں

میں نے دیکھی جو نہیں حور تو معدوم کہوں
عرش و کرسی ہیں بہت دور تو معدوم کہوں

یہ سبھی غیب ہیں ان پر اگر ایمان نہیں
کلمہ لاکھ پڑھے جاؤں مسلمان نہیں

وقت بھی فصل بھی موسم بھی ہوا بھی پنہاں
ذہن بھی طبع بھی اور فکرِ رسا بھی پنہاں

عقل بھی فہم بھی فطرت بھی قویٰ بھی پنہاں
صورتِ مہدیِ ہادی ہے خدا بھی پنہاں

دامنِ غیب میں مستور ہیں ہیں دونوں
ہیں تو دونوں ہیں نہیں ہیں تو نہیں ہیں دونوں

اسی طرح انھوں نے بڑے دل نشیں انداز میں عقلی و منطقی دلائل و براہین سے آنحضرتؐ کے چچا ابوطالب کے ایمان کو ثابت کیا ہے۔ حال میں ان کے دو مرثیے "شریکِ دعوتِ اسلام علی بوطالبؑ" اور "عقدۂ رشتۂ سر رشتۂ انسانی ہے" کتابی شکل میں شائع ہوئے جن میں انھوں نے بڑی دل کو لگتی باتیں کہی ہیں، اس کتاب کے مقدمہ میں یگانۂ روزگار عالم اور محقق مولانا منتخب الحق صاحب نے تحریر کیا ہے:-

"جنابِ موصوف (نسیم امروہوی) کا یہ مجموعہ دو مسدسوں پر مشتمل ہے، ایک مسدس میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے جاں نثار اور شفیق ترین عمِ محترم جنابِ ابوطالب کے ذکرِ جمیل کی عطر بیزیاں ہیں اور دوسرے میں ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ سید الکونین صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عقدِ مقدس کی ضیا باریاں ہیں۔ شعری محاسن کے اعتبار سے اگر ایک دستۂ گل و ازہار ہے تو دوسرا مطلعِ انوار، ان مسدسوں میں شاعر نے جہاں انجمنِ اسلام کی خدمات کا اعتراف کیا ہے وہیں ان کی بارگاہ میں ہدیۂ تشکر بھی پیش کیا ہے۔"

آگے چل کر فاضل مقدمہ نگار تحریر کرتے ہیں:۔

"وہ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ وسیع المطالعہ اور بالغ نظر عالم بھی ہیں، علمی فضل و کمال کے ساتھ طبعِ روشن اور ذہنِ وقاد کے بھی مالک ہیں اور زبان و لغت کے ایک مسلم محقق ہیں۔ دعوتِ ذوالعشیرہ کے موقع پر جنابِ ابوطالب کے وعدۂ نصرت و حمایت کا پرجوش اور ولولہ انگیز بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:۔

رفیقِ کار ہوئے بے خطر ابوطالب — ڈٹے محاذ پہ لے کر سپر ابوطالب
جچے لب پہ صفتِ شیرِ نر ابوطالب — اِدھر رسولِ مبلغ، اُدھر ابوطالب

وہ حسبِ وقت و محل آیتیں سنانے لگے
یہ پڑھ کے اُن کے قصیدے فضا بنانے لگے

قصائد مستعد کہے، بشانِ رسولؐ — جو آج تک ہیں فصاحت کی بزم میں مقبول
خطاب کر کے نچھاور کیے یہ مدح کے پھول — تمہاری دعوتِ صادق ہے جان و دل سے قبول

ہمارے ناصح کامل ہو تم امین ہو تم
تمہارے دین کے صدقے ہمارا دین ہو تم

"تمہارے دین کے صدقے ہمارا دین ہو تم" اس مصرع کی سادگی اور بیساختگی، معنوی بلندی و جامعیت اور سلاست و انسجام تحسین و توصیف سے مستغنی ہے۔ شاعر نے ایمان و محبت کا ایک دفتر اس مصرعہ میں سمو دیا ہے۔"

آپ نے حضرت مولانا منتخب الحق کی گراں مایہ رائے کا مطالعہ فرمایا۔ دونوں مسدسوں میں حضرت نسیم امروہوی نے قرآن و حدیث سے استدلال کرنے اور مستند تاریخی حوالے

دینے کے باوجود کسی مقامات پر شعریت کو مجروح ہونے نہیں دیا۔ یہ مسدس پڑھنے کے بعد شاید ہی کوئی معقول شخص الیسا ملے جسے حضرتِ ابو طالب کو مومن تسلیم کرنے میں تامل ہو۔ کیا یہ دلیل :

سُنے گئے تھے وہ کلمے کبھی جہاں میں کب
جو عقدِ بنتِ اسد میں ادا ہوئے بہ ادب
"ہے کل حمد کا حق دار عالمین کا رب"
یہ پہلے اُن کا تھا خطبہ، کلام پاک ہے لب
بڑا غضب ہے جو شک ہو اب اس کے ایماں میں
کہ جس کے لفظ ہیں اُمُّ الکتاب قرآں میں
یہ مسئلہ ہے مسلّم نہیں محلِ نظر
پڑھائے عقد جو کافر تو عقد ہے ابتر
نہ تھے یہ دینِ حنیفی پہ قبلِ بعثت اگر
رسول نے انہیں قاضی بنا لیا کیونکر
جو کفر کا کوئی اس باخدا کے قایل ہے
تو پھر نبی سے خدیجہ کا عقد باطل ہے

—— ایمان ابو طالب کو ثابت کرنے کے لئے صرف یہ ایک دلیل اتنی قوی ہے کہ اسے رد نہیں کیا جا سکتا۔ ایمان ابو طالب کے متعلق جناب نسیم امروہوی نے قرآنی آیات کا حوالہ دینے کے بعد تاریخ اور مستند احادیث کے ذریعہ اس حقیقت کو منوالیا ہے کہ حضرتِ ابو طالب مومن کامل تھے۔

جسے تلاش ہو حق کی پڑھے وہ ابنِ ہشام
کہ نزع میں متحرک تھے لب بہ ذوق تمام

قریب بیٹھے تھے عباس عمِ خیر انام
انہوں نے جھک کے سنا اور کیا پلٹ کے کلام
جلالِ حق کا سبق پڑھ رہے ہیں جل اللہ
محمد آؤ سنو "لا الہ الا اللہ"

اس موقع پر نسیم امروہوی نے صرف ایک بند میں ابن ہشام کی بیان کردہ روایت کی اہمیت اُجاگر کرنے کے لئے حضور کے عمّ محترم حضرت عباس کی سیرت اور رجال اور رُواۃ میں اُن کے اعتبار و استناد پر بڑی خوبصورتی سے روشنی ڈالی ہے:

ہیں معترض کی نگاہوں میں معتبر عباس
صحابیوں میں بھی ہیں مردِ مقتدر عباس
رجال میں بھی ہیں شک سے بلند تر عباس
رُواۃ میں بھی ثقہ اور معتبر عباس
جنہوں نے صدق بیانی کے اجر لوٹے ہیں
تو پھر وہ کون ہے سچا اگر یہ جھوٹے ہیں

اس کے بعد دو بندوں میں انہوں نے ایمان ابو طالب کے بارے میں ایک ایسی تاریخی اور عقلی دلیل دی ہے جسے تسلیم کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں اور ان ہی بندوں سے مصائب امام مظلوم بیان کرنے کے لئے نہایت فنکارانہ طور پر ایک گوشہ نکالا ہے:

نہ جانچیے یہ روایت نہ سیرت و کردار
نبی کی آنکھ سے اب ان کو دیکھئے اک بار
یہ بارگاہِ رسالت میں آپ کا تھا وقار
پچھاڑیں کھا کے انہیں روئے احمدِ مختار
وہ "عامِ حزن" بنا ان کا جب وصال ہوا
یہ غم رسولؐ کی اُمت میں ایک سال ہوا

یہ مرنے والا اگر ایمان ہی نہ لایا تھا | تو کیا رسولؐ نے کافر کا غم منایا تھا
زباں پہ "وا أبتا" بار بار آیا تھا | وہ خود بھی روتے تھے اوروں کو بھی رلایا تھا

جتا دیا تھا کہ جو محسنِ رسالت ہے
تو اس کو رونا رلانا نبی کی سنت ہے

مذکورہ بالا چند مثالیں صرف یہ بات واضح کرنے کے لئے پیش کی گئیں کہ نسیم امروہوی نے اس قسم کے مسائل اور بنیادی عقائد کو بعض مرثیوں کا موضوع بنایا اور ان مسائل پر بڑی شرح و بسط کے ساتھ مدلل طریقے پر بحث کی جو آپ سے پہلے عموماً واعظین و مقررین کے خطاب اور بیان تک محدود تھی جا بجا آیات قرآنی و احادیث نبوی اور تاریخی حقائق کا حوالہ بھی دیا لیکن مرثیہ کے حدود سے قدم باہر نہیں نکالا۔ یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ انہوں نے نئے نئے موضوعات پر مرثیے لکھ کر مرثیے کے دائرے میں رہتے ہوئے اس دائرے کو بہت زیادہ وسیع کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نسیم صاحب مرثیے سے استحکام عقائد، ابقائے قومیت سماجی تنقید اور معاشرے کی تہذیب و تطہیر اور نئی اقدار کی تعمیر کا کام لینے کے ساتھ ساتھ اسے محض مسدس بنا کر اس کی انفرادیت اور اس کی خصوصی حیثیت کو ختم کرنا نہیں چاہتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا مرثیہ خواہ واقعات کربلا کے متعلق ہو یا ان واقعات سے ہٹ کر اپنی ہیئت اور روح دونوں حیثیتوں سے محض مسدس نہیں ہوتا بلکہ مکمل مرثیہ ہوتا ہے۔ اس حیثیت سے بھی نسیم امروہوی مرثیہ نگاری کے میدان میں بالکل منفرد نظر آتے ہیں۔

نسیم امروہوی کے مراثی کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دراصل "فکر و نظر اور عزم و عمل" کو مرثیے کی اصلی روح خیال کرتے ہیں کیونکہ یہی روح معرکۂ کربلا کے آئینے میں بھی نظر آتی ہے۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ ائمہ اہل بیت

اور شہدا علیہم السلام سے مسلمان کو بجا طور پر جو عقیدت ہے وہ ہرگز اس کی مقتضی نہیں کہ ان کے جذبۂ عمل اور اس کے توابع کا ذکر کرکے، قوم سے یہ خطاب کیا جائے کہ تم بھی ایسے کارنامے انجام دو، کیونکہ ان ذوات مقدسہ کے کارنامے اس تصور سے بالاتر ہیں۔ غالباً اس دشواری کا حل تلاش کرنے میں نسیم امروہوی نے اپنے لئے یہ نئی راہ نکالی ہے اور وہ یہ کہ ۱۹۵۸ء میں اور اس کے بعد اب تک انہوں نے متعدد علما و فضلا و خطبا کی موت پر طویل مرثیے کہے جن میں اُن کی علمی وسعتیں اور سیرت و کردار کی عظمتیں دکھا کر، کھلے لفظوں میں قوم کے ہر فرد کو انھیں کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی ترغیب دی ہے۔ نسیم صاحب سے پہلے کسی اور شاعر نے اس وادی میں قدم نہیں رکھا تھا اور نہ ان کے پیش کئے ہوئے نمونے موجود ہونے کے بعد اب تک کسی نے کوئی ایسا مرثیہ کہا ہے جس میں اس انداز سے تحریک عمل کی گئی ہو۔ میرے دوست جناب عبدالرؤف عروج نے مجھے بتایا کہ وہ نسیم صاحب کی مرثیہ گوئی کے اس پہلو پر خصوصیت کے ساتھ ایک مقالہ لکھ رہے ہیں جو شاید اسی مجموعۂ مضامین میں شامل ہوگا۔ اس لئے میں اس پر مزید کچھ لکھ کر تکرار موضوع نہیں کرنا چاہتا تاکہ ناظرین پر بار گزرے۔

نسیم امروہوی کی خلاق طبیعت صرف علمائے حق کے مرثیے تصنیف کرنے پر قانع نہیں رہی بلکہ انھوں نے مرثیوں کے قالب میں قرآن کی تفسیر کو بھی ڈھالا ہے۔ کراچی کے بیشتر اہل ذوق اور دینی مشاغل سے دلچسپی رکھنے والے افراد کو اس بات کا یقیناً علم ہوگا کہ علامہ رشید ترابیؒ جب تک حیات رہے اپنی قیامگاہ پر ہر سال رمضان کے مہینے میں قرآن کی تفسیر بیان فرماتے تھے نسیم صاحب بالالتزام شرکت فرماتے تھے اور چاند رات کو علامہ مرحوم اپنی تقریر کی بجائے ایک محفل خاص کر نسیم صاحب کے پڑھنے کے لئے منعقد فرماتے تھے، جس میں نسیم امروہوی پورے مہینے بیان کی ہوئی تفسیر اپنے مخصوص انداز اور الفاظ میں نظم کرتے تھے اور

یہ تفسیران کے تازہ ترین مرثیے کا جزو قرار پاتی تھی۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ بیانِ تفسیر کے اِن مرثیوں میں بھی، نسیم صاحب نے مرثیہ کی ہیئت اور روح کو برقرار رکھا ہے:

(سورۂ مریم)

جلالت ذکریّا ہے سورۂ مریم — عنایت صمدیہ ہے سورہ مریم
سکوت[1] کا نظریہ ہے سورۂ مریم — طریق حق میں تقیہ ہے سورہ مریم

یہ کاف ہا جو ہے یا عین صاد سے پہلے
ارادۂ ازلی ہے مراد سے پہلے

مُقطّعات ابھر کر یہ دے رہے ہیں صدا — مراد کاف[2] سے ہے کربلا و کرب و بلا
وہ ہا سے ہے جو ہویدا ہلاکت شہدا — تو یا یزید کی قاتل کا دے رہی ہے پتا

الف جو عیؔ پہ ہے مد کی طرح عیاں دیکھو
سر یزید پہ ہے گرز کا سماں دیکھو

ہوئے ہیں اور جو دو حرف اس کے بعد ارشاد — عطش کا ش ہے ایک اور ایک صبر کا صاد
ہیں جو کاف سے تا صاد ہے یہ مضموں یاد — ذکیوں ہو یاد، کیا ہے امام عصر نے صاد

ہے عین و صاد کے مد کی غرض جلیل بہت
عطش طویل ہے اور صبر بھی طویل بہت

—— اس سلسلے میں اس حقیقت کی نشان دہی کرنا میں چنداں ضروری نہیں سمجھتا کہ کوئی شاعر اس وقت تک تفسیر قرآن پر مبنی مراثی تصنیف کرنے کا تصور بھی

---

[1] روزہ مریم کی طرف اشارہ، جس کا اس سورے میں ذکر ہے
[2] تفسیر امام زمانہؑ سے ماخوذ [3] کھیعص

نہیں کرسکتا جب تک اسے عربی زبان، قرآن، تفسیر، حدیث اور رجال میں دستگاہ کامل حاصل نہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ ادب پر بھی اتنی قدرت ہو کہ اس خشک موضوع میں لطافتیں اور لفظی و معنوی محاسن پیدا کرسکے، ممکن ہے یہی وجہ ہو کہ دیگر شعرائے کرام نے جنھیں اللہ تعالیٰ نے شاعرانہ صلاحیتوں سے نوازا ہے، تفسیر قرآن پر مرثیے لکھنے کا خیال نہیں کیا۔ اس قسم کے مرثیے لکھنے کا ایک اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو مطالعۂ تفسیر کی سعادت نصیب نہیں ہوتی وہ بھی ان کے ذریعہ سے قرآن کی تفسیر کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل کرسکتے ہیں، چونکہ نثر کے مقابلے میں نظم زیادہ دل پذیر ہوتی ہے، جلد یاد بھی ہو جاتی ہے اور اس کے تاثرات بھی نثر کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ عرصہ تک دل و دماغ پر مرتسم رہتے ہیں، اس لئے اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ ان مرثیوں کے مطالعہ سے عام لوگوں میں بھی قرآنی علوم اور تفسیر و حدیث کے مطالعہ کا ذوق بڑھے، دنیا کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اہل بیت اطہار کے کردار اور قرآن کی تعلیمات کتنی ہم آہنگ بلکہ ایک دوسرے کا جزو لاینفک ہیں۔ ان مرثیوں کی وجہ سے بہت سے قرآنی الفاظ، علم حدیث و تفسیر وغیرہ کی اصطلاحات، بعض مفسرین و محدثین کی شخصیت سے بھی عوام واقفیت حاصل کرسکتے ہیں اور اردو زبان کے ثقہ الفاظ کے ذخیرے میں بھی مفید اور گراں قدر اضافہ ہوتا ہے، نیز بہت سی قرآنی تلمیحات اور واقعات سے بھی مرثیے کے قاری اور سامع واقف ہو جاتے ہیں۔

نسیم امروہوی کی مرثیہ نگاری کا یہ پہلو بھی منفرد اور ممتاز ہے اور غالباً کوئی دوسرا مرثیہ گو اس میدان میں اُن کا شریک و سہیم نہیں۔

اردو مرثیہ کا دامن بے شمار خوبیوں اور ممتاز خصوصیات سے مالا مال ہے اس کے باوجود اس دامن کو مزید منفرد خوبیوں اور ممتاز خصوصیات سے مالا مال کرنے

کے وسیع امکانات موجود تھے اور ہیں۔ ہر اچھے شاعر نے اپنی فکر اور توفیق کے مطابق اس دامن کو انمول جواہر سے بھرنے کی کوشش کی اور یہ کوششیں ابھی جاری و ساری ہیں۔ جن شعرائے کرام نے مرثیہ کا بنیادی ڈھانچا تیار کیا تھا اُن کے پیش نظر فارسی اور عربی ادب کے علاوہ مغربی ادب کا نہ تو کوئی نمونہ تھا' اور اگر ہوتا بھی تو وہ شاید اس سے استفادہ نہ کرتے' کیونکہ وہ نمونے اُن کے نزدیک مرثیے کے دائرہ کار اور مقصدیت کے منافی تھے غالباً یہی وجہ ہے کہ اردو مرثیہ کا دامن "نریٹو" (بیانیہ) داستان اور افسانے سے بالکل خالی رہا۔ البتہ نسیم امروہوی نے دو مرثیے اس خاص انداز میں لکھ کر اس کمی کو بھی پورا کر دیا ہے۔ ایک مرثیہ میں جس کا مطلع ہے:

عہدِ رفتہ کی طرح گو منتشر اب ہم نہیں

—— واقعات کربلا کو چاند کی زبانی بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ چاند دن میں نہیں ہوتا اس لیے چاند کی زبانی عشرہ محرم کی راتوں کا حال بیان کیا گیا ہے اور دوسرے مرثیہ میں "دن" کے واقعات کربلا سورج کی زبانی بیان کئے ہیں جو دن میں نمودار ہوتا ہے اول الذکر مرثیہ میں اُن مصائب کا حال درج ہے جو سنہ ۶۱ھ کا ہلال محرم دیکھنے کے وقت سے شب یازدہم محرم تک' امام مظلوم پر گزرے' میں' جو کم و بیش پچیس بند پر مشتمل ہے' بڑے پُر امید لہجے میں قوم کو عزم و عمل پر ابھارا ہے اور اسلاف کے دلیرانہ کارنامے یاد دلائے ہیں' یہ مرثیہ بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ نسیم امروہوی مرثیہ کے ذریعہ اصلاح قوم و معاشرہ کا کام لینا چاہتے ہیں۔ میرے پاس اس مرثیہ کا جو نسخہ ہے اس پر سنہ تصنیف درج نہیں' لیکن اس کے مضمون سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ زیادہ پرانا نہیں کیونکہ اس میں جا بجا تسخیر ماہ کا ذکر آیا ہے۔

اس مرثیہ میں انھوں نے ماضی کو پلٹ کر دیکھنے اور اس پر افسوس کرنے کی بجائے مستقبل پر ایک نئے عزم و ولولہ کے ساتھ نظر رکھنے' نئے حالات اور تقاضوں کو

سمجھنے، مستقبل کو سنوارنے کے لیے جدوجہد کرنے کی بڑے دلپذیر انداز میں تلقین کی ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات برسبیل تذکرہ یہ بھی کہتا چلوں کہ مرثیہ خواہ قدیم رنگ کا ہو یا جدید رنگ کا، اس کا موضوع تفسیر قرآن ہو یا تسخیر ماہ، آگ ہو یا پانی، قلم ہو یا چراغ، جمہوریت ہو یا آمریت، عدل ہو یا ظلم اگر اس کے ہر بند اور ہر مصرع میں مرثیہ کی روح سمائی ہوئی نہ ہوئی تو پھر اسے کسی صورت میں مرثیہ نہیں کہا جا سکتا خواہ فنی حیثیت سے وہ کتنا ہی بلند پایہ مسدس کیوں نہ ہو۔ اس دور کے بعض بہت اچھے مسدس پڑھنے کا مجھے اتفاق ہوا۔ ان میں سے بلا مبالغہ بعض مسدس ایسے ہیں جو شاعری کا معیاری نمونہ قرار پا سکتے ہیں لیکن وہ مرثیہ کی روح سے بالکل عاری ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ ان مسدسوں کے آپ بند کے بند علیحدہ کر کے شائع کیجیے یا کسی رومانوی قسم کے ادب میں جوڑ دیجیے تو کوئی شخص یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ یہ بند کسی مرثیہ کے ہو سکتے ہیں۔ اس رجحان کے برعکس نسیم امروہوی صاحب کے مرثیوں کی ایک منفرد اور ممتاز خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا مرثیہ خواہ کسی موضوع پر ہو، ان کے ہر بند بلکہ بیشتر مصرعوں میں مرثیہ کا مزاج ملے گا۔ مثال کے طور پر اسی مرثیہ کو لے لیجیے جس میں چاند کی زبانی واقعات کربلا بیان کیے گئے ہیں۔ اس مرثیہ کا چہرہ اگرچہ قوم کو ابھارنے کے مضامین پر مشتمل ہے لیکن ہر بند زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں مرثیہ کا بند ہوں:

قوم بھی وہ قوم جو تیغوں کے سائے میں پلی
سر کٹانا جس کا ادنیٰ کھیل ایسی من چلی
جس کا خوں تاریخ جاں بازی کا عنوان جلی
رزم گاہ دہر میں نعرہ ہے جس کا یا علی

زندگی جس کی شجاعت جس کا میداں کربلا
تن مدینہ، سر نجف، دل سامرا، جاں کربلا
ہر نفس جس کا جلالِ نعرۂ تکبیر ہے
مصحفِ ایمان کی جو بولتی تصویر ہے
جس کی شمعِ راہِ منزل اُسوۂ شبیر ہے
پشت پر جس کی کا دستِ خیبر گیر ہے
دم فنا ہو جائے دم میں یہ جسے للکار دے
ایسے ویسے کی نہیں ہیرو کہ ہمت ہار دے

انگلیاں جس کی درِ خیبر گرانے کے لئے اور کمر لاشیں جوانوں کی اٹھانے کے لیے
آگے چل کر جب چاند انسان سے محوِ گفتگو ہوتا ہے تو چاند ہماری بے حسی کو اس انداز میں بیان کرتا ہے:

تیرا رشتہ اُس جلالِ کبریا سے اُستوار
جو براقِ برقِ ایمن کا حقیقی شہ سوار
کُل ستارے جس کی گردِ پائے دلدل پر نثار
ایک صورت، پانچ جلوے، قدرتِ پروردگار
مقصدِ تطہیر ان پانچوں سے پورا ہو گیا
مصحفِ عصمت کا گویا پنج سورہ ہو گیا
اِن نفوسِ پاک کی اُلفت کا جو ہے مدعی
فرض ہے اُس پر تولّا کے سوا کچھ اور بھی
یہ ہے اک مانا ہوا محکم اصولِ زندگی
دوست کی مرضی پہ چلنا ہے شعارِ دوستی

عشقِ صادق ذوقِ تسلیم و رضا کا نام ہے
یہ نہ ہو تو دوستی ناکام الفت خام ہے
دوستی کی شرط کیا ہے جذبۂ الفت سے پوچھ
منزلیں اس کی کلام اللہ کی آیت سے پوچھ
بسترِ ختم الرسل سے اور شبِ ہجرت سے پوچھ
دل میں جو کفار کے بیٹھی تھی اس ہیبت سے پوچھ
دوستی کا مدعی۔ محبوب کے فرمان سے
سو رہا تھا زد میں تلواروں کی اطمینان سے

—— اس موقع پر ایک ادبی نکتہ کی طرف اشارہ کرتا چلوں تو نامناسب نہ ہوگا۔ بند کے آخری مصرع میں یعنی "سو رہا تھا زد میں تلواروں کی اطمینان سے" "زد" کا لفظ استعمال کر کے خطرات کی نشاندہی کی ہے اور اس طرح اطمینان قلب کو زیادہ اجاگر کر دیا ہے۔ اس موقع پر عام طور سے لوگ "زد" کی بجائے "تلواروں کی چھاؤں" استعمال کرتے ہیں۔ لیکن "چھاؤں" کا لفظ محض خطرے کی نشاندہی نہیں کرتا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ "چھاؤں" حفاظت کے لئے ہو، یہ ابہام "زد" میں نہیں۔

چاند کی گفتگو جاری ہے اور پھر وہ شاعر سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

میں نے یہ مانا کہ گریہ ہے ترا اک فرض عین
جو ہے صدیوں سے شعور انجمن کی زیب و زین
باادب اتنی گذارش ہے کہ وقت شور و شین
آنسوؤں کے آئینے میں دیکھ کردار حسین
راس آیا تجھ کو رونا، خوب رو جی کھول کر
روح کو لیکن ترازو میں ولا کی تول کر

یہ وہی مضمون ہے جس کو ذہن نشین کرانے کے لیے نسیم نے عمر بھر جدوجہد کی ہے اور یہی ایک بات طرح طرح سے کہی ہے۔ اور اس طرح قوم میں شعوری اور غیر شعوری طور سے "تاسیِ امام" اور "عزم و عمل" کا ذوق پیدا کیا۔ مرثیے میں اس حصے کے بعد تمام شہدائے کربلا کے کردار، اُن کی سیرتیں، ان کے ولولے، عبادت کا ذوق و شوق، پھر شہادت کا بیان اور شہادت کے بعد خیام شاہ کا نذر آتش کیا جانا، مال و متاع کی لُٹس اور شام غریباں کے مناظر بیان کیے ہیں۔ اس انداز خاص سے واقعات کربلا کو پیش کر کے نسیمؔ امروہوی نے نئے لکھنے والوں کے لیے مرثیے کے ایوان میں ایک اور روشن دان کا اضافہ کیا ہے، جس کے ذریعے دنیا بھر کی روشنی اس کے وسیع صحن میں پھیل سکتی ہے۔

حسین اعظمی
۲۰ر دسمبر ۱۹۷۴ء

نسیم امروہوی کے مرثیے میں

عمل اور تحریک عمل کے نئے پہلو

عبدالرؤف عروج

۱۸۵۷ء کے بعد ہمارے سیاسی اور سماجی زندگی نے پلٹا کھایا۔ معاشی اور اقتصادی حالات میں میکانیکی تبدیلیاں آئیں۔ ادب میں بھی نئے نئے اسالیب اور خیالات کا اضافہ ہوا، لیکن مرثیہ کی فضا کسی تغیر سے آشنا نہیں ہوئی۔ وہی چہرہ، وہی آمد، وہی رجز، وہی گھوڑا، وہی تلوار، وہی رزم، غرض مرثیے کے سارے اجزا وہی رہے جن کو پہلی مرتبہ ضمیر نے مرتب کیا تھا۔ ان میں کہیں کوئی نئی بات نظر نہیں آتی تھی جو متقدمین اور متاخرین میں وجہ تفریق بن سکے۔

ایسا کیوں ہوا؟ اس کی کئی وجوہ ہیں، ان میں سب سے بڑی ایک وجہ یہ تھی کہ انیس نے اپنی خلقی صلاحیتوں سے مرثیے کا جو احاطہ کھینچا تھا اور دنیا بھر کے اعلیٰ مضامین کے جو دریا بہائے تھے ان کو عبور کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ لوگ محسوس کرنے لگے تھے: یہ زمین انیس کی حدود کے باہر بالکل بنجر ہو گئی اب اس میں جو برگ و بار پیدا ہوں گے ان میں کوئی تازہ اضافہ پھل پھول نہیں سکے گا۔ بعد کے مرثیہ نگاروں نے اس اعتراف شکست کے بعد خود پر مزید غور و فکر کی راہیں بند کر لیں اور اسی خرمن کی خوشہ چینی کرنے لگے جسے انیس نے فراہم کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان مرثیہ گویوں کو سوسائٹی کی شکست و ریخت اور سرپرستوں کے

عزل ونصب سے یہ بھی احساس ہوگیا تھا کہ اب ان کا کوئی قدر دان نہیں رہا ہے۔ سخن شناسوں کی مرکزیت ختم ہوگئی ہے۔ وہ اگر مرثیہ میں کسی قسم کی جدت سے کام بھی لیں تو اس کی داد کون دے گا۔ چونکہ مرثیہ ان کے لیے ذریعہ معاش بھی تھا اور وسیلۂ نجات بھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر انھوں نے اس کے پرانے اسلوب، اور روایتی طرز کو برقرار نہیں رکھا تو اس کی حیثیت چھوٹے نگوں کی مرصع کاری کی سی ہوکر رہ جائے گی۔ اس صورت حال میں غیر کی مدح نہ کرنے والے شاعر کے پس ماندگان مرثیہ میں کسی قسم کا اضافہ تو کیا کرتے، انھوں نے پٹنہ، بنارس اور حیدر آباد کے امیروں کے قصیدے لکھ کر اس پندار کو بھی ٹھکانے لگا دیا جسے ان کے بزرگوں نے بچا رکھا تھا۔

مرثیہ نگاروں کے لیے ایجاب قبول کا یہ دور بڑا عجیب تھا۔ زمانے کی تیز رفتاری ان سے کچھ اور تقاضا کر رہی تھی اور وہ اس سے لاتعلقی کا اعلان کرکے کچھ اور کہہ رہے تھے، لیکن اسی دور میں بعض ایسے بھی تھے جن کا کہنا تھا کہ وہ نیا مرثیہ کہیں گے اور اگر اس میں جدت نہیں ہوگی تو پھر اپنی زبان پر بھی اس صنف کا نام نہیں لائیں گے، ان بزرگوں میں شاد عظیم آبادی کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ بنیادی طور پر مرثیہ کے شاعر نہیں تھے۔ لیکن انھوں نے انیس اور دبیر کی صحبتیں دیکھی تھیں اور ان سے فیض اٹھایا تھا۔ مرثیے کے فن اور تکنیک میں ان کو اس اعتبار سے بھی مہارت تھی کہ ان کا شعور یہ تنقید دوسرے شعراء کے مقابلہ میں بڑھا ہوا تھا، انھوں نے شعوری طور سے مرثیے کے فن اور اس کی ہیئت کا تجزیہ کیا۔ پرانے مکتبۂ فکر سے ہٹ کر نئے راستے نکالے۔ روایت کی اثر پذیری اور درایت کی شادابی اور شگفتگی کا سماں باندھا۔ اس کے باوجود ان سے اس سلسلہ میں ایسا کوئی کارنامہ

سرانجام نہیں پا سکا جس کو ہم کوئی قابلِ ذکر اضافہ کہہ سکیں۔

شاد کے معاصرین میں سے کسی نے بھی زمانے کے تقاضوں کو سمجھنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ ان کی نگاہ ماضی سے ہٹ کر مستقبل کے اثبات کی طرف نہیں جاتی تھی، ان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے بزرگوں کے اصولوں سے بغاوت کر دیں۔ انھوں نے مرثیے کی گرتی ہوئی دیوار کو تغزل کے ذریعہ سنبھالنے کی کوشش کی، لیکن انیس کے قصرِ معلیٰ کے سامنے خود ایک خام عمارت کی طرح مٹی کا ڈھیر ہو کر رہ گئے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں لوگوں نے پہلی مرتبہ ادب کے ذریعہ تہذیبی اور سماجی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی اور اپنی محرومیوں، ناکامیوں اور مایوسیوں کا مداوا کرنا چاہا تو اور اصناف کے ساتھ ان کی نگاہ مرثیے پر بھی گئی۔ ان میں پہلا نام نسیم امروہوی کا لیا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔

نسیم امروہوی نے جس زمانے میں اپنی مرثیہ گوئی کا آغاز کیا، وہ سماجی اور سیاسی اعتبار سے بڑا پر آشوب تھا۔ انگریزوں نے ملکی اصلاحات کے نام سے برصغیر پر اپنی گرفت مضبوط تر کر دی تھی، اس سے چھٹکارا پانا دیوانے کا خواب معلوم ہوتا تھا، مسلمانوں کی سیاسی حیثیت اور سماجی حالت بد سے بدتر ہو چکی تھی۔ اقتصادی اور معاشی سانچے تہس نہس ہو گئے تھے، دست کاروں کے انگوٹھے کاٹ دیئے گئے تھے۔ دیسی صنعتوں کے خاتمہ نے گھر گھر بے روزگاری اور پریشاں حالی کو عام کر دیا تھا۔ مادّی مشینوں کی رو داد میں روحانیت اور مذہبیت غائب ہوتی جا رہی تھی۔ تعلیم کا ہیولا، ایک جسمِ مردہ بن کر رہ گیا تھا۔ سیاسی زوال اور سماجی انحطاط مسلمانوں کا مقدر بن چکا تھا۔ اس پر آشوب دور نے جہاں بڑے بڑے

شوخ بیانوں کو گونگا کر دیا وہیں بعض خفاش صفت آنکھیں حقائق کا سامنا کرنے سے چندھیانے لگیں۔ ہر شخص زبانِ حال سے کہتا تھا حقائق سے آنکھیں بند کر کے خود فریبی کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاؤ۔ تمہیں کوئی نہیں پوچھے گا۔ یہ کسی ایک شہر یا علاقے کی بات نہ تھی۔ پورے ملک کا یہی نقشہ تھا، شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک، ہر جگہ کے رہنے والے شدید معاشی و معاشرتی عذاب سے دوچار تھے،

اس پر آشوب دور کی شاعری پر نظر ڈالیے، کہیں بھی زندگی کا حوصلہ یا جینے کی امنگ نہیں ملے گی۔ ملک کا ذہین طبقہ شاعری میں یاسیت، محرومی اور غم کے مضامین تلاش کر رہا تھا۔ غمِ دوراں کو غمِ جاناں بنانے کی خواہش شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ افرادِ قوم کے اعصاب پر بے حسی اس قدر غالب آچکی تھی کہ وہ اپنے ذہن کے کواڑوں کو کھولنے اور اس سے باہر جھانکنے تک کے روادار نہیں تھے۔ نسیم امروہوی نے اس پر آشوب دور میں آنکھ کھولی، ہوش سنبھالا، آبا و اجداد کی مرثیہ گوئی کا چرچا سنا، گھرانے کے بزرگوں کو مرثیہ پڑھتے دیکھا۔ خود بھی کہنے کی کوشش کی اور ۲۸ جولائی ۱۹۲۳ء کو ایک نئے ولولے اور حوصلے کے ساتھ اپنا پہلا مرثیہ:

تجھ میں اے باغِ وطن اب گلِ خوش رنگ نہیں

مکمل کر لیا۔ اس مرثیہ کا چہرہ اس دور میں لکھے جانے والے مرثیوں سے قطعی مختلف ہے۔ چہرے کے لیے مرثیہ نگاروں نے کوئی جچا تلا اصول مقرر نہیں کیا ہے۔ لیکن عموماً اس میں قصیدے کی تشبیب کے طور پر، نیرنگیِ دنیا، گل و بلبل، مناجات و دعا یا اور اسی قسم کے مضامین نظم کیے جاتے ہیں۔ بعض

مرثیہ گویوں نے چہرے کو اپنے زورِ بیان کی ستائش اور مضمون آفرینی کی تعریف کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ نسیم نے اپنے مرثیے کے چہرے میں یہ روایتی انداز اختیار کرنے کی بجائے اپنے دور کے حالات اور گرد و پیش پر نظر ڈالی ہے۔ اور اس سے افرادِ قوم کی اصلاح و تربیت کا کام لیا ہے اور ان میں عمل اور تحریکِ عمل پیدا کرنے کی سعی کی ہے:

تھرتھراتے ہیں قدامت کے فلک بوس محل
گھر کے آئے ہیں تجدد کے بھیانک بادل
سنبھل اے رہروِ گم گشتۂ ایام سنبھل
ہر قدم اک نئی آفت ہے ذرا دیکھ کے چل
چھپ کے بیٹھا ہے تری گھات میں دشمن تیرا
کہیں کانٹوں میں الجھ جائے نہ دامن تیرا

سیلِ آفات کی زد میں ہے نظامِ ہستی
خونِ اقوام سے لبریز ہے جامِ ہستی
منچلے شیروں کا طالب ہے دوامِ ہستی
موت کے ہونٹوں پہ ہے آج پیامِ ہستی
وہی زندہ ہے جو کچھ کام یہاں کر جائے
اس میں مرنے کی ضرورت ہو تو پھر مر جائے

سہل ہے اس کے لیے منزلِ سنگینِ حیات
جس کے قدموں کی ودیعت ہو پہاڑوں کا ثبات
شعلۂ غم ہے فقط موجبِ تکمیلِ صفات
آگ میں تپ کے نکھر جاتی ہے فولاد سی ذات

جی گیا وہ قتیلِ غمِ ایام ہوا
کام سے کام رہا، کام ہوا نام ہوا

عالمِ نزع میں ہے ماضی و حاضر کا نظام
زیرِ شمشیر تڑپتی ہوئی دنیا کو سلام
دامنِ کلفت و غم میں ہے دوامی آرام
شبِ تاریک کے ہونٹوں پہ سحر کا ہے پیام

روح کو خواب سے بیدار کریں گے ہم بھی
عزم - اور عزم علمدار کریں گے ہم بھی

یہ اگر سچ ہے کہ ماضی ہے متاعِ عزت
کم نہیں اپنی روایاتِ کہن کی عظمت
سببِ نازِ مورخ کو ہماری مدحت
ہم نے تاریخ کو بخشی ہے دوامی شہرت

ہم ہیں اصنام کی ہستی کے مٹانے والے
ہم ہیں چولیں درِ خیبر کی ہلانے والے

ہم ہیں عرفان و حقیقت کے پرستاروں میں
کلمہ ہم نے پڑھا تیغوں کی جھنکاروں میں
سر جھکایا نہ کبھی ظلم کے درباروں میں
انتہا یہ کہ چنے بھی گئے دیواروں میں

سبزہ باغ ہوا ذوق نمو سے اپنے
ہم نے اسلام کو سینچا ہے لہو سے اپنے

بن کے سیلاب جو پھر سوئے رہ ہستی میں رواں

غرق ہو ظلم کا بیڑا وہ تلاطم ہو عیاں
ہاں دلیرو وہ سمتیں گھور رہا ہے طوفاں
جس کے سینے پہ ہیں قوموں کے سفینے لرزاں
اک تھپیڑا جو کہیں دو ابھی پتواروں کا
پھر کے رہ جائے گا منہ بپھرے ہوئے دھاروں کا

اب اسی قوم کے جم سکتے ہیں میداں میں قدم
جز خدا غیر کی ڈیوڑھی پہ نہ سر جس کا ہو خم
ولولہ دل میں ہو اور دوش پہ ہمت کا عَلَم
قوتِ بازوے عباسِ دلاور کی قسم
امتحاں لاکھ ہوں پروا دمِ پرواز نہیں
کربلا زندہ حقیقت ہے کوئی راز نہیں

کربلا دور نہیں تم سے، اٹھاؤ تو نظر
کربلا سامنے موجود ہے، دیکھو تو اُدھر
وہ شبیں ظلم و ستم کی وہ بھیانک منظر
سہما سہما سا وہ جھرمٹ میں ستاروں کے قمر
چاندنی زرد تھی گردوں کی ردا کالی تھی
شام کے اتنے تھے لشکر کہ فضا کالی تھی

یہ اسی دور میں ایک انقلاب پسند شاعر کے مرثیے کا چہرہ ہے جبکہ غزل نے لوگوں کے ذوقِ سماعت کو بڑی حد تک بگاڑ دیا تھا۔ وہ پست، مبتذل اور عامیانہ خیالات کے عادی ہو چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے ذہن میں مرثیے کا ایک اور ہی تصوّر موجود تھا۔ وہ اس میں کسی ایسی بات کو سننا نہیں

چاہتے تھے جوان کو اپنی خامیوں اور سماجی برائیوں کا احساس دلائے۔ ان کے لیے مرثیے کا یہ چہرہ اپنے موضوع اور اصلاحی پیغام کے لحاظ سے نامانوس تھا۔ عمل اور تحریک عمل سے ان کے روایتی ذوق کی تسکین ممکن نہیں تھی۔ اس مرثیے کے ٹھیک بارہ سال بعد ترقی پسند مصنفین کانفرنس منعقد ہوئی اور اس کے ذریعہ ترقی پسندانہ ادب کی تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اس تحریک نے ہماری زبان و ادب میں بڑی بڑی تبدیلیاں کیں۔ لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ کہیں یہ تحریک موجودہ نسل کی ذہنی بغاوت کی مسخ شدہ شکل تو نہیں ہے۔ اس تحریک نے ادب کی تمام روایتوں کو، اپنے کاندھے سے اتار کر پھینک دیا۔ ادب، زندگی اور اس کے مسائل سے عبارت سمجھا جانے لگا۔ اور عام طور پر یہ بات کہی جانے لگی کہ ادب کو اپنے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں نسیم امروہوی کے مرثیوں میں مقصدیت کی لگن بلاشبہ ان رجحانات اور میلانات کی تصویر کشی کرتی ہے جو ترقی پسند ادب کی تحریک کا بنیادی پتھر تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نسیم امروہوی کا سماجی اور سیاسی شعور ترقی پسند تحریک کے آغاز سے بہت پہلے جاگ چکا تھا اور انھوں نے اپنے مرثیوں کے چہرے سے واضح طور پر عمل اور تحریک عمل کی دعوت دی تھی۔ اگر اس سلسلے میں کوئی نقاد نسیم کے مرثیوں کے بارے میں یہ کہے کہ ان کے یہاں شاعرانہ محاسن نے مقصدی آب و رنگ کو چھپا دیا ہے یا ان کے مدعیانہ تخاطب سے ہم بہت کم بصیرت حاصل کرتے ہیں تو بڑی عجیب بات معلوم ہوگی، کیونکہ جہاں تک مدعیانہ تخاطب کا تعلق ہے وہ حالی سے لیکر اقبال تک اور اقبال سے لیکر جوش اور ان کے بعد تک کے شعراء کے یہاں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے،

اور ان کے علاوہ بھی بہتوں کی شاعری مدعیانہ تخاطب سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن وہ اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کو اور ان کی شاعری کو کس خانے میں رکھا جائے گا؟ — جب ترقی پسند ادب کی تحریک اپنے ارتقائی مراحل سے گذرنے لگی اور ادیبوں اور شاعروں نے خاص مقصدیت سامنے رکھتے ہوئے گرد و پیش کے حالات پر سوچنا اور لکھنا شروع کیا تو مرثیے میں بھی جدید رجحانات اور میلانات جگہ پانے لگے جن سے شاعروں کا بہت بڑا طبقہ متاثر ہوا۔ جوشؔ کی مذہبی نظمیں اسی کی ایک کڑی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے طویل مسدس "آوازۂ حق" کا ذکر ناگزیر ہے۔ جس زمانہ میں یہ مسدس لکھا گیا تھا، خلافت اور عدم تعاون کی تحریکیں شباب پر تھیں، جوشؔ نے اپنے اس مسدس کے ذریعہ آزادی کی تحریکوں کو آگے بڑھایا، اور اس کے کئی سال بعد جب پورا ملک آزادی کی جنگ میں اہم مراحل سے گزرنے لگا تو اور فضائیں "ہندوستان چھوڑدو" کے نعروں سے گونجنے لگیں تو جوشؔ نے ایک دوسرا مسدس "حسینؑ اور انقلاب" لکھا۔ جس میں انگریزوں اور ان کے کاسہ برداروں کو شمر اور یزید قرار دیتے ہوئے قوم سے عزم حسینی کی طلب کی گئی۔

یہ باتیں اس دور کے نوجوانوں کے لیے نئی اور اہم تھیں زندہ باد اور مردہ باد کے نعرے اپنے اندر بڑی جاذبیت رکھتے تھے۔ جوشؔ نے انگریز دشمنی میں کربلا کے واقعہ سے پورا فائدہ اٹھایا اور ایک حد تک آزادی کی تحریک کا ساتھ بھی دیا۔ جوشؔ مرثیے کے لوازمے اور مشکلات سے واقف ہیں۔ انھوں نے اپنے ان مسدسوں کو کہیں بھی مرثیے کا نام نہیں دیا۔ البتہ ان کے نقادوں نے ان کے ان مسدسوں کو مرثیہ کی تاریخ میں ایک اضافہ

قرار دیا اور اس کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکا کہ اچھے خاصے لوگ گمراہ ہو گئے۔ اگر ہم ان مسدسوں کو مرثیہ تسلیم کریں تو ہمیں اس کے موضوع اور فنی ضرورتوں کی از سر نو تعریف کرنا پڑے گی جس کا نتیجہ "محض بحث" ہو کر رہ جائے گا۔

جوشؔ توڑ پھوڑ کو اصل انقلاب سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک تخریب کے بغیر تعمیر ممکن نہیں تھی۔ وہ ہر پرانی چیز کو خواہ وہ اچھی ہو یا بری تہس نہس کر دینا چاہتے تھے۔ یہ انقلاب کا صحت مند تصور نہیں تھا۔ بلکہ اس کے پیچھے ایک ایسی تخریبی ذہنیت پروان چڑھ رہی تھی جس میں کسی واضح مقصدیت کے بغیر بغاوت کا عنصر شامل تھا۔ اس کی حیثیت ایک ایسے ابال کی سی تھی جو تیزی سے بیٹھ جاتا ہے۔ جوشؔ کے تصورِ "انقلاب" اور حسینؔ کے "انقلاب" میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ اس کے برعکس نسیمؔ امروہوی نے معاشرہ کی اصلاح اور نوجوانوں کی ذہنی اور فکری تربیت پر زور دیا۔ اِن کے نزدیک جب تک فکر میں تبدیلی پیدا نہ کی جائے، لوگوں کے غور و فکر کا انداز نہ بدلا جائے کسی ترقی پذیر معاشرے کا پیدا ہونا اور صحت مند انقلاب کا آنا ممکن نہیں۔ اِن کے یہاں جدیدیت کا تصور انارکی، انتشار، تخریب اور بربادی نہیں، یہ پرانی بنیادوں پر، نئی عمارت تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اِن کی جدیدیت تاریخی، تہذیبی اور سماجی قدروں سے ابھرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِن کے مرثیوں نے ہمارے ذہن میں وہ باتیں تصویروں کی طرح ابھو نے لگتی ہیں جن کا تعلق ہمارے شاندار ماضی سے ہے۔ ہمارا ماضی ہمیں کہیں مستقبل کی روشنی دکھاتا ہے اور کہیں اس کے سہارے ہم حال کی ارتقائی منزلیں طے کرتے نظر آتے ہیں۔ اس طرح اِن کی شاعری، عمل اور

تحریکِ عمل کی شاعری بن گئی۔ انھوں نے اس کے ذریعہ اپنے پڑھنے والوں میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ عزم و استقلال کی توانائی بخشی، اور انسانیت کو اخلاقی قوتوں کے ذریعہ برسرِ اقتدار رہنے کا موقع فراہم کیا۔ اس سلسلے میں ان کے نظریۂ شعر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو انتہائی مستحکم اور مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفے کی موشگافیوں سے پاک ہے۔

اس سے پہلے کہ اس پر مزید گفتگو کی جائے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ واقعہ کربلا تاریخ انسانی کا ایک عظیم المیہ ہے۔ اس کے اسباب و علل اور اثرات پر مختلف انداز سے گفتگو کی جاتی رہی ہے۔ پھر بھی اس کی اصل نوعیت کو تاریخ کے آئینہ میں بہ آسانی دیکھا جاسکتا ہے۔ بدی کی طاقتیں ہر دور میں دوسروں کے حقوق غصب کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس کے برعکس نیکی کا جذبہ دوسروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے سینہ سپر رہتا ہے۔ جب بھی بدی کی طاقتیں اقتدار میں آئیں، انھوں نے سب سے پہلے دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا۔ آزادیِ رائے پر پابندیاں عاید کیں، ذہنوں پر پہرے بٹھائے اور آزاد انہ طرزِ حیات کے دائروں کو تنگ سے تنگ تر کیا جس کے نتیجہ میں حق و باطل کی کشمکش اور نیکی و بدی کی آویزش نسل در نسل نوعِ انسان کے اعصاب پر طاری و جاری ہے۔ واقعہ کربلا اور اس کے محرکات اور ان کے پس منظر سے یہ بات خود بخود اجاگر ہو جاتی ہے کہ امام حسینؑ اور ان کے رفقا نے جس مشن کے لیے اپنی زندگی کی قربانی دی اور بدی کی طاقتوں کا سامنا کر کے ان کے پندار و غرور کو خاک بر سر کیا، اس کا سب سے پہلا اصول "دوسروں کو جینے دو" کا اصول تھا، امام حسینؑ اور ان کے رفقا کی زندگی کا یہی اصول

اور نظریہ، نسیم امروہوی کی شاعری کا اصل آہنگ ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں کئی جگہ اسی اصول اور نظریہ کی وضاحت کی ہے۔ ان کے ایک مرثیے (شہید معرکۂ جہد و ارتقا ہے حسینؑ) کے ایک بند کی یہ بیت:

فراتِ دہر کا پانی سبھی کو پینے دو
یہی ہے رازِ بقا دوسروں کو جینے دو

— ان کے نظریۂ شاعری کی بہترین ترجمان ہے۔

نسیم امروہوی نے دوسرے مرثیہ گویوں کی طرح واقعات کربلا کو اپنا موضوع بنایا اور اُن سے بصیرت اور روشنی حاصل کی ہے۔ مختلف کرداروں پر کہیں تفصیلی اور کہیں اجمالی گفتگو کی ہے۔ لیکن وہ اس پر قانع نہیں رہتے ہیں بلکہ پوری دیانتداری کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ قوم و ملّت کے اکابر کی زندگی اور ان کے کارنامے کبھی آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ہوں گے اور مرثیہ کے ذریعہ ان کو نہایت موثر طریقہ پر محفوظ کیا جا سکتا ہے۔

نسیم امروہوی نے مرثیہ کی حدود میں رہتے ہوئے کئی موضوعاتی اور فنی تجربے کیے۔ وہ جانتے ہیں کہ ابلاغ و پیغام کا پرانا انداز بڑا محدود ہے اور وقت گذرنے کے ساتھ اس کی افادیت اور ضرورت ختم ہونے والی ہے۔ اگر اس کو برقرار رکھا گیا تو مرثیے کی روایت کسی ترقی یافتہ صورت میں آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مرثیوں میں چہرہ، آمد، رزم، تلوار، گھوڑا اور ساقی نامے سے تقریباً انحراف کیا اور ان کی بجائے عزم، علم و عمل، اجتہاد اور ایسے ہی دوسرے موضوعات کو جگہ دی جن کا اظہار تاریخی اور فقہی علوم پر دسترس کے بغیر ممکن نہیں۔ وہ اپنے معاصرین کے مقابلے میں کہیں زیادہ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ ان کو فقہ، حدیث، تفسیر، کلام، منطق، تاریخ،

اور دیگر علوم پر کامل عبور حاصل ہے۔ وہ عروض ومعانی پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں، ۱۹۲۹ء میں ان کی مشہور کتاب "معراج العروض" انوار احمدی پریس الٰہ آباد سے شائع ہوئی تھی، اور ۱۹۳۳ء میں ان کی نسیم البلاغت جو معانی وبیان کے علوم پر مشتمل ہے یوپی کے امتحانات انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں داخل کی گئی تھی جو اب تک درسیات میں شامل ہے۔ ان کے علم وفضل کے پیش نظر ہم انھیں عام مرثیہ نگاروں کے زمرے سے ہٹ کر دیکھنا چاہتے ہیں۔ نسیم اپنا ایک مخصوص مکتبۂ فکر رکھتے ہیں اور انھوں نے مرثیے میں جذبات کی بجائے علمی سنجیدگی کی فضا پیدا کی ہے۔ اردو ادب کو پہلی مرتبہ قوم وملت کی عظیم شخصیتوں کے شخصی اور انفرادی مرثیوں کے صحیح تصور سے آشنا کیا اور ان مرثیوں کے ذریعہ آنے والی نسلوں کو عمل اور تحریک عمل کے کئی پہلو دکھائے۔

تاریخ ادب میں شخصی اور انفرادی مرثیوں کو پہلی مرتبہ عربوں نے رواج دیا تھا۔ اس سلسلے میں عرب کی مشہور شاعرہ خنسار کا وہ مشہور مرثیہ یاد رکھنا چاہیے جو اس نے اپنے بھائی کی وفات پر کہا تھا۔ فارسی میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں، فرخی نے محمود غزنوی کی وفات پر جو مرثیہ کہا ہے وہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے لیکن اس کی حیثیت فردوسی کے اس مرثیہ کی نقالی سے زیادہ نہیں جو اس نے شاہنامہ میں سہراب کی ماں کی زبان سے کہا ہے۔ ہمارے ادب کا دامن اس معاملہ میں بڑی حد تک تہی رہا۔ اگرچہ حالیؔ نے غالبؔ کا، غالبؔ نے عارفؔ کا، اقبالؔ نے داغؔ کا اور چکبستؔ نے گوکھلے کا مرثیہ کہا ہے، لیکن انھیں مرثیہ کہنا اس لحاظ سے درست نہ ہوگا کہ ان میں مرثیے کی ضرورتیں ملحوظ نہیں رکھی گئیں۔ اس کی تکنیک اور اصولوں

کو کبھی معیار نہیں بنایا تھا - اس کے لکھنے والوں کو مرثیہ کا تجرباتی شعور نہیں تھا وہ اس کی صحیح خارجی اور داخلی ہیئت سے واقف نہیں تھے - اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان مرثیوں سے مرثیہ کا مقصد بھی پورا نہیں ہوتا - یعنی اخلاف کو ان کے اسلاف کی کارناموں سے بھری ہوئی زندگی کا آئینہ دکھا کر تحریض عمل - بہرحال ان کی اس کاوش کو جذباتی اور تاثراتی اظہار کے علاوہ کسی اور چیز کا نام نہیں دیا جا سکتا -

نسیم امروہوی نے اپنے شخصی اور انفرادی مرثیوں میں ان اکابرین ملت کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا ہے جنھوں نے عالمانہ بصیرت اور اجتہاد سے لوگوں کے افکار و خیالات کی تطہیر کی - عرفان و ایقان کی عظمتوں سے آگاہ کیا - اور اپنا ایک قابل تاسی کردار اور اسوہ چھوڑ گئے - چنانچہ اس سلسلے میں نسیم امروہوی کا پہلا مطبوعہ مرثیہ حضرت ناصر الملت اعلی اللہ مقامہ سے متعلق ہے جو انھوں نے ۱۹۴۱ء میں کہا تھا - اس سے پہلے نہ ایسا ہی مرثیہ حضرت نجم الملت (۱۹۳۸ء) کی وفات حسرت آیات پر کہہ چکے تھے اور اس کے بعد علی الترتیب نظام دکن، سعید الملۃ، آقائے محسن الحکیم، ڈاکٹر منظہر علی اور علامہ رشید ترابی مرحوم کی وفات پر انھوں نے مرثیے کہے - یہ مرثیے نہیں تحریک ہیں جس کے ذریعہ مرثیہ گوئی کا رخ ایک بڑے تخلیقی اور تعمیری مقصد کی سمت موڑنے کی کوشش کی گئی - بظاہر یہ چند ہی مرثیے ہیں، لیکن ان مرثیوں میں نسیم امروہوی کا نظریہ شعر، پیغام اور نصب العین کھل کر سامنے آتا ہے - انھوں نے ان مرثیوں کے ذریعہ عمل اور تحریک عمل کو جس انداز میں آگے بڑھایا ہے اس کی مثال کسی مرثیہ نگار کے یہاں نہیں ملے گی - یہ مرثیے بلاشبہ ہماری ادبی تاریخ میں

ایک اہم ترین اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ ان کے ذریعہ مرثیے کی تنگ سخن اپنی وسعتوں میں لا محدود ہو گئی ہے۔

ناصر ملت کا شمار برصغیر کے نامور علما میں ہوتا ہے۔ مختلف علوم و فنون پر عربی اور فارسی میں پچانوے کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ انھوں نے ۱۹۴۱ء میں انتقال کیا۔ ان کی میت آگرہ لے جا کر قاضی نور اللہ شوستری کے مقبرے میں دفن کی گئی۔ نسیم امروہوی نے ان کی وفات پر مرثیہ کہہ کر شخصی اور انفرادی مرثیے کی اس تحریک کو اور آگے بڑھایا ہے جس کی داغ بیل انھوں نے نجم الملۃ کی وفات کے موقع پر ڈالی تھی اور اس مرثیہ میں شخصیت کے مطالعہ اور تجربے کے ساتھ ساتھ کئی اور باتیں ہیں، جن کے ذریعہ نسیم نے اپنے غم میں افرادِ ملت کو شامل کر لیا ہے اور ان کو پڑھتے وقت انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر یہ شاعری ہے تو پھر ساحری کس کو کہتے ہیں۔ یہاں یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ نسیم کے جوہر ذاتی نے ان کے مرثیوں میں عالمانہ شان ہی پیدا نہیں کی، وہ لب و لہجہ اور آہنگ بھی دیا ہے جس میں حوصلہ بھی ہے اور زندگی کی توانائی بھی۔ وہ اپنے مرثیوں کو صرف رلا دینے ہی کے قابل نہیں بلکہ وہ اس کو افرادِ ملت کی تنظیم، اتحاد اور باہمی اخوت کا لائحہ عمل بھی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ بعض اوقات اس کے لیے انھوں نے ایک ہی موضوع کو طرح طرح سے بیان کر کے طرز ادا کی ایک سحر آفریں مثال قائم کی ہے: اس مرثیے کا چہرہ "علم" کے نگارنگ شعبوں سے مزین ہے۔ ایک مرتبہ کسی نے خواجہ حسن نظامی سے فرمائش کی تھی کہ وہ لالٹین پر کوئی انشائیہ لکھیں، انھوں نے اسی وقت علم کو لالٹین اور اس کی برکتوں کو روشنی قرار دے کر انشائیہ لکھ دیا اور ایسے ایسے نکتے پیدا کیے

کہ ان پر پہلے کبھی غور نہیں کیا گیا تھا — اسی طرح یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ "علم" کے موضوع پر اس مرثیے سے پہلے بصیرت افروز اور عام فہم عالمانہ گفتگو نہیں کی گئی تھی۔ نسیم امروہوی نے نظم میں جس جس طریقے سے زرفشانیاں کی ہیں اور پورے شعری محاسن کے ساتھ علم کی حقیقت کو اجاگر کیا ہے۔ وہ گہرے مطالعے اور ٹھوس علمی لیاقت کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر خواجہ حسن نظامی نے علم کے متعلق نثر میں کمال دکھایا ہے تو بلاشبہ نظم میں یہ نسیم امروہوی کا کمال ہے۔ انھوں نے اس عام سے موضوع کو اتنی گہرائی اور وسعت دی ہے کہ ان کے خیالات کا ساتھ دیتے ہوئے تصور تک پرشکستہ معلوم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

شمعِ حریمِ معرفتِ کبریا ہے علم
روحانیت کا ولولۂ ارتقا ہے علم
دنیا و دیں میں رازِ حیات و بقا ہے علم
ذرہ ہے خلق، عالمِ بے انتہا ہے علم
یہ کیوں کہوں خدا کا شریکِ صفات ہے
اللہ سے جدا ہی نہیں عین ذات ہے

اللہ رے علم، منزلتِ علم، شانِ علم
تخلیقِ بو البشر کا سبب امتحانِ علم
اسلام کیا ہے بہرِ عمل ترجمانِ علم
قرآں بیانِ علم، حدیثیں زبانِ علم
انسان جو کہ جہل و خودی کا غلام ہے
راسخ ہو علم میں تو نبی یا امام ہے

یہ علم دو جہاں میں وہ نعمت ہے لاجواب
اپنے لیے خدا نے کیا جس کو انتخاب
آدمؑ ہوے جو اس کی فضیلت سے بہرہ یاب
بخشا خدا نے اشرف مخلوق کا خطاب

جس نے رکھا عزیز وہ انسان ہو گیا
تحقیر جس نے کی وہی شیطان ہو گیا

جہد بقا میں اہل عمل کی سپر ہے علم
دنیا و دیں میں فاتح باب ظفر ہے علم
بہر مجاز چشم حقیقت نگر ہے علم
فطرت کا راز داں نہیں کوئی مگر ہے علم

خاموش علم ہے تو خدا کی کتاب ہے
جب بولنے لگے تو رسالت مآب ہے

ہے سرمدی علوم کا چشمہ یہ کائنات
ہر ذرۂ جماد، ہر اک ریشۂ نبات
اک درس گاہ ہے جسے کہتے ہیں ہم حیات
تعلیم دے رہے ہیں مسلسل تغیرات

ہر برگ یاں ہے دفتر عرفاں لیے ہوئے
ہر خار معرفت کا گلستاں لیے ہوئے

یہ ختم شب یہ گرمیٔ ہنگامۂ سحر
یہ صبح اور یہ دن کی تجلی یہ دوپہر
یہ شام اور شام کے لمحات مختصر

یہ رات اور رات میں یہ انجم و قمر
اک درس دے رہے ہیں جہاں کو علوم کا
ہیئت کا مدرسہ ہیں، تو مکتب نجوم کا

یہ موسمِ بہار، یہ رعنائیِ چمن
پھولوں کا یہ نکھار شگوفے یہ گلبدن
پودوں کا شباب یہ شاخوں کا بانکپن
سرو و صنوبر و گل و ریحان و یاسمن
سب مدرسے ہیں انجمن کائنات کے
دن رات گل کھلاتے ہیں علم نبات کے

یہ عالم جبال یہ دنیا ہے بحر و بر
جغرافیے کے موجد و بانی ہیں سربسر
یہ ابر و باد و ژالہ و شبنم یہ خشک و تر
طبعی علوم کا ہیں خزانہ پئے بشر
پنہاں جو خط و خال ہیں نقشِ شہود میں
آیا اسی سے علمِ مساحت وجود میں

ہوتے ہیں روز و شب جو زمانے میں واقعات
مل جل کے لکھ رہے ہیں یہ تاریخ کائنات
علمِ حیات کی ہے بنا خود یہی حیات
ہر چیز ہر وجود ہر اک شے ہر ایک بات
ہر فلسفے کی عقلِ بشر راز دار ہے
منطق ہمارے نطق کا اک شاہکار ہے

برقِ تپاں سے حکمتِ برقی ہے ضوفشاں
فطرت کے قاعدے ہیں ریاضی کے رازداں
طب کا وجود جسمِ بشر میں ہے خود نہاں
فنِ سرود نغمۂ بلبل سے ہے عیاں
تمہیدِ ساز بربطِ بادِ بہار ہے
استادِ رقص گردشِ لیل و نہار ہے

ڈالے جو خلقتِ بشری پر کوئی نگاہ
پائے گا اس کو عالمِ اکبر کی جلوہ گاہ
مخفی مجاز میں ہے حقیقت خدا گواہ
حق تو یہ ہے کہ دہم "انا الحق" نہیں گناہ
خود نفس کا بغور بشر امتحان لے
پہچان لے خدا کو جو اپنے کو جان لے

بزمِ شہود میں یہ اشاراتِ رنگ و بو
حکمت کا درس دیتی ہے فطرت ہر ایک سو
ہر ملک و قوم کی ہے یہی قوتِ نمو
چیدہ ہزار میں ہے اسی سے تو لکھنؤ
یہ خاکِ علم شامِ اودھ کا وہ چاند ہے
جلووں سے جس کے صبحِ بنارس بھی ماند ہے

لکھنؤ کو میر حسن نے کوفہ کا ہم عدد کہا تھا — اگرچہ یہ درست نہیں کیونکہ کوفہ کے عدد (۱۱۱) ہیں اور لکھنؤ کے (۱۱۲) یا (۱۲۱)[1]

---

[1] یہ لفظ ل ک ھ ن و (بروزن مُغشّش) نہیں بلکہ (باقی فٹ نوٹ صہ پر)

بہرحال ان کے زمانے میں یہ بات درست ہوگی لیکن بعد میں باشندگانِ لکھنؤ نے اپنے طرزِ زندگی سے ثابت کر دیا کہ ان میں تہذیبی منافقت نہیں سماجی لیگانگت ہے، قیصر التواریخ کا مولف کے زمانے تک جو تاریخیں لکھی گئیں، ان میں تصویر کا ایک ہی رخ دیکھا گیا ہے جو چند اِنے گِنے امیروں اور نوابوں کے عیش و عشرت سے رنگ آمیز تھا۔ عام معاشرے کے حالات اس سے مختلف ہیں۔ نسیم نے لکھنؤ کے علم و فن اور تہذیب شائستگی کی جو تصویر کھینچی ہے اس کے آگے ہر تصویر ماند پڑ جاتی ہے۔ وہ لکھنؤ میں علوم و فنون، حدیث و فقہ اور مذہب و دانش کی ترقیوں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اے لکھنؤ شبابِ ریاضِ کہن ہے تو
اب تک بہارِ علم و ادب کا چمن ہے تو
کچھ کم نہیں یہ فخر کہ فخرِ وطن ہے تو
ہندوستاں میں کعبۂ اربابِ فن ہے تو

عہدِ قدیم کی عظمت کا مزار ہے
اجڑی ہوئی بہار سہی پھر بہار ہے

تیرا ہے ذرہ ذرہ قدامت کا آئینہ
ہر شاعر و خطیب فصاحت کا آئینہ
ہر عالمِ فقیہہ ہدایت کا آئینہ
ہر نائبِ امام، امامت کا آئینہ

(بقیہ فٹ نوٹ صہ) ل ک ھ ن ؤ (بروزن فاعلن) ہے، اگر ہمزہ کا ایک عدد لیا جائے تو لکھنؤ کے عدد ۱۱۲ ہوں گے، اور اگر دوسرے قول کے مطابق ہمزہ کے دس عدد لیے جائیں تو لکھنؤ کے عدد ۱۲۱ ہوں گے۔

تو دین کے علوم کی دولت لیے ہوئے
ہے گود میں بہارِ رسالت لیے ہوئے

دنیائے معرفت میں ہیں جو صاحبِ نگاہ
ان کی نظر میں تو ہے حقیقت کی درسگاہ
جادے بنا دیے ہیں وہ تو نے میانِ راہ
انکار جس سے علم کے مذہب میں ہے گناہ

تجھ کو ہے فخر اپنے خلیقؔ و ضمیرؔ پر
اردو کو ناز تیرے انیسؔ و دبیرؔ پر

فاضل ہیں تیرے فضل کی دنیا میں لاجواب
عالم ہیں تیرے علم کی مجلس میں انتخاب
ناثر ہیں تیرے نثر کی منزل میں کامیاب
شاعر ہیں تیرے شعر کے مطلع کا آفتاب

ہے تیز تر شرابِ سخن تیرے جام میں
دریائے گومتی کی روانی کلام میں

وہ تیری بات چیت سلاست لیے ہوئے
جملے فصیح، خاص فصاحت لیے ہوئے
لہجہ وہ دلنشین، حلاوت لیے ہوئے
لفظوں کی شوخیاں بھی متانت لیے ہوئے

کیا خوب روزمرہ ہے، کیا بول چال ہے
تو اس صفت میں آپ ہی اپنی مثال ہے

تو علم و اجتہاد کا ہے مہدِ اولیں

ہندوستاں میں تیرا مقابل کوئی نہیں
دنیائے بے خبر کو دیا تو نے درسِ دیں
ہم پایۂ عراق و عجم تیری سرزمیں
بخشا یہ اوج ہادیٔ راہ صواب نے
جنت بنا دیا تجھے غفراں مآب نے

پائے ہر ایک عہد میں تو نے وہ باکمال
جن کے فیوض علم کی دولت ہے لازوال
وہ عالمانِ امتِ محبوبِ ذوالجلال
جو انبیائے عترتِ یعقوب کی مثال
تھی یوں تو ابتدا میں بھی اک انتہائی شان
آخر کے دور میں ہے تسلسل خدا کی شان

بےمثل تھے زمانۂ آخر کے پیشوا
آقائے قوم، باقرِ دیں، نجمِ اہتدا[1]
وہ ناصرِ[2] شریعتِ عترا رِ مصطفیٰ
تھے چار رکن سلطنتِ زہد و اتقا
چاروں امیرِ قوم، غلامانِ پنجتن
پانچ انگلیوں سے طالبِ دامانِ پنجتن

ہیں عالمِ جلیل یہ صورت سے تھا عیاں
یکتا عمل میں علم میں لاثانیٔ جہاں

---

[1] قدوۃ العلماء مولوی آقا حسن، باقر العلوم مولوی سید باقر، نجم العلماء مولوی سید نجم الحسن طاب ثراہم [2] ناصر الملۃ مولوی سید ناصر حسن طاب ثراہ۔

حق بین و حق پسند و حق آئین و حق نشاں
اس دور کے چہار عناصر بجسم و جاں
عارف تھے دینِ پاکِ رسولِ حجاز کے
سجدے تھے چار صبح عمل کی نماز کے

....

اے چرخ اب وہ مطلع انوار کیا ہوئے
اے لکھنؤ وہ عالم دیندار کیا ہوئے
دنیا و دیں کے محرمِ اسرار کیا ہوئے
علم و عمل کے قافلہ سالار کیا ہوئے
ویراں دکھائی دیتی ہے دنیائے لکھنؤ
آتی ہے شام غم سے صدا ہائے لکھنؤ

حسرت نصیب قوم کے رونے کو تھا نہ کم
اک باقرِ علوم کی رحلت کا رنج و غم
ناگاہ قدوۃ العلما کا سہا الم
دیکھا غروبِ نجمِ کا منظر بچشم نم
ان حادثوں کے بعد یہ محشر گزر گیا
باقی تھا ایک ناصرِ دیں، وہ بھی مر گیا

اس کے بعد نسیم نے آٹھ دس بند میں رثائے ناصر الملۃ کا فنی ،
نیز عقیدت مندانہ فریضہ انجام دیا ہے، پھر ناصر الملت کی حیات اور ان کے علمی کارناموں کا ذکر کیا۔ اگرچہ اس موقع پر انھوں نے ایک دیانتدار سوانح نگار کے جوہر بھی دکھائے ہیں اور کہیں ایسی کوئی بات نہیں کہی

جو واقعات کے منافی ہو، اس کے باوجود مرثیے کے اس پورے حصے میں کسی مقام پر مضمون کی دلکشی اور مرثیے کی ہیئت، اسلوب اور تکنیک میں کوئی فرق نہیں آیا۔ انھوں نے یہ ساری باتیں مورخ کی زبان اور شاعر کے دل سے کہی ہیں، اس میں انداز بیان اور حسنِ ادا کی بڑی خوبصورت مثالیں ملتی ہیں جو دوسروں کے یہاں نہیں ہے

محرابِ بندگی تھی جبینِ نیاز مند
جھکنے سے فرقِ عجز کے سجدہ تھا سربلند
چشمِ علوم کا تھا دہن وقتِ وعظ و پند
لہجہ وہ خوش گوار کہ قرآں کرے پسند

دل اور دماغ پرتوِ انوارِ اہل بیت
گویا زبان کاشفِ اسرارِ اہل بیت

....

طوسی سے جامعیتِ علمی میں بیشتر
تفسیر پر عبور، تو اریخ پر نظر
فقہ و اصول و منطق و حکمت سے بہرہ ور
واقف رجال سے تو حدیثوں سے باخبر

شیرینیاں کلام و ادب کی زبان میں
مثلِ عرب، بلیغ معانی بیان میں

تھے مجلسی کے بعد یہ خضرِ رہِ طلب
جامِ جہاں نمائے احادیثِ دینِ رب
اسناد پوچھیے تو بتاتے تھے بے تعب

سطر و کتاب و صفحہ و راوی مع نسب

ہیں معترف فقیہ بھی اس کے ادیب بھی
تھا مستفیض سبطِ حسن سا خطیب بھی

. . . .

جلوت میں صرفِ پند و نصائح زبان و لب
خلوت میں مشق علم و ادب اور ذکرِ رب
دار الکتب کے گوشہ عزلت میں روز و شب
تحقیق علم دیں کی وہ بڑھتی ہوئی طلب
محوِ مطالعہ جو ہمیشہ جناب تھے
عالم نہ تھے علوم کی گویا کتاب تھے

نسیم نے اس کے بعد ناصر الملت کے مکارم اخلاق اور علمی فضائل پر روشنی ڈالی ہے۔ مرثیے کا یہ حصّہ خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ سیرت کے بیان میں کسی مقام پر افراط و تفریط سے کام نہیں لیا اور قصیدہ گویوں کے عام مذاق کی طرح کسی فضیلت کو بڑھا چڑھا کر نہیں کہا، وہی بات کہی ہے جس کی وہ سب لوگ بھی تصدیق و توثیق کرتے ہیں جنھوں نے مرحوم کو دیکھا ہے یا ان سے قریب رہے ہیں:

تھے باوجود سلطنت علم خاکسار
شکوہ نہ دوستوں سے نہ اعدا سے تھا غبار
پیکر تھا مجسمۂ خلق و انکسار
ارباب زر کی بزم میں خود دار و باوقار
عالم کی رفعتیں تھیں جبینِ نیاز میں

روح القدس کا فیض لباسِ مجاز میں

اور اس حصّے کا مخصوص تر نکتہ یہ ہے کہ اگرچہ نسیم اہل بیت علیہم السلام کی مدح و منقبت اور مرثیے کے عادی ہیں لیکن زیر نظر مرثیہ میں ہر جگہ یہ ملحوظ رکھا ہے کہ کوئی لفظ ایسا زبانِ قلم سے نہ نکل جائے جو ایک عالم دین کی شان سے بالاتر ہو اور اسے ائمہ یا اصحاب یا انصار کے مماثل بنادے۔

علم و عمل جو ساتھ دیانت سمیت تھے
اک نقشِ پائے قافلۂ اہل بیت تھے

زہد و ورع کا جامۂ پرنور زیب تن
علم و عمل عبا و قبا، فضل پیرہن
پٹکا کمر کا عزمِ تاسیِ پنجتن
کفشوں میں پیروانِ ید اللہ کا چلن
ترجیح تھی جو ذہن کو تیزی میں برق پر
پیچیدہ مسئلوں کا عمامہ تھا فرق پر

جلوے سے اجتہاد کے روشن ضمیر تھے
بے نامہ و پیام خدا کے سفیر تھے

—— سیرت سے بحث کرنے کے بعد نسیم نے اس مرثیے میں مرحوم کے خاندان کا حال، تعلیم و تربیت، فضل و کمال، مشاغل و مواعظ، تصنیف و تالیف، جن کی تعداد ۵۹ ہے اور جن کے نام اور موضوع ۲۸ بندوں میں نظم کیے ہیں اور اس کے بعد رحلت و تدفین اور آل و اولاد کا حال بڑی تفصیل سے جمع کیا ہے اور ایک حقیقت پسند سوانح نگار کے فرائض انجام دیے ہیں جس کی

نگاہ سے کوئی چیز اوجھل نہیں ۔ لیکن اس تمام تفصیل میں وہی شاعرانہ آہنگ اور اسلوب بیان برقرار رکھا جو مرثیے کی اور اس کے علاوہ بھی ہر نظم کی جان ہوتا ہے ۔ کہیں سے پڑھ جائیے یہ محسوس نہیں ہوگا کہ آپ کوئی بیانیہ یا تاریخی نظم پڑھ رہے ہیں ، ہر شعر نوک نشتر کی طرح دل میں اترتا چلا جاتا ہے اور حافظے میں حالات و واقعات کے نقوش مرتسم ہوتے چلے جاتے ہیں جب وہ کفن و دفن اور میت کو لکھنؤ سے آگرے لے جانے اور وہاں تدفین عمل میں آنے کے حال پر پہنچ کر سامعین و قارئین کو رنج و افسوس نقطے پر لاتے ہیں تو لہجے میں کچھ ایسا درد بھر دیتے ہیں کہ سننے والا اور پڑھنے والا ایک رقت و گریہ سے دوچار ہو جاتا ہے اور چند ہی بند اس پر اتنے کارگر ہو جاتے ہیں کہ طبیعت کا سنبھالنا آسان نہیں رہتا ۔ انھوں نے آگرے کو مخاطب کرکے لکھنؤ کی زبانی جو پیغام دیا ہے ، اس نے غم کا عجیب و غریب سماں پیدا کر دیا ہے :

اے آگرے کی خاک حریم وفا ہے تو
راہ طلب میں جادۂ وحدت نما ہے تو
قبر شہید و مشہد صبر و رضا ہے تو
ہندوستاں کی گود میں اک کربلا ہے تو

؎ شہید ثالث قاضی نور اللہ شوستری

چشمہ ابل رہا ہے جو عزم حیات کا
جمنا میں کوئی سوت ہے شاید فرات کا

آتی تھی لکھنؤ کی یہ آواز دردناک
تجھ پر مرا سلام ہوا اے آگرے کی خاک
چھٹتی ہے ہم سے ناصر ملت کی ذات پاک

ملتی ہے تجھکو دولتِ دیں رو حنا فدا اک

دونوں جہاں کی تجھ کو سعادت حصول ہو
یہ لکھنؤ کا تحفۂ علمی قبول ہو

بچھڑا وہ ہم سے جس پہ ہمیں افتخار تھا
اس دور میں علوم کا دار و مدار تھا
تو نے چنا وہ پھول کہ جانِ بہار تھا
مانندِ ماہ عابدِ شب زندہ دار تھا

اغیار ہے خیال کہ مسکن سے دور ہے
اے خاکِ پاک خاطرِ مہماں ضرور ہے

خوابیدہ تیری گود میں عظمت ہے قوم کی
تو سر چڑھا اسے کہ یہ عزت ہے قوم کی
اے آگرے یہ تجھ سے وصیت ہے قوم کی
رکھنا سنبھال کر یہ امانت ہے قوم کی

روشن رہے چراغ دلِ داغدار کا
سونپا تجھے مزار غریب الدیار کا

تو ناشناسِ رتبۂ اہلِ وفا نہیں
کوفہ نہیں دمشق نہیں کربلا نہیں
ہرگز یہاں کسی کا بھرا گھر لٹا نہیں
بے شیر کا لہو کبھی تجھ پر بہا نہیں

جمنا پہ کوئی ذبح کہاں تشنہ لب ہوا
لاشہ ترے شبیہؑ کا پامال کب ہوا

لوٹی گئی نہ تجھ پہ کسی کی حرم سرا
تو نے کسی مریض کو قیدی نہیں کیا
بے وارثوں کے سر سے نہ تجھ پر چھنی ردا
مہماں بلا کے تو نے کسی سے نہ کی دغا

اس وقت یاد آ گئی ناچاری حسینؑ
فریاد از غریبی و بے یاری حسینؑ

اس کے بعد امام حسین علیہ السلام کے بھرپور مصائب پر مرثیے کا خاتمہ ہوا ہے۔

حضرت محسن الحکیم طاب ثراہ اپنے دور کے زبردست عالم بلکہ اعلم تھے جب عربوں کی جانب سے اتحاد عرب کی بات کی جا رہی تھی انھوں نے اتحاد عالم اسلام کا پیغام دیا اور مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کی حفاظت کی۔ انھوں نے ۱۹۷۰ء میں انتقال فرمایا تو پورے عالم اسلام کے سر سے قیامت گذر گئی یہ بھی کہا گیا کہ ان کے وجود کو جن شخصیتوں نے اپنے محدود قومی مفاد کے لیے مضر سمجھا انھوں نے ان کو زہر دے کر شہید کیا ہے بہر حال زہر دیا ہو یا نہ دیا ہو اس میں شک نہیں کہ ان کے اٹھ جانے سے اتحاد عالم اسلام کو شدید صدمہ پہنچا نسیم امروہوی نے ان کے ارتحال سے متاثر ہو کر مرثیہ کہا اور اس میں ان کے علم و عمل کی پوری داستان بیان کر دی۔ علم و عمل کیا ہے؟ اس کی کتنی صورتیں ہیں، اس کے کتنے پہلو ہیں؟ ہمارے اسلاف نے گذشتہ دس صدی میں اس سے کیا کام لیا؟ اور کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس کا اظہار عالمانہ بصیرت اور شاعرانہ خلاقی کے بغیر نہیں ہوتا۔ نسیم علم و عمل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے

علم و عمل کے موضوع ہی سے اس مرثیے کا چہرہ سجایا — جو شعری خوبیوں سے بھی آراستہ ہے، وہ لکھتے ہیں:

چراغِ منزلِ عرفاں ہے نورِ علم و عمل
تجلیات کا منظہر ظہورِ علم و عمل
مگر وہ جب، کہ ہو اتنا وفورِ علم و عمل
کہ لاشعور میں ضم ہو شعورِ علم و عمل
تلاشِ دوست میں یوں شرحِ صدر ہو جائے
کہ گم شدہ کو جو پائے تو آپ کھو جائے

بشر کی روح ہے علم اور دل و ضمیر عمل
وہ ہے سراجِ منیر اور مستنیر عمل
سرشتِ فکر ہے وہ سعی کا خمیر عمل
وہ اقتدار امارت ہے اور امیر عمل
جو علم سے ہے عمل تو عمل سے عالم ہے
نہ ہو عمل تو وہ عالم نہیں ہے ظالم ہے

جمالِ شاہدِ حق علم ہے، عمل ہے جلال
محاسنِ ابدی کا وہ نور ہے یہ کمال
وہ نخل ہے یہ ثمر ہے وہ مال ہے یہ مآل
وہ فلسفہ یہ حقیقت وہ قیل و قال یہ حال
جہانِ ذات وہ ہے عالمِ صفات یہ ہے
حیات وہ ہے مگر مقصدِ حیات یہ ہے

وہ کنزِ مخفی غیبی یہ کن فکاں کی متاع

وہ لامکان کی پونجی ہے یہ مکاں کی متاع
وہ آسماں کی تو یہ دورِ آسماں کی متاع
وہ اُس جہاں کا عطیہ یہ اس جہاں کی متاع

وہ ضو سمیع کی ہے یہ بصیر کا پرتو
علیم کی وہ جھلک یہ قدیر کا پرتو

وہ ہے تفکّرِ ذہنی یہ ہے خشوعِ نیاز
وہ رازدارِ حقیقت ہے اور یہ کاشفِ راز
وہ خضرِ منزلِ ہستی یہ اس کی عمرِ دراز
وہ غیب کی ہے کرامت یہ شخص کا اعجاز

اگر وہ ہے زرِ خالص تو آبِ زر یہ ہے
جو علم خلد بریں ہے تو اس کا در یہ ہے

ضیائے علم سے قائم ہے آب و تابِ عمل
بغیر علم نہیں کوئی کامیابِ عمل
جو "راسخون" ہیں "فی العلم" وہ ہیں بابِ عمل
جوابِ علم کا اُن کے نہ ہے جوابِ عمل

نبیؐ ہیں علم کے ساتھ اور نبیؐ کے ساتھ عمل
علیؑ کا صدر ہے علم اور علیؑ کا ہاتھ عمل

یہ علم اور یہ عمل ہے وہ نعمت داور
جو آدمی کو بنا دے بشر سے خیر بشر
جہاں میں اس کا ہے مرکز رسولِ پاک کا گھر
یہ شہرِ علم و عمل، علم باعمل کا ہے در

کمی ہے علم و عمل کی نہ یاں فزونی ہے
مزے جہاد کے ہیں، گفتگو سلونی ہے

— اس کے بعد اجتہاد کی حقیقت بیان کر کے اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور نئی نسلوں کو فکر و نظر اور اجتہاد کے لیے شعوری اور غیر شعوری طور پر ابھارا ہے:

نبی ہیں منزلِ علم و عمل کے ماہِ تمام
نہ ہوں نبی تو پئے علم و عمل ہے ارث امام
نہ ہوں امام تو نائب ہیں وہ فقیہِ انام
جو اجتہاد کی منزل میں صاحبِ الہام

فروعِ دیں میں نظر کامیاب ہے ان کی
کبھی کبھی تو خطا بھی صواب ہے ان کی

یہ اجتہاد کہ فتوی ہے جس کی حدِ سفر
اصولِ دین تصرف سے اس کے ہیں باہر
قدم قدم پہ یہ لازم ہے وقتِ فکر و نظر
کتاب و سنت و اجماع و عقل ہوں رہبر

عمل بھی شرط ہے اور نفس کی طہارت بھی
ورع بھی، زہد بھی، ایثار بھی، عدالت بھی

یہ اجتہاد وہ اک موج ہے ترقی کی
جو ہے ازل سے ابد تک رواں خفی و جلی
ہر اک قدم پہ فلک ہے نیا زمین نئی
حیات ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتی

یہ جلوۂ جہد بھی ہے اور یہی جہاد بھی ہے
جو ارتقا ہے مسلم تو اجتہاد بھی ہے

ہزار سال سے فقہ و اصول ہیں یکسر
امامیہ سے ہے مختص یہ اجتہاد۔ مگر
جو حق ہے کیوں نہ کہا جائے بر سر منبر
کہ مل سکے گی نہ منزل بغیر سعی و سفر

حدودِ شرع میں فکرِ جدید لازم ہے
جدید فکر میں فکرِ مزید لازم ہے

سیاست ازلی ہے یہ دین کا پیغام
مزاج علم و عمل ہو بجائے تیغ و حسام
کرن جہان میں جاری یہی اصول و نظام
رسولِ پاک، امام اور نائبینِ امام

یہ ہیں نبی و امامِ فلک پناہ کے بعد
نجوم راہ دکھاتے ہیں مہر و ماہ کے بعد

اس چہرے کے بعد اس مرثیہ میں ایک ہزار سال کے اکابر علماء کی زندگی اور ان کے کارناموں کی تفصیل بیان کی ہے۔

اس موضوع کے لیے مثنوی کی فضا بظاہر سازگار معلوم ہوتی ہے۔ اس میں اظہار بیان کی گنجائشیں مرثیے سے کہیں زیادہ ہیں۔ لیکن اس کا ذہنوں پر وہ اثر مرتب نہیں ہو سکتا جو مرثیہ کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ نسیم کا یہ کمالِ فن ہے کہ انھوں ایسے ادق اور مشکل موضوع کو مرثیے کا قالب عطا کیا اور وہ تمام خصوصیات برقرار رکھیں جو مرثیے کے لیے بنیادی

حیثیت رکھتی ہیں ۔ اس کے بعد محسن الحکیم کی علمی خدمات، سیرت و کردار، سیاسی نقطہ نظر اور کارناموں کا ذکر کیا ہے اور ان کی زندگی کے مختلف پہلو اجاگر کیے ہیں:

وہ نائبینِ امامت جو خود زعیم بھی تھے
فقیر آلِ محمدؐ بھی تھے عظیم بھی تھے
ذوی الکرم بھی مکرم بھی اور کریم بھی تھے
اسی گروہ میں اک محسن الحکیم بھی تھے

زروئے اسم گرامی، زروئے باطن بھی
حکیم وقت بھی تھے، دینِ حق کے محسن بھی

یہ نفس کی عظمت سے عظیم کہلائے
دکھائی حکمت علمی، حکیم کہلائے
کرامتِ نبوی سے کریم کہلائے
فلک کے زعم کو توڑا زعیم کہلائے

مزاج فقر میں ہیبت بھی دل نوازی بھی
مجتہد بھی، معلم بھی اور غازی بھی

—— نسیم نے اس موقع پر یہ بتایا ہے کہ ضرورت کے وقت علماء کا کمر کس جہاد کے میدان میں اتر پڑنا اور قوم کی سپر بن جانا علم کے خلاف شان نہیں:

اٹھے تھے جبکہ عراقی بعزم آزادی
تو ان کا مرتبہ رہبری تھا بنیادی

تھے سید حسنی امن و صلح کے عادی
مگر جہاد میں شانِ حسینؓ دکھلا دی
کبھی ہوئی تھی نگاہوں میں جانبین کی شان
کبھی حسنؓ کی سیاست کبھی حسینؓ کی شان

بوقتِ درس معلم تھے یہ نبی کی قسم — دمِ جہاد مجاہد بھی تھے علی کی قسم

— سیرت پر ان لفظوں میں روشنی ڈالی ہے:
رہِ اخوتِ ملت کے ہادی و رہبر — رسولؐ کے کلمہ گو عمل کے پیغمبر

سیاست ان کی حقیقت بکف سیاست تھی
دماغ زیرِ اثر تھے دلوں پہ ہیبت تھی
نہ حکم تھا نہ حکومت نہ کوئی طاقت تھی
مگر یہ رعب کہ حلقہ بگوش ملت تھی
خفیف سا اک اشارہ نگاہ کا پا کر
بساطِ فقر پہ جھکتی تھی سلطنت آ کر

— جراتِ اخلاق کے سلسلے میں حضرت محسن الحکیم کی زندگی کا یہ واقعہ سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے کہ ان سے ملتِ پاکستان کے کسی بینکر نے ہزار ہا روپیہ نذر گزران کر سود لینے اور دینے کے لیے کوئی شرعی جواز پیدا کرانے کی بے انتہا کوشش کی، جب آپ کسی طرح آمادہ نہ ہوئے تو "سود" اور "ربا" کے درمیان فقہی نقطۂ نگاہ سے فرق نکالنے پر زور دیا،

مگر آپ ٹس سے مس نہ ہوئے اور پاسداری شریعت کے لیے ان قوم خطیر کو اس طرح ٹھکرا دیا جیسے کوئی ذرہ خاک کو دامن سے جھاڑ دیتا ہے نسیم امروہوی نے اس واقعے کو ایسے لفظوں میں نظم کر دیا ہے کہ فریقین کے اصرار و انکار کی تصویر کھینچ دی ہے:

وہ پاسِ شرع، مروت کو جس میں دخل نہ تھا
کہ جیسے اپنی جگہ پر اٹل ہے کوہِ صفا
وہ سبز باغ دکھا کر جو اک جواہر کا
کسی نے سود کا ان سے کیا تھا استفتا

گیا تھا سونے کے پانی سے وہ وضو کر کے
انھوں نے پھیر لیا منہ کو آخ تھو کر کے

وہ تھا مُصر کسی صورت جواز فرما دیں
حقیقۃً نہیں شکلِ مجاز فرما دیں
میانِ سود و ربا امتیاز فرما دیں
ذرا تو پُرشکم حرص و آز فرما دیں

بیاں وہ سود کی شرح مزید ہو جائے
کہ ترجمانیٔ عصرِ جدید ہو جائے

بگڑ گئے تھے یہ سن کر جناب کے تیور
کہا تھا غیرتِ حق نے کہ او ہوسِ زر
پھنسیں گے دام طلا میں نہ مردِ حق پرور
امام وقت کے نائب ہیں یہ جلال سے ڈر

جواں ہے جراَت اخلاق، پیر ہیں محسن

بڑے امیر کے دَر کے فقیر ہیں محسن

اختتام مرثیہ پر مرحوم کی وفات کی کیفیت بیان کی ہے۔ یہ کیفیت اپنے اندازِ بیان کے لحاظ سے انتہائی درد انگیز اور رقت آمیز ہے، چند بند دیکھیے:

دیا تھا جس نے زمانے کو درس قرآنی
اب کے واسطے ہوتی ہے مرثیہ خوانی
نہ کیوں رلائے شریعت کدے کی ویرانی
اجاڑ ہو گئی یہ درس گاہ روحانی
خزاں نصیب ہوا آرزو کا باغ افسوس
حریم علم کا گل ہو گیا چراغ افسوس

ابھی تو قوم کی تنظیم عام باقی ہے
حیاتِ نو کا ابھی اہتمام باقی ہے
ابھی اشاعتِ حق کا پیام باقی ہے
جو تھا حضور کے ذمے وہ کام باقی ہے
نہیں ہے صورتِ اصلاحِ مومنیں ابھی
مقیم منزل اوہام ہے یقیں ابھی

. . . .

کھڑے ہیں دیر سے مشتاقِ دید ڈیوڑھی پہ
کچھ ان میں اہل عمل ہیں کچھ ان میں اہل نظر
نگاہِ شوق لگی ہے بسوئے پردۂ در
یہ ولولہ، کہ برآمد ہو قوم کا رہبر

یہ لوگ لے کے کوئی التماس آئے ہیں
جناب قبلہ و کعبہ کے پاس آئے ہیں

مچل رہے ہیں وہ ارماں جو بَر نہیں آتے
تڑپ رہی ہیں نگاہیں نظر نہیں آتے
غمِ فراق سے دل راہ پر نہیں آتے
کوئی یہ عرض تو کر دو ، اگر نہیں آتے

نگاہِ لطف سے غم کے پہاڑ کٹ جائیں
حضور ایک نظر دیکھ کر پلٹ جائیں

مجھے کہاں سے کہاں لے گیا بھٹک کے خیال
یہاں نجف میں کہاں رنج و غم میں جی کا یہ حال
یہ مرگِ بے وطنی میں حسینؑ کی ہے مثال
عراقیوں کا وہ ماضی تھا ، یہ تفاوتِ حال

وطن سے دور ، مریض ، اور پھر حراست میں
یہ مثلِ عابدِ بیکس ہیں اس مصیبت میں

کہاں غریب نے جورِ فلک سے رحلت کی
جہاں نہ اہلِ عقیدت نہ تھا عزیز کوئی
سنا گیا ہے کہ آئی جو نزع کی ہچکی
نہ مل سکا کوئی یٰسین پڑھنے والا بھی

یونہیں یہ عاشقِ شاہِ حنین تنہا تھے
کہ بعد عصر کے جیسے حسینؑ تنہا تھے

خبر نہیں ہمیں یہ بھی کہ بعد وہ چرخِ کہن

یہ اپنی موت مرے یا ملی ہے مرگِ حسنؑ
عراقیوں کے ہیں ممنون پھر بھی اہلِ زمن
کہ رحم کھا کے انھیں دے دیا ہے غسل و کفن

ہوئی تو دفن غلام شہِ حنین کی لاش
اسی عراق میں بے گور تھی حسینؑ کی لاش

کھٹک رہا ہے یہ کانٹا نگاہِ فطرت میں
نہ دخل تھا جو سیاست کو ان کی رحلت میں
تو خوف کاہے کا تھا پھر دلِ حکومت میں
کہ لاش دفن ہوئی فوج کی حراست میں

نہ بیٹیاں تھیں نہ میت پہ بیٹے پوتے تھے
حسینؑ اپنے غریب الوطن کو روتے تھے

بہن بھی رو نہ سکی جس کی لاش پر وہ حسینؑ
پرائے دیس میں جو کر گیا سفر وہ حسینؑ
لہو سے جس کے ہے خاکِ عراق تر وہ حسینؑ
نسیم سب جسے روئیں گے عمر بھر وہ حسینؑ

وہی حسینؑ پیمبرؐ کا جو نواسا تھا
جو قتل گاہ میں سولہ پہر کا پیاسا تھا

مرثیہ محسن الحکیم کے بعد علامہ رشید ترابی مرحوم کی وفات پر نسیم امروہوی کا مرثیہ جو ان کے خاص عالمانہ اسلوب اور خاص فصیحانہ طرزِ ادا کا پتہ دیتا ہے آپ اپنی مثال ہے۔ علامہ بیک وقت عالم بھی تھے اور

شاعر بھی، مفکر بھی تھے اور فلسفی بھی، ایک طبقہ ان کو اقبال کا بہترین نقاد بھی سمجھتا ہے اور بعض لوگ ان کو ان کے سیاسی معتقدات کی بنا پر اپنا قائد بھی تسلیم کرتے ہیں۔ علامہ کی شخصیت اتنی پہلو دار ہے کہ عام آدمی کے لیے اس کا احاطہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ علامہ اور منبر لازم و ملزوم سمجھے جاتے تھے منبر کو ہماری مذہبی زندگی میں جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، یہیں سے رشد و ہدایت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ یہیں سے روحانی اور فکری تربیت کا آغاز ہوتا ہے، منبر ہمارے عقائد کی تطہیر اور نظریات کی تالیف و ترتیب میں اہم کردار ادا کرتا ہے، علامہ رشید ترابی کی عالمانہ خطابت سے منبر کو اوج ملا تھا اور یہیں سے انہوں نے پرچم حسینی کے سائے میں اپنی استدلالی قوتوں کے ذریعہ شہدائے کربلا کے پیغام کو گھر گھر پہنچایا تھا۔ نسیم امروہوی نے اپنے مرثیے میں منبر کو چہرہ بنایا ہے یہ چہرہ نہیں بلکہ ہمارے علم و عمل کی تاریخی اور واقعاتی حقیقت اور شاعر کی بلاغت شناسی کا بہترین نمونہ ہے:

منبر رواجِ علم کا اصل اصول ہے
سیڑھی اسی کی زینۂ حسنِ قبول ہے

اے چرخ دیکھ عرشِ زمیں زر رسا ہے یہ
اک تو بھی آسماں ہے اور اک آسماں ہے یہ

ہے نردباں علم سے یہ تا حدِ رسا
فطرت کی درسگاہ، حقائق کا مدرسا

آئے جو ہے تلاش یہ حق کی تُلا ہوا
منبر یہ باب علم کا در ہے کُھلا ہوا

منبر کمالِ اوج کا اوجِ کمال ہے
منبر جمالِ فکر و نظر کا جمال ہے
منبر فروغِ حُسنِ عروسِ خیال ہے
جَلّ جلالہٗ، یہ سخن کا جلال ہے

باطل شکن یہاں خمِ ابرو کے وار ہیں
فقرے نہیں دلوں کے لیے ذوالفقار ہیں

منبر سے اوجِ فکر کو تابندگی ملی
منبر سے داغِ دل کو درخشندگی ملی
منبر سے روحِ عزم کو پائندگی ملی
منبر سے زندگی کو نئی زندگی ملی

تاریخ کی نظر میں بھی ثابت یہ بات ہے
منبر ہماری قوم کی قومی حیات ہے

منبر وہ اک جہانِ عجیب و غریب ہے
جس کے مکیں کو سطوتِ شاہی نصیب ہے
ہر دم قریبِ منزلِ "فتح" قریب ہے
اس تختِ سلطنت کا سلیماں خطیب ہے

شاہی کا داب ہے تنِ سرزشت مغضوب پر
سکہ ہے اس کا اہلِ نظر کے قلوب پر

منبر کی زیب جوہرِ نطق و بیاں سے ہے
نطق و بیاں روانیٔ ذہن و زباں سے ہے
ذہن و زباں سعادتِ جلوہ فشاں سے ہے

جلوہ فشاں خطابت حکمت نشاں ہے

حکمت نشاں سبق ہے کتاب حکیم کا
یعنی خطیب علم ہے گویا علیم کا

اس مرثیہ میں برصغیر کے نامور علما و خطبا کا ذکر بڑی خوبصورتی کے ساتھ آیا ہے۔ ان کے کارناموں اور خوبیوں کی طرف اجمالی طریقہ پر بڑے عمدہ اور دلنشیں اشارے کیے گئے ہیں۔ اس سے شاعر کی اس سلیقہ مندی کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ وسیع ترین موضوعات کو چند شعروں میں کس طرح سمو دیتا ہے۔ نسیم نے علامہ رشید ترابی کے سوانح بیان کرنے کے بعد اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ علامہ کی خطابت کا خاص وصف یہ ہے کہ انھوں نے سامعین کے مذاق کا اپنے آپ کو پابند نہیں بنایا، بلکہ کچھ ایسا زور خطابت مبدء فیاض سے لے کر آئے تھے کہ باتوں باتوں میں سامعین کو اپنے مذاق کے سانچے میں ڈھال لیا:

اس اہتمام سے سوئے منبر یہ جب چلے
تھا قلزم خیال کہ پانی گلے گلے
خواہاں تھی بزم، پھول جو ایسا ہو وہ پھلے
سانچے میں سامعین کے لیکن نہ یہ ڈھلے
ذہنوں کو ایک آئنہ وہ برمحل دیا
رخ مڑ گئے، مذاق سماعت بدل دیا

اور اس طرح:

ضم کر کے فکر نو میں شعور قدیم کو ۔ کیا کیا جھنجھوڑتے تھے مذاق سلیم کو

اس کے بعد علامہ مرحوم کے طرز خطابت کی جو تصویر نسیم امروہوی نے

:

شعروں میں کھینچی ہے۔ وہ مشاہدے کا کمال ہے۔ نسیم کے ان شعروں کو پڑھتے ہوئے علامہ کے طرزِ خطابت کے تمام پہلو سامنے آجاتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ، ان شعروں کا پڑھنے والا خود علامہ کو تقریر کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے، یا دوسرے لفظوں میں علامہ خود تقریر کر رہے ہیں اور کوئی مشاق مصوّر ان کی ایک ایک نقل و حرکت کا فوٹو سامعین و ناظرین کے سامنے پیش کرتا جا رہا ہے:

بھولیں گی عمر بھر نہ وہ شیریں زبانیاں
معجز نما کی بزم میں جادو بیانیاں
تل بھر مبالغہ نہیں، کُل نکتہ دانیاں
موسیٰ کے ذکر میں بھی نہ تھیں لن ترانیاں

جلوے دکھائے حق کے تولا کے جوش میں
منبر تھا کوہِ طور، ترابی تھے ہوش میں

جو کچھ کہا وہ سب کے دلوں میں اتر گیا
منظر پھرا نگاہوں میں اور کام کر گیا
گویہ کہا کہ رن سے عدو بھاگ کر گیا
آنکھیں ٹٹولنے لگیں ڈھونڈو کدھر گیا

جب آگئے نجف میں تو کلیاں چٹک گئیں
جب بدر میں پہنچ گئے تیغیں چمک گئیں

سر جھک گئے ادب سے پیمبرؐ کے حال پر
حال آگئے صحابۂ اطہر کے حال پر
ہیبت دلوں پہ چھا گئی خیبر کے حال پر

دل فتح ہو گئے در خیبر کے حال پر
وہ ولولہ تھا سلسلۂ کارزار میں
جس طرح شیر گو بر ! ہو کچھار میں

تصویر کھنچ گئی جو پڑھا کربلا کا حال
جیسے وہ ہیں حسینؑ وہ انصار با کمال
وہ پیر، وہ جوان، وہ اطفال خورد سال
وہ بدر، وہ زہیر فلک قدر، وہ ہلال
وہ ہیں حبیب جوش میں دولھا بنے ہوئے
رکھ کر کمر پہ ہاتھ کھڑے ہیں تنے ہوئے

مرثیے کے اختتام میں نسیم امروہوی نے وہ دردناک مناظر پیش کیے ہیں جو مرحوم کی خبر وفات سے لیکر تدفین کے موقع تک پیش آئے اور بلا مبالغہ ہزاروں انسانوں نے دیکھے :

مرنے کی تیرے سن کے خبر اے کفن بدوش
ملت میں ہر بشر کے اڑے ہیں حواس و ہوش
وہ عورتوں کے بین وہ مردوں کو غم کا جوش
بیت العزا اداس، تو منبر سیاہ پوش
یوں رو رہے ہیں اہل تولا رشید کو
جس طرح ناصران حسینؑ شہید کو

اے موت! ہائے کیا گل تر چن کے لے گئی

مجھ سا کوئی نہ خارِ نظر چن کے لے گئی
مظلوم کربلا کا جگر چھن کے لے گئی
ملت کے آنسوؤں کا گہر چن کے لے گئی

کیا مل گیا غریبوں کی قسمت بگاڑ کے
اک قومِ نامراد کی دولت اجاڑ کے

اے مرنے والے دردِ جگر تم کسے سناؤں
مستقبلِ قریب میں کیا ہوگا کیا بتاؤں
دنیا ہنسے گی عزیزوں کو کیا داغِ دل دکھاؤں
تنہا تھا پوری قوم تجھے اب کہاں سے لاؤں

مرنے سے تیرے وقت کا تیور بدل گیا
قومی وقار کا بھی جنازہ نکل گیا

اس مقام پر ضمناً تبسم نے اس امر کی جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ یہ مرثیہ اک فطری تحریک سے کہا گیا ہے جو ہر مرنے والے کی یاد میں نہیں ہوتا:

ماضی میں ابتدائے مجالس سے تا بہ حال
آئے، گئے، خطیب بھی ذاکر بھی بےمثال
روتا ہے دل انہیں بھی، جب آجاتا ہے خیال
سب سے جدا مگر تری رحلت کا ہے ملال

اٹھا جو ایک، دوسرا منبر نشیں رہا
اب تیرے بعد کوئی بھی تجھ سا نہیں رہا

اس کے بعد شاعر نے اس تاثر میں اپنے ساتھ پوری قوم کو شریک

کیا ہے، جو مبالغے سے پاک وصاف ایک حقیقت واقعہ ہے:

اک حشر کی صدا ترے مرنے کی تھی خبر
جو تھا جہاں بھی دوڑ کے پہنچا وہ تیرے گھر
آئے کُل ارضِ پاک سے اصحابِ معتبر
آنکھوں میں اشک، حال پریشاں، نوحہ گر
سڑکیں پٹی ہوئی تھیں اُٹا اٹ ہجوم سے
میت اُٹھی حسین کے ذاکر کی دھوم سے

یہ سب بچشم دید، شنیدہ نہیں خبر
دو میل کا جلوس تھا میت میں ننگے سر
حکّام، اہلِ علم، زمیندار، باہنر
مزدور، حرفہ ور، طَلَبا، صاحبانِ زر
لاکھوں تھے اہلِ دل غمِ تازہ لیے ہوئے
کل قوم چل رہی تھی جنازہ لیے ہوئے

درپیش اس جگہ تھا عجب مرحلہ مجھے
منظر یہ سب کہیں سے کہیں لے گیا مجھے
کیا اہلِ دل سنیں گے تصور تھا کیا مجھے
یاد آگئی تھی بیکسی کربلا مجھے
یاں پوری قوم نقشِ مطہر لیے ہوئے
واں اک حسین لاشۂ اکبر لیے ہوئے

بوڑھا وہ باپ بیکس و مظلوم نیم جاں
دو دن کی بھوک پیاس سے جو زار و ناتواں

دے کر ابھی اٹھا تھا قیامت کا امتحاں
دل میں جوان بیٹے کی دیکھی تھی جب سناں
آنکھوں کو بند کر کے کلیجہ سنبھال کے
پھینکی تھی اپنے ہاتھ سے برچھی نکال کے

نسیم امروہوی نے ان شخصی مرثیوں کے علاوہ روائتی مرثیے جتنے کہے ہیں جو شمار اور تعداد میں ان سے تیس چالیس گنا زیادہ ہیں، اگرچہ ان کثیر التعداد مرثیوں میں بھی جگہ جگہ عزم وعمل، علم وعمل اور انقلاب صالح کا پیغام بہت موثر انداز میں دیا ہے، تاہم یہ ایک ایسا ذریعہ ابلاغ ہے جس میں دوسرے بھی ان سے بعد میں یا ان سے پہلے، کبھی کبھی ان کے ہمنوا اور ہم آواز نظر آتے ہیں، لیکن انفرادی اور شخصی مرثیوں کے ذریعے علم وعمل، اور تحریک عمل کا درس ان کا ایک ایسا شاہکار ہے جو خود ان کی اختراع ہے اور جس میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں، گو کہ ان کا پورا کلام ہر پھیر کر نقطۂ خیال کی ترجمانی کرتا ہے لیکن علم وعمل اور تحریک عمل کے جو پہلو ان کے موخر الذکر مرثیوں میں آئے ہیں وہ بالکل نئے ہیں جن سے قوم کو بصیرت بھی ملتی ہے، آگاہی بھی اور خود شناسی بھی، اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ نسیم امروہوی پہلے مرثیہ گو ہیں جن کی فکر سے ہمارے ادب کو علم وعمل اور تحریک عمل کا تصور ملا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔

عبدالرؤف عروج

مراثی نسیم

میں

جدت پسندی کے رجحانات

پروفیسر

سید طاہر حسین نقوی

ایم اے

اردو مرثیہ کے آغاز اور ارتقاء کے منازل کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے یہاں صرف اتنا کہنا ہے کہ پہلے مثنوی، پھر چو مصرعوں اور ترکیب بند و ترجیع بند کے مرحلوں سے گزر کر مسدس کی شکل میں بالآخر اسے نظم کرنے کا رواج ہوا اور یہ شکل مرثیہ کے مزاج سے سب سے زیادہ مناسبت رکھتی تھی۔ مسدس میں سب سے پہلے مرثیہ کہنے کا شرف بقول نواب سید نصیر حسین خیال حیدری دکھنی کو حاصل ہوا۔ لیکن اصغر گونڈوی نے پیام زندگی کی پہلی جلد مطبوعہ ۱۹۲۸ء میں اس سے اختلاف کیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ اُس بند کی زبان (جو اس سلسلہ میں پیش کیا جاتا ہے) ولیؔ دکھنی کے عہد کی زبان سے میل نہیں کھاتی اور قیاس آرائی کی کہ شاید یہ بند حیدر بخش حیدری کی تصنیف ہو جس نے ۱۲۰۹ھ میں گل مغفرت کے نام سے واقعاتِ کربلا پر بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ بند یہ ہے ؎

عزیزو آج ناموس نبی پر آفت آئی ہے — شبِ رخصت ہے بہنوں کی خدیجے جدائی ہے
خصوصاً بی بی بانو نے عجب حالت بنائی ہے — سرہانے بی سکینہ کے کھڑی دیتی دہائی ہے

منہ اس کا چومتی ہے اور یہ کہہ کہہ کے روتی ہے
اری اُٹھ لاڈلی میری غضب کی صبح ہوتی ہے

— یقیناً یہ زبان محمد شاہی عہد کی زبان نہیں ہو سکتی۔ بہر حال اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ سودا نے مسدس کو مرثیہ کے لئے استعمال کیا اور پھر بعد کو جب لکھنؤ میں مرثیہ گوئی نے ترقی کی تو مشہور شعراء نے مسدس ہی کو اظہار خیال کا وسیلہ بنایا۔ حالانکہ اس وقت تک فارسی میں قصیدہ، غزل اور مثنوی کی اصناف میں سات آٹھ سو سال کی کوششوں کا ثمر بہترین شاہکاروں کی صورت میں موجود تھا، جو اب تک بے مثال سمجھے جاتے ہیں۔ اور اردو زبان میں بھی، قصیدہ میں سودا، غزل میں میر اور مثنوی میں میر حسن اپنا لوہا منوا چکے تھے اور جو آج تک ان اصناف کے امام قرار دیے جاتے ہیں۔ میر حسن کی مثنوی نے تو بالخصوص بے مثال مقبولیت حاصل کی تھی اور اس صنف میں مرثیہ کے مضامین کو ادا کرنے کی صلاحیت بھی پائی جاتی تھی۔ جس کی مثال دکھنی مرثیوں میں ملتی ہے۔ لیکن میر ضمیر نے مسدس کو بہت کامیابی سے استعمال کیا اور ان کے خیال سے متفق ہو کر صاحب سحر البیان کے فرزند نے بھی مسدس ہی کو مرثیہ کے لئے منتخب کیا۔

یہ وہ دور تھا جبکہ دہلی کی سیاسی فضا بہت پر آشوب تھی۔ اور شعر و ادب کی ترقی کے لئے بالخصوص ماحول بہت ناسازگار ہو گیا تھا۔ پہلے میر اور سودا اور بعد میں مصحفی اور انشاء کو دہلی کے بجائے اودھ میں امان ملی، فیض آباد اور لکھنؤ علم و ادب اور شعر و سخن کے مرکز بن گئے۔ شاہان اودھ کی فیاضیاں اور ان کی شعر و ادب سے دلچسپی اور شغف، یہ وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے لکھنؤ علم و ادب کا گہوارہ بن گیا۔ وہاں کے اس وقت کے باشندوں کو دو طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ باشعور طبقہ جس میں اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ غیرت قومی تھی۔ اور شوکت پارینہ کے زیاں کا احساس تھا جس کے تحت شعور میں اسلامی عظمت کے بعد دور انحطاط کا شدید احساس اس کو مضطرب رکھتا

تھا۔ دوسرا طبقہ وہ تھا جس کی ذہنی سطح بلند نہ تھی اور افکارِ عالیہ کے اعتبار سے دیوالیہ تھا۔ اس طبقہ میں خال خال صاحبانِ شعور بھی تھے۔ لیکن وہ نا عاقبت اندیش تھے اور آنے والے طوفان سے یا تو بے خبر تھے یا باخبر ہو کر بھی طاقتِ آشوبِ آگہی نہ رکھتے تھے۔ شترمرغ کی طرح ریت میں منہ چھپانے میں اپنی عافیت سمجھتے تھے۔ وہ قوم کی عظمتِ پارینہ سے تغافل برت رہے تھے اور شمشیر و سناں ترک کر کے طاؤس و رباب کی طرف مائل تھے۔ غنائیہ شاعری، مے نوشی اور دیگر واہی تباہی مشاغل کے ساتھ اپنا غم غلط کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ غزل کی صنف کو جنسی جذبات کے اظہار کا آلہ پا کر انھیں تسکین ہوتی تھی۔ اس صنف کو جو عشق کے لطیف اور پاکیزہ جذبہ کے اظہار کے لئے اختیار کی جاتی تھی اور جس کو دردِ غم اور سوز و گداز کے مضامین کے لئے میرؔ جیسا استادِ فن استعمال کر چکا تھا، آشنا گر کر اول اول ڈھاچا ڈاچ کرتا ہے اور پھر ریختی کے حضیض تک پہنچا دیا۔

اودھ کی وہ کشش جس نے میرؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، میر حسنؔ جیسے استادوں کو اپنی طرف کھینچ بلایا تھا برقرار نہ رہ سکی اور ربع صدی ہی میں انحطاط کی رفتار تیز ہو گئی حکومت ان بادشاہوں کے عہد میں بالکل برائے نام رہ گئی تھی، انگریزوں کا تسلط زور پکڑتا جا رہا تھا، ریزیڈنٹ کے ہاتھوں میں سارا انتظام تھا اور بادشاہ ان کی سیاسی شطرنج کے مہرے تھے۔ انشاؔ کا مشہور لطیفہ "اللہ بیلی" والا اسی بات کی غمازی کرتا ہے کہ بادشاہ کس قدر مجبور تھے۔ ظاہر ہے کہ بادشاہوں میں جب اپنی مجبوری کا احساس بڑھ گیا تو انھوں نے ملک کے انتظامی اور سیاسی مشاغل سے اپنی توجہ ہٹا کر دوسرے مشاغل کی طرف رخ کیا۔ سیاسی داؤ پیچ میں جب ہار گئے تو پتنگ کے پیچ لڑانے لگے۔ اپنی رعایا کو ابھارنے اور فوج کو لڑانے کے قابل نہ رہے تو مرغ اور بٹیروں کو لڑا کر دل کا ارمان نکالنے لگے۔ عوام میں بھی یہ کھیل رواج پا گئے اور بہت مقبول ہوتے، ان ہی کھیلوں میں شاعروں کا لڑانا بھی ایک کھیل تھا جس کو محفلوں میں نہیں بلکہ بازاروں میں بھی کھیلا جانے لگا تھا۔

انشا: مصحفی کے اس تصادم میں انشا کو شاہی سرپرستی حاصل تھی اور ساری خلق ایسی ڈرامہ کی تماشائی تھی، شاعروں کی لڑائی کا آتش و ناسخ بھی شکار ہوئے۔ جس مشاعرہ میں آتش شرکت کرتے تھے، ناسخ اس میں شرکت سے گریز کرتے اور اسی طرح جس میں ناسخ کو بلایا جاتا آتش اس میں شرکت سے اجتناب کرتے۔ ہم یہاں ان باتوں کا ذکر نہ کرتے اگر ہمارے مرثیہ گو شعرا اس سے متاثر نہ ہوتے، لیکن لکھنو کے عوام میں انیسیے اور دبیریے بھی تو اس کی مثال ہیں۔

غرض لکھنو کے باشندوں کے افکار میں متضاد رجحانات پائے جاتے تھے، جو بیک وقت جاری تھے گو سمتیں مختلف تھیں۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اردو مرثیہ کی نشو و نما کے اہم ترین عوامل میں سے ایک حکومت کی شیعہ مذہبی بھی تھی، مگر ہم اس سے اتفاق نہیں کرتے، ۹۱۱ھ میں صفوی خاندان کی بنیاد پڑنے پر ایران کی حکومت کا مذہب شیعہ ہو گیا تھا کیونکہ یہ خاندان سید تھا اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی نسل سے تھا، لہذا ان بادشاہوں کو عزاداری سے خصوصی لگاؤ بھی تھا۔ سلاطین اودھ کے دورِ حکومت کے وقت ایران میں تین سو برس سے شیعہ مذہب فروغ پاتا رہا۔ اور عہد مغلیہ میں ہمایوں کے وقت سے جتنے مشہور ایرانی استادانِ فن شعرا ہندوستان میں آئے یا ایران ہی میں رہے (جن میں عرفی۔ نظیری۔ ظہوری۔ ابوطالب کلیم جلال اسیر محتشم کاشی وغیرہ شامل ہیں) اُن میں سے اکثر کے کلام میں معصومین کے مناقب میں سیکڑوں قصائد پائے جاتے ہیں اور یہ سلسلہ بعد میں بھی قاآنی کے دور تک رہا جس نے بیسیوں قصائد منقبت میں لکھے۔ لیکن وہاں مرثیہ گوئی نے ترقی نہ کی، صرف محتشم کاشی کا ہفت بند ہی قبولِ عام حاصل کر سکا۔ جب ہم اسباب پر زیادہ غور کریں گے تو محسوس ہوگا کہ ایرانی تو ہمیشہ آزادی کی دولت سے مالا مال رہے جو بادشاہتیں قائم ہوئیں وہ اُنہی کی تھیں اور آج بھی ہیں۔ وہ کسی بڑی طاقت کے غلام نہ ہوئے برخلاف اس کے آٹھ نو سو برس حکومت کرنے کے بعد اس برصغیر

مسلمان انگریز کے غلبہ کو قبول کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ اس غلامی پر رضامند کبھی نہ تھا۔ بلکہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہتا تھا۔ ایرانی کبھی اس آفت سے دوچار نہ ہوتے اور ان کی شاعری اس بے چینی کے احساس سے یکسر ناآشنا رہی جو مرثیہ کے سوز و گداز میں تسکین حاصل کرتا۔ لہٰذا ہماری ناقص رائے یہ ہے کہ لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کی غیر معمولی ترقی، جو صرف دو نسلوں میں اُسے ارتقاء کے اُن منازلِ علیٰ تک لے گئی جنہیں ہم مرثیہ کی معراج کہہ سکتے ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہاں کا ذی شعور طبقہ جس کو ہم انگریزی میں 'INTELLIGENTSIA' کہتے ہیں اور جس کا ناقص ترجمہ دانشور ہے' اپنے ماحول سے مطمئن نہ تھا اور اندرونی طور پر مضطرب اور بے چین تھا۔ اس تلاطم زیرِ طوفاں کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے، یہ وہ کاروان تھا جس کو متاع کے جاتے رہنے کا فقط غم ہی نہ تھا، بلکہ احساس زیاں اس کو مستقلاً مضطرب رکھتا تھا۔ اُن کے قائدین کی نااہلی اور بعد میں ان کی بے بسی نے انھیں بھی اس مصیبت میں گرفتار کر دیا تھا جو دہلی کا مقدر بن چکی تھی۔ صحیح قیادت کے فقدان اور پھر توپ و تفنگ کے مقابلہ میں شمشیر و سناں کی بے تاثیری نے انھیں مجبور کر کے رکھ دیا تھا۔ اُن کے دلوں کی دھڑکنوں میں ضمیر کی کراہ بھی صاف سنائی دیتی تھی۔ صرف مجالسِ عزا کے پلیٹ فارم پر ہی اُن کے ذہن و فکر کو آسودگی حاصل ہو سکتی تھی۔ مرثیہ کے رزمیہ کو سُن کر ہی اُن کی طبیعت کو زیست کا مزہ ملتا تھا۔ وہ ان مقامات سے اتنے متاثر ہوتے تھے کہ داد دیتے وقت اُچھل اُچھل پڑتے تھے۔ ان میں سوئی ہوئی شجاعت جاگ اٹھتی تھی اور روح بالیدہ ہوتی تھی۔ بین کے مقام پر گریہ و بکا سے اُن کے دل کا بخار ہلکا اور ذہن آسودہ ہو جاتا تھا۔ گریہ کا یہ عمل ایسا ہی تھا جس کو غالب نے "ابر بہاری کا برس کر کھلنا" کہا ہے۔ یہی وجہ مرثیہ کی مقبولیت کی تھی یہاں تک کہ دوسرا طبقہ بھی پہلے طبقہ کی ریس میں ان مجلسوں میں شریک ہونے لگا۔ یہ طبقہ کثیر آبادی کا نمائندہ تھا۔ اس کے افکار تو ان چیزوں سے کیا آسودگی حاصل کرتے، وہ تو

بیان کی لطافتوں، صنّاعیوں، رعایاتِ لفظی بلکہ ضلع جگت سے محفوظ ہونے اور طرزِ خوانندگی کی ڈرامائی حرکاتِ جسم سے لطف اندوز ہونے کی جستجو میں شرکت کرتے تھے، اور چونکہ اس طبقہ کی سامعین میں اکثریت تھی، اس وجہ سے اُس دور کے مرثیہ نگاروں نے اُن کی تسکینِ مذاق کے بھی سامان کیے۔ ورنہ اُن کی مقبولیت کو خطرہ تھا۔ انیسیوں اور دبیریوں کے جُدا جُدا جتھوں کی تشکیل میں اس طبقہ کا بڑا ہاتھ تھا۔

ان رزمیوں ہی کی برکت تھی کہ دلوں میں جوش و ولولہ پیدا ہوا۔ اجتماعی طور پر اگر جذبۂ شجاعت کو ابھارا تو صرف مرثیہ ہی نے ابھارا۔ اگرچہ عملاً کچھ نہ ہو سکا تو کم از کم ایسی فضا تو تیار ہوئی جو ماضی کی داستانوں پر فخر اور عظمتِ رفتہ کے حصول کی طلب پیدا کرنے میں معین و مددگار ہو۔ اِن ہی مجلسوں نے عوام میں انتقام کے جذبہ کی پرورش کی جو لکھنؤ کے انتزاعِ سلطنت کے بعد ایک ہی سال میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی پر منتج ہوا۔

ان دو حادثوں نے ہند کی مسلمانوں کی کمر ہمت توڑ دی، یہ بہت بڑا المیہ تھا۔ ان کے حوصلے پست ہو گئے اور انھوں نے ذہنی اور نفسیاتی طور پر بھی ہتھیار ڈال دیئے۔ کچھ عرصہ کے جمود کے بعد پھر اجتماعی طور پر اُبھارنے کی سعی سب سے زیادہ حالیؔ نے کی۔ انھوں نے اس مقصد کے لئے مسدس ہی کی صنف کو پسند کیا۔ اُن کا مقبولِ عام مسدس "مدوجزرِ اسلام" مسلمانوں کے زوال کے اسباب کی طرف اشارے کرتا ہے۔ اس میں ماضی کے کارناموں اور اسلافِ صالحہ کے اخلافِ غیر صالح کے جمود کا خاص ذکر ہے اور چونکہ اس میں قنوطیت کی بو آتی تھی، انھوں نے ایک ضمیمہ کا اضافہ کیا جس میں رجائیت کی جانب عنانِ توجہ منعطف کی گئی۔ مرثیہ کے بعد قومی اصلاح کی یہ سب سے بڑی کوشش تھی۔ مرثیوں میں اس انداز سے شعوری طور پر قوم کو اجتماعی حیثیت سے اُبھارنے کی اس سے پہلے کوشش نہیں کی گئی تھی کیونکہ اُس دورِ آمریت میں اجتماعی طور پر کسی تحریک کو چلانا آفتوں کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ کسی اعلیٰ اخلاقی مقصد کے لئے بھی خلق کا رجوع حکومت کے گمراہ مشیروں کے

دلوں میں بدگمانیاں پیدا کر سکتا تھا اور بغاوت جیسا سنگین الزام بھی لگ سکتا تھا جس کا تجربہ پہلے بھی ہو چکا تھا۔ اور بہت سے صوفیانِ باصفا اور اہلِ دل کو اسی عملِ خیر کی پاداش میں معتوبِ حکومتِ وقت ہونا پڑا تھا، مرثیہ گویوں نے بجا طور پر اس چیز سے احتراز کیا۔ لیکن انفرادی طور پر اصلاحِ اخلاق کے لئے مرثیوں میں جا بجا گوشے نکالے اور وہ یہ ہی کر بھی سکتے تھے۔

حالی کے بعد اقبال نے بھی شکوہ اور جواب شکوہ جیسی نظموں کے لئے مسدس ہی کی صنف کو اختیار کیا، یہ نظمیں بیحد مقبول ہوئیں، اُس دور کے تمام پڑھے لکھے لوگوں نے ان کو بہت پسند کیا، یہاں تک کہ بعض حضرات تو زبانی یاد کر کے مختلف صحبتوں میں ان کے بند کے بند پڑھ کر تسکین حاصل کرتے تھے۔ ان نظموں نے ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء تک کے شعرا کے افکار کو متاثر کیا۔ اُسی زمانہ میں جوش ملیح آبادی نے "آوازِ حق" کے نام سے مرثیہ لکھا۔ اور جمیل مظہری کا مرثیہ "عشق کیا ہے غمِ ہستی سے رہا ہو جانا" اس وقت شائع ہوا جبکہ اقبال کے نکر و نظر اور فلسفہ عشق سے برصغیر کے باہوش مسلمان خوب واقف ہو چکے تھے۔ اُن کا دوسرا مرثیہ "پیمانِ وفا" ۱۹۳۵ء کی تصنیف ہے۔ شاعرِ انقلاب حضرت جوش کا مرثیہ "حسین اور انقلاب" تو بعد کی چیز ہے۔

نسیم کا مرثیہ گویوں میں شمول

نسیم کے پہلے ہی مرثیہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ۱۹۲۳ء میں اپنی نو عمری ہی میں اپنے دادا تسلیم اور مونسؔ کے مراثی کا (جتنے ان کو حاصل ہو سکے) امعانِ نظر سے مطالعہ کیا تھا اور انیسؔ و دبیرؔ عشقؔ و رشیدؔ کے بھی متعدد مرثیوں کو غور سے پڑھا تھا، مرثیہ لکھنے کی نیت سے قبل انھوں نے انیسؔ کے طرز کو پسند کر لیا تھا جس سے ان کے ذوقِ سلیم کا پتہ چلتا ہے وہ اس طرز کا اتباع عمر بھر کرتے رہے اور اب بھی کرتے ہیں جیسا کہ ایک مرثیہ میں انھوں نے کہا ہے ؎

اس قدر کیوں نہ موثر ہو مری نظم سلیس — فیض جبریل مرے ذہن رسا کے ہے جلیس
میرا استاد دمِ فکرِ سخن طرزِ انیسؔ — وہ انیسؔ ایک جو تھا خالقِ ہر رنگِ نفیس

برگِ گل سے ہم سوں، وہ اک نخلِ برومندِ سخن
خسروِ مملکتِ نظم ؟ خداوندِ سخن

راہ ڈھونڈی جو تتبع میں نے کوئی حسبِ محل — ہر قدم اس کے مراثی نے دکھائی مشعل
عقدۂ فکر و نظر، مسئلۂ عزم و عمل — بادۂ مرثیہ گوئی میں کیا میں نے حل

شعر دو چار نہ دس بیس کہے ہیں میں نے
مرثیے ایک سو تنتیس [۱۳۳] کہے ہیں میں نے

اب جبکہ ان کی مشقِ سخن نصف صدی کی ہو چکی ہے وہ اسی طرز پر قائم ہیں۔ ان کے پہلے[۱] مرثیہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اقبال کے شکوہ، درجواب شکوہ کے علاوہ مسدس حالی کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ اس مرثیہ کے اجزا میں سے چہرہ میں بالخصوص اقبال و حالی کے نقوش صاف نظر آتے ہیں۔ صبح کی منظر نگاری کے چھ بند، گرمی کے منظر کے چھ بند، رجز کے چھ بند اور تلوار کے بیان کے ۲ بند۔ طرزِ انیس کے کامیاب تتبع کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اور ساقی نامہ کے گیارہ بند ہمارے صاحبِ رشید کے مطالعہ[۲] کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ساقی کے کرم سے ہو وہ دور اور وہ چلیں جام — جن میں عوض نشہ ہو کیفیت انجام

— لیکن مجموعی طور پر اس پہلے مرثیہ میں ہی نسیم کا اسلوب بن گیا تھا اور انیس کی پیروی نمایاں تھی۔ ابھی حال ہی میں ہمیں ایک مرثیہ ملا ہے جو نسیم صاحب نے دو سال پہلے انیس کی صد سالہ یادگار کے موقع پر کہا تھا۔ اس مرثیہ میں انھوں نے انیس کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد یہ نظم کیا ہے کہ انیس صبح کہتا ہے تو اس طرح، رخصت اس طرح،

---

۱ نسیم امروہوی کے مراثی سے پہلے یہ موضوعات مرثیہ میں میری نظر سے نہیں گزرے

۲ نسیم صاحب کے یہاں شراب کا استعارہ مودّت ہے اور اسی کی مناسبت سے آیات و احادیث کے اشارے سے ان کے پورے ساقی نامہ میں ہر جگہ ملتے ہیں ان کا بیان ہے کہ میں نے انیس کا یہ بند دیکھ کر ساقی نامے کہے ہیں۔

آمد اس طرح، رجز اور جنگ اس طرح، پہلوانی کی جنگ اس طرح، اور شہادت اس طرح، غرض یہ ایک مرثیہ گو شاعر کی طرف سے دوسرے مرثیہ گو شاعر کے لئے اظہار عقیدت ہے اور ایک منظوم تنقید بھی جس میں شاعر صرف شاعر ہی نہیں بلکہ نقاد بن گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مرثیہ قابل قدر اور بہت اہم بھی ہے۔

نسیم کے پہلے ہی مرثیے نے ان کے حوصلے بڑھا دیئے، اور وہ اس صنف سخن کی طرف تمام وکمال متوجہ ہوئے اور مراثی کی تصنیف کا سلسلہ جاری رہا۔ ہمیں جو مرثیے دستیاب ہوئے، اور جن کے مطالعہ کا ان دنوں موقع ملا وہ پہلے مرثیے (۱۹۲۳ء) کے علاوہ ۱۹۳۲ء اور اس کے بعد کے ہیں، ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اول اول تو انہوں نے اپنے جدت پسندی کے خیالات کو کھل کر بیان کیا۔ لیکن بعد میں وہ روایتی مرثیہ کی طرف توجہ کرنے لگے اور اسی روش اختیار کرنے میں عافیت دیکھی۔ انہوں نے اپنی استادی کا لوہا منوانے کے لئے ہر صاحب طرز مرثیہ گو کے انداز میں مرثیہ کہہ ڈالا، اور اپنا ایک مقام پیدا کر لیا۔ پھر آہستہ آہستہ تبدیلیاں شروع کیں۔ نسیم صاحب کی شخصیت میں جو دھیماپن، شائستگی، نفاست، نرم گفتاری اور انکسار پایا جاتا ہے، اس کی جلوہ گری ان کے کلام کے آئینہ میں بھی عکس ریز ہے۔ انہوں نے اپنی جدت پسندی کے رجحانات کا اظہار بھی دھیمے لہجہ میں اور آہستہ آہستہ کیا۔ ۱۹۳۲ء کے ایک مرثیہ میں جس کا مطلع ہے ع

ع اے انقلاب مژدہ عزم و عمل ہے تو

—شعوری طور پر جدید طرز کو اختیار کیا وہ مقطع میں جس کے چار مصرعے یہاں پیش کئے جاتے ہیں فرماتے ہیں ؎

ہٹ کر جو طرز عام سے یہ مرثیہ کہا — اس وادی کہن میں یہ جادہ نیا بنا

اک تازہ طرز فکر کا سورج طلوع ہے

دور جدید مرثیہ گوئی شروع ہے

جب سے اب تک کہ تقریباً چالیس سال ہونے کو آئے انہوں نے ہر مرثیہ میں جدت خیال و طریقۂ اظہار کا مظاہرہ کیا ہے اور مشق سخن کے ساتھ ساتھ اثرات زیادہ نمایاں ہوتے گئے ہیں۔

قبل اس کے نسیم کے کلام میں جدید رجحانات کا تجزیہ کیا جائے، یہ عرض ہے کہ شاعری کے فن لطیف کو ناقدین عصر حاضر نے چار اقسام میں منقسم کیا ہے (۱) غنائیہ (۲) تخیلاتی (۳) بیانیہ اور (۴) ڈرامائی۔

غنائیہ کی مثال اردو میں غزل اور گیت ہے۔ تخیلاتی شاعری کی مثال ایسی نظمیں ہیں جیسے اقبال کا "فلسفۂ غم" بیانیہ میں اردو کی حقیقہ مثنویاں ہیں۔ اور ڈرامائی میں اندرسبھا سے لے کر عصر خانہ تک کے ڈرامے، اسٹیج، فلم اور ریڈیو اور ٹیلیویژن پر دکھائے یا سنائے جاتے ہیں۔ لیکن بعض نظمیں ایسی بھی لکھی گئیں جن میں دو یا دو سے زیادہ اقسام کا امتزاج ہوتا ہے۔ مثلاً اقبال کی "مسجد قرطبہ" جو بیانیہ بھی ہے اور تخیلاتی بھی لیکن اس کا تخیلاتی رنگ بیانیہ رنگ پر غالب ہے۔

مرثیہ ایسی صنف ہے جو بنیادی طور پر بیانیہ ہے لیکن اس میں تخیلاتی شاعری بھی پائی جاتی ہے اور ڈرامائی بھی، ڈرامائی شاعری کا عنصر تخیلاتی شاعری سے زیادہ ہے۔ جدت پسند شعرا اس کے ڈرامائی عنصر پر زیادہ توجہ نہیں دیتے بلکہ تخیلاتی عنصر پر زیادہ زور دیا جاتا ہے نسیم بھی اسی طرز فکر کو اختیار کرنے لگے ہیں ان کے مرثیوں میں رفتہ رفتہ ڈرامائی عنصر کم ہوتا جا رہا ہے اور اس کے بجائے تخیلاتی عنصر کو تقویت پہنچتی جا رہی ہے۔

یہاں یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ غنائی عنصر کو بھی بعض متوسطین نے تغزل کے نام سے مرثیہ میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ ساقی نامہ اور بہار اسی قسم کی چیزیں ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ سب بے محل ہے اور المیہ اور رزمیہ سے مرکب صنف نظم میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ نسیم صاحب نے کہیں کہیں اپنے کلام میں تغزل کا رنگ پیدا

کرتا چلا ہے۔ مثلاً تلوار کی تعریف میں وہ لکھتے ہیں۔ ؎

وہ گلبدن جو ناز سے آئی سپاہ میں
زخموں کے پھول کھلنے لگے رزم گاہ میں
تھی ناریوں کی بھیڑ جہنم کی راہ میں
لاکھوں کو اس نے لوٹ لیا اک نگاہ میں
منکر کا جان و مال لیا، دین لے گئی
باہیں گلے میں ڈال کے دل چھین لے گئی

غش کھا کے رہ گیا جسے جلوہ دکھا گئی
دل میں عدو کے خوف کی صورت سما گئی
تھی کر جدھر سپاہ میں وہ کج ادا گئی
مثل نگاہ لڑتی ہوئی دلربا گئی
ہو کر لہو میں غرق جو با آبرو چلی
غل تھا وہ پان کھا کے بڑی سرخرو چلی

ان دو بندوں میں صرف دو مصرعے:۔
"تھی ناریوں کی بھیڑ جہنم کی راہ میں" اور "دل میں عدو کے خوف کی صورت سما گئی" تلوار کی ہیبت پیدا کرتے ہیں باقی دس مصرعے تغزل کے رنگ کے بے اثر ہیں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ نسیم صاحب نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ ایسے موقعوں پر بھی تغزل کا رنگ پیدا کر سکتے ہیں، یہ مصرعے کہے، ورنہ وہ دل سے اس رنگ کو پسند نہیں کرتے۔

جدّت پسندی

جدت پسندی کے اثر سے جو مرثیے لکھے گئے یا لکھے جائیں گے اُن میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جدت پسندی صرف مضمون مرثیہ پر اثر انداز ہوتی ہے یا یہ کہ تمام اجزائے ترکیبی اور اس کے جسم و جان سب پر حاوی ہے۔ ہم یہاں جدت پسندی کے آثار کی تلاش میں نہ صرف روح بلکہ جسد مرثیہ پر بھی نظر ڈالنا چاہتے ہیں اس لیے پہلے ہم جسد ہی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس ذیل میں ہمیں سب سے اول زبان پر کچھ عرض کرنا ہے جو ایک ایسا وسیلہ ہے جس سے افکار و خیالات دوسروں تک پہنچائے جاتے ہیں۔

زبان

نسیم صاحب کا کہنا ہے کہ اُن کی زبان میر انیس کی زبان ہے۔ دہلی، لکھنؤ یا امروہہ کی نہیں۔ انیس نے بھی بارہا اظہار کیا کہ یہ میری اپنی خاندان کی زبان ہے۔ انیس کا زمانہ کو تو ایک صدی گزر گئی۔ سو برس کے عرصہ میں خاصی تبدیلیاں ہونی چاہئیں اردو زندہ زبان ہے سنسکرت کی طرح مُردہ نہیں ہے۔ ارتقائی منازل پر ابطے کرتی جا رہی ہے، لیکن چونکہ ہر قسم کی شاعری کے لئے ایک خاص قسم کی زبان استعمال کی جاتی ہے میر انیس اپنی فطری بالغ نظری سے جس زبان کو استعمال کرتے رہے وہ صنف مرثیہ کے لئے انتخاب کی گئی تھی۔ سید آغا مہر لکھنوی اپنی کتاب "حیات رشید" میں رقمطراز ہیں کہ ایک محل پر اصنافِ سخن کے متعلق پیارے صاحب رشید نے فرمایا تھا "غزل، قصیدہ، مثنوی ان سب کی زبانیں الگ الگ ہیں" دبیر اور انیس کی زبانوں میں یہ فرق ہے کہ دبیر نے اپنے کلام میں عالمانہ انداز سے بعض ایسی ترکیبیں بھی استعمال کیں جو عوام کی سماعت پر بار تھیں۔ انیس نے سادگی اور محاورہ بندی کی طرف زیادہ توجہ کی اور دور زمانہ نے ثابت کر دیا کہ اُن کا اندازہ صحیح تھا۔ آج کل جدت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ زبان ایسی استعمال کی جائے جو علمی موضوعات کو بھی سادگی سے ادا کر سکے۔ سادگی کی طرف سیلان بڑھتا جا رہا ہے اور انیس کی زبان کا سکہ اب بھی رائج الوقت ہے۔ نسیم صاحب بھی ایسی ہی زبان استعمال کرتے ہیں جس میں ٹھیٹھ ہندی کے الفاظ کم سے کم اور فارسی کے آسان الفاظ اور سادہ ترکیبیں جو عام فہم ہوں استعمال کی جائیں۔

ایک زمانہ میں میر عشق نے زبان پر کچھ پابندیاں لگائیں جس طرح قدما میں شاہ حاتم نے اور متوسطین میں ناسخ نے اردو کی اصلاح کی خاطر کچھ پابندیاں لگائی تھیں جن میں سے اکثر پر لوگ کاربند بھی ہوئے۔ ان پابندیوں سے زبان و ادب کو بہت فائدہ پہنچا مگر زمانہ کے مذاق نے بعض کو قبول کیا اور بعض کو رد کر دیا۔ عشق کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ثابت لکھنوی اپنی کتاب "صبر جمیل" میں تحریر کرتے ہیں کہ۔

—— "عشق نے جب ان پابندیوں پر سختی سے عمل کیا تو اس کا انجام کیا ہوا اس کی مثال یہ ہے کہ انھوں نے ایک رباعی لکھی ۔

اصغر کے لئے شغل فغاں رکھتے ہیں   مرقد میں اسے شاہ زماں رکھتے ہیں
چلاتی ہے بانو کہ ہے سونا جنگل   حضرت مرے بچے کو کہاں رکھتے ہیں

—— لفظ "مرے" کو دجو بآ لعد کو ترک فرما دیا تھا اس لئے چوتھے مصرع کو یوں بدلا "حضرت یہ اسے آپ کہاں رکھتے ہیں" ایک لفظ "مرے" کے نکالنے سے تمام مصرع اور مصرع کی وجہ سے رباعی (بے مثل رباعی) بیٹ کے رہ گئی، لطف زبان کے ساتھ اثر بھی جاتا رہا۔ مگر ایک مشہور اور لاجواب مطلع میں مجبور ہو کر یہی لفظ "مرے" رہنے دیا۔ مصرع مطلع یہ ہے:

"سر دیح اے مرے پروردگار دے مجھ کو" آگے ثابت صاحب لکھتے ہیں کہ "ان کے چھوٹے بھائی نفیس مرحوم اور تعلیم یافتہ بھتیجے اور شاگرد رشید جناب رشید مرحوم نے ان سخت پابندیوں سے کنارہ کشی کی۔ عشق مرحوم سے زیادہ کلام مقبول ہوا۔ حالانکہ انصاف یہ ہے کہ عشق مرحوم کا پایۂ شاعری و معلومات ان دونوں سے کہیں اعلیٰ ہے۔"

۔۔۔ ظاہر ہے کہ زبان کی وسعت کو محدود کرنا کوئی چلنے والی چیز نہ تھی، رد و قبول تو عوام کے ہاتھ ہے، کسی فرد کا اجارہ نہیں۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ بعض نئی ترکیبیں رواج پا گئیں اور بعض نئے الفاظ وجود میں آئے۔ مثلاً نسیم نے اپنے ایک مرثیہ میں لفظ "خلا پیما" استعمال کیا ہے جس کا انیس کے زمانہ میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

غرض جدت پسندی کا تقاضا ہے کہ آسان زبان استعمال کی جائے، زبان بامحاورہ ہو، اس میں لچک بھی ہو اور تمام مضامینِ فلسفہ، علم کلام وغیرہ کو اس زبان میں ادا کیا جائے جو اصطلاحات سے بوجھل نہ ہو۔ چنانچہ نسیم کے یہاں یہ بات بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو ۔ فلسفۂ غم کا بیان ؎

علمِ نفسِ بشری کا ہے تقاضا پیہم ؛ ڈوب جا بحرِ الم میں تو ملے فطرتِ غم
بارگاہِ احدی میں جو سر عجز ہے خم جذبۂ غم کی بدولت ہے مشیت کی قسم
عیش میں زہد بھی معبود سے پھر جاتا ہے
غم میں کافر کو بھی اللہ ہی یاد آتا ہے

جتنا ہوگا یہ غم و درد کا گہرا احساس نام سے بھی طرب و عیش کے آئیگا ہراس
تصدِ عصیاں سے یہی قلب کو ہوگا وسواس جیسے بیٹھا ہے کوئی دیکھنے والا مرے پاس
سرکشی حق سے جہاں نفس دنی کرتا ہے
غم گناہوں کی وہاں بیخ کنی کرتا ہے

نظم فطرت کے ہیں یہ راز بھی کیا معنی خیز جذبۂ غم کو ہیں فطرت کے مناظر مہمیز
دردِ فرقت کی کسک ہوتی ہے گلزار میں تیز چاندنی باعثِ تسکیں ہے مگر غم آمیز
دل کی دھڑکن سی نجومِ فلک افروز میں ہے
غم وہ نغمہ ہے کہ ہر ساز میں ہر سوز میں ہے

زبان کو رواج دینے اور اس کی لطافتوں کو قارئین کے سامنے پیش کرنے کے لئے نسیم نے ایک بالکل نئی اور انوکھی ترکیب ایجاد کی، وہ یہ کہ انھوں نے "مرثیے ایسے بھی کہے جن میں "پانی" اور "چراغ" کے مختلف معانی اور ان سے مرکب مختلف محاورات کو نظم کیا ہے ان دونوں مرثیوں کے ہر مصرعے میں اس کا التزام کیا کہ وہ قاری کو آسانی اور اس کے ذوق تجسس کی تسکین کا سامان فراہم کردیں۔ چنانچہ یہاں نمونہ کے طور پر ایک ایک بند دونوں مرثیوں سے پیش کیا جاتا ہے۔ ایک مرثیہ کا مطلع ہے :

ہے فطرت اللہ بے غبار ہے پانی ؎

اس کا ایک بند یہ ہے :

اگر یہ پھل کی صفت ہو تو سمجھو پھیکا ہے   جو ذکر شیر میں آئے رقیق ہوتا ہے
جو وصفِ آہن و فولاد ہو تو ٹھنڈا ہے   ہوں اصل و نسل کے معنی تو استعارا ہے

یہ روزمرہ ہے مشہور مرزبانی کا
کہ جانور ہے بہت اچھے کھیت پانی کا

—— نسیمؔ نے اس مرثیہ میں کم و بیش بیس معانی و محاورے نظم کئے ہیں۔

—— دوسرے مرثیہ کا مطلع ہے

ع   چراغ خونِ حسینی مدام روشن ہے

—— اس میں بھی انھوں نے چہرہ کے انیسؔ بندوں میں کم از کم پچیس محاورے نظم کئے ہیں۔ ملاحظہ ہو ایک بند:۔

وہ حق کا نور وہ خندق وہ حملۂ اسرار   چراغ کرنے کو ٹھنڈا وہ گرمئ کفار
مجاہدوں کے رخوں پر یہ دہشتِ پیکار   وہ ٹمٹماتے ہوئے سے چراغ کے آثار
اگر علیؑ کہیں ایسی گھڑی میں ٹل جاتے
سوادِ کفر میں گھی کے چراغ جل جاتے

فنی لوازم کا لحاظ فن کی پابندیوں کے سلسلہ میں ہم یہ عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ انیسؔ کے وقت سے نظم میں جو تغیرات ہوتے اور پابندیوں کا لحاظ کرنے سے لوگوں نے اغماض برتا یہاں تک کہ اب اردو میں شعرا نظمِ آزاد لکھنے لگے جس میں اور نثر میں فرق محسوس کرنا کبھی کبھی دشوار ہو جاتا ہے۔ مسدس کی صنف میں کوئی تغیر نہ ہوا یعنی وہی پہلے چار مصرعہ ایک قافیہ میں اور بعد کے دو مصرعے جدا گانہ قافیہ کے ساتھ، شعرائے قدیم سے لے کر جدید تک نے اس کا خیال رکھا کہ ٹیپ کے دونوں مصرعوں میں علاوہ قافیہ کے ردیف بھی ہو۔ نسیمؔ نے بھی ان لوازم کی پوری پابندی کی بلکہ ایک اور بات کا بھی خیال رکھا، وہ یہ کہ ٹیپ کے مصرعے چوتھے مصرعہ سے مربوط بھی رہیں

اور اس سے ہلکے نہ ہوں یعنی ایسا نہ ہو کہ چوتھا مصرعہ تو بہت بلند ہو اور اس کے بعد ٹیپ پست نظر آئے۔ اُن کا خیال ہے کہ میر انیسؔ کی کامیابی کا راز اسی میں تھا کہ اُن کے یہاں اس بات کا ہر بند میں لحاظ رکھا گیا تھا، لیکن مرزا دبیرؔ اس میں محتاط نہ تھے، ان کے یہاں یہ پست و بلند جمع ہو کر اُن کے کلام کو بے مزہ کر دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان امور کے پیش نظر کتنا ہی جدت پسند شاعر ہو وہ ان قیود سے وابستگی کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔

البتہ عروض میں بعض جدت پسند شعراء نے کچھ راستے نکالے۔ صدیوں سے رزمیہ اور بیانیہ شاعری کے لئے شاہنامہ کی بحر یعنی بحر تقارب مثمن مقصور الآخر کے وزن میں یعنی "فعولن فعولن فعولن فعول" ہی سب سے زیادہ مقبول رہی۔ لیکن ابوالاثر حفیظ جالندھری نے شاہنامہ اسلام میں بحر ہزج مثمن سالم یعنی مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن کو اختیار کیا اور کامیاب رہے۔ نسیمؔ نے مروجہ اوزان میں ہی مرثیے لکھے اور وہی پانچ بحریں استعمال کیں جو ان سے ماقبل کے مرثیہ نگار استعمال کرتے رہے تھے، لیکن ان کا ایک نہایت اچھا مرثیہ ایک اور وزن میں بھی ہے یعنی بحر رمل مثمن محذوف الآخر میں جس کا وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہے، اس مرثیہ کا مطلع ہے "عہد رفتہ کی طرح گو منتشر اب ہم نہیں"۔ جس بحر کے متعلق شوکت سبزواری مرحوم کے الفاظ یہ ہیں۔ "مرزا دبیر نے ابتداءً بحر رمل مثمن محذوف الآخر میں بھی دو تین مرثیے کہے تھے لیکن معاصرین اور تابعین میں یہ بحر مقبول نہ ہو سکی۔" نسیمؔ اس بحر میں کامیاب رہے۔ یہ بھی اُن کی جدت پسندی کے رجحان کی طرف اشارہ ہے۔

قافیہ: بھی مسدس کی نظم میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے بے عیب ہونے کے لئے بہت کوششیں کی جاتی ہیں۔ اور عیوب قافیہ کا پایا جانا شاعر کی بے مائیگی ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اب عیوب میں ایک عیب ایطاء (جلی و خفی) یا شائیگاں اگر پایا جائے تو اس سے اغماض نظر کرنا چاہیئے۔ اس قسم کے عیوب کا رفع کرنے کی کوشش میں

کبھی کبھی بڑے عمدہ مصرعے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ خواجہ نصیر الدین طوسی کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی اور مسدس میں اگر ایطاء واقع ہو تو مضائقہ نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"درجہا مثنوی ہا و غزلہائے مربع و مسمط استقصائے بسیار نہ کنند و استعمال بعضے عیوب روا دارند۔"

— مرزا غالب کے الفاظ یہ ہیں۔

"اہل خرد نے خاک اڑائی ہے اور بات بنائی ہے اور خفی اور جلی کی تفسیر میں وہ لکھا گیا ہے کہ صاحب طبع سلیم کبھی اس کو نہ سمجھے چہ جائے آنکہ مانے۔"

— جب اس قسم کی آزادی کا حق قدما کو بھی حاصل تھا تو اس جدت کے دور میں اگر اسی طرح کی بے اعتدالیاں ہو جائیں تو روا ہے۔ نسیم کے کلام میں بھی اس قسم کی بے اعتدالیاں اگر کسی کو نظر آئیں تو اس پر توجہ نہیں کرنی چاہیئے۔

صنائع لفظی ہوں یا معنوی اُن کا استعمال اگر سلیقہ سے کیا جائے اور کلام میں آورد نہ ہونے پائے تو ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے، سنسکرت میں ان کو "النکا" کہا جاتا ہے جس کے معنی ہیں زیور۔ تو جس طرح مناسب اور نازک زیور حسین صورت میں زیادہ کشش پیدا کرتا ہے اور زیادہ زیور جو حسن ذاتی کو چھپا دے اور اس کے خدوخال پر حاوی ہو جائے از دیاد حسن تو کیا اس کی فریفتگی ہی کو ختم کر دیتا ہے، اسی طرح ان صنائع کا استعمال بھی ہے۔ انیس کا یہاں صنعتوں کا استعمال اتنا ہے کہ بعض اوقات کلام میں آورد معلوم ہونے لگتی ہے وہ اس طریقے پر شعر کہنے پر مجبور رہتے۔ اصغر گونڈوی نے پیام زندگی جلد اول میں لکھا ہے۔

"ایک دفعہ کسی خوش مذاق شخص نے میر انیس سے یہ شکایت کی کہ آپ

نوٹ: جب اس قسم کی بے اعتنائی نہ ہو تو توجہ کرنے نہ کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

بھی لفظی رعایتوں کا بہت لحاظ فرمانے لگے تو دبیر صاحب نے فرمایا کہ بھئی کیا کریں لکھنؤ میں رہنا ہے ۔"

— نسیم صاحب بھی اُسی لکھنؤ میں اٹھارہ سال رہے اور ان کی مرثیہ گوئی سب سے زیادہ وہاں کی فضا ہی میں پروان چڑھی، وہ بھی اپنا دامن نہیں بچا سکتے تھے، وہ مجبور تو نہ تھے، لیکن انھیں اس میں کوئی عیب نظر نہیں آتا تھا۔ چنانچہ ان کے قول کو ڈاکٹر سید مسعود حسین زیدی نے نقل کیا اور اس عبارت کا ایک حصہ یہاں بھی پیش کیا جاتا ہے۔

"میں نے اپنے کلام میں حُسن پیدا کرنے کے لئے واقعات و حقائق میں تصرف کرنا موزوں نہیں سمجھا بلکہ واقعہ کے روکھے پھیکے بیان میں لفظی و معنوی خوبیوں اور دلکش تشبیہات و استعارات کے استعمال سے اتنی دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی جتنی سامع یا ناظر کو متوجہ رکھنے کے لئے ضروری تھی۔"

دوسری جگہ کہتے ہیں۔

"دماغ کی غذا پختگی اور استدلال ہے، لیکن ذوقِ سلیم کا اس حال سے بالکل مختلف ہے۔ یہ لفظوں کے برمحل استعمال، محاورات و ضرب الامثال کی چسپیدگی، زبان کی گھلاوٹ، طرزِ ادا کی ترصیع، واقعات سے الفاظ و اسلوب بیان کے تعالق اور اسی قسم کے دوسرے محاسن کا دلدادہ ہے۔"

پھر آگے صنائع کے استعمال کے متعلق اپنی رائے یوں ظاہر کی ہے۔

"ادماج، استتباع، تبلیغ، اغراق، غلو، ترجیہ احسن تعلیل، تجرید اور اسی طرح کی دوسری بے شمار صنعتیں استعارے اور تشبیہیں ہر شاعر کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ آخر ایہام، تجنیس، اشتقاق، تضاد اور مراعاۃ النظیر وغیرہ ہی نے ایسی کیا خطا کی ہے کہ ان کے استعمال کو معرض بحث میں لایا جائے۔"

چنانچہ اُن کے کلام میں مراعاۃ النظیر کی مثال ملاحظہ ہو۔

؎ دیکھئے اقبال کا شکوہ جو ایسی ہی صنعتوں سے آغاز ہوا ہے۔ کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں

خزاں کا دور ہوا گلشن شریعت میں — دخیل ہو گئے کانٹے چمن کی نزہت میں
نکالتے ہیں جو شاخیں اصول ملت میں — ردا ہے کب یہ روش باغباں کی غیبت میں

چمن چمن جو یہ باغی ہیں بار پائے ہوئے
کلی کلی ہے شگوفوں سے خار کھائے ہوئے

یا مثلاً۔ ترجمۃ اللفظ اور ایہام تناسب :۔

سے اسلام میں خدا کا دیا یہ چراغ ہے

یا ایہام تناسب کی مثال :

سکوں کے ساتھ میسر نہ ہو جو کھانا بھی — تو بھول جاتے ہیں تسبیح مردوانا بھی

— اسی قسم کی لاتعداد مثالیں ان کے کلام میں مل جاتی ہیں لیکن کہیں آورد کا شبہ بھی نہیں ہوتا۔

انہی صنعتوں میں سب سے زیادہ آسان اور سب سے زیادہ مشکل صنعت تشبیہ ہے مغرب میں جس نظم کو EPIC کہا جاتا ہے اور مرثیہ کی صنف ہی EPIC سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ اس میں تشبیہات کو بہت اہمیت دی جاتی ہے، انگریزی میں ایسی نظموں میں تشبیہ کی ایک خاص قسم LONG FAILED SIMILI ہے یعنی وہ تشبیہ جو مشبہ اور مشبہ بہ کے کئی مشترک خصوصیات کو تفصیل سے پیش کرے۔ اردو میں اسی قسم کی تشبیہات نہیں ملیں گی لیکن تشبیہات کے استعمال میں ندرت اور غرابت کا پہلو قابل توجہ ہے تشبیہ جتنی نادر ہوگی، یا محسوس کی غیر محسوس سے یا متحرک کی متحرک سے بہت مشکل سمجھی جاتی ہے۔ شاعر کی جدت پسندی کے مظاہرہ کا اس میں بہت موقع ہے۔ غالب کی ایک تشبیہ متحرک کی متحرک سے مثال میں پیش کی جاتی ہے۔ ؎

"چوں عکس پل بسیل بہ ذوق بلا برقص — جا را نگاہ دار و ہم از خود جدا برقص"

— نسیم کے یہاں متحرک کی تشبیہ متحرک سے ایک موقع کی پیش کی جاتی ہے ؎

ٹاپوں سے گرد اڑ کے گئی سوئے آسماں — آنکھوں میں دھول جھونک کے غازی ہوئے رواں

کانٹوں میں پھنس کے گل صفت بو نکل گئے

پلکوں کو چیرتے ہوئے آنسو نکل گئے

شاعر کی قوت مشاہدہ اور افکار کی جدت تشبیہات میں ندرت اور حسن پیدا کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہاں اس قسم کی چند حسین اور عمدہ تشبیہیں پیش کی جاتی ہیں جن میں اکثر محسوس کی تشبیہات غیر محسوس سے ہیں۔

اُٹھے صفت دستِ دُعا راہِ طلب میں — تسبیح کی مانند چلے خدمتِ رب میں

یوں بے تکان چلتا ہے خنجر کی آب پر — جیسے امامِ شرعِ رسالتؐ مآب پر

اڑتا تھا وہ یوں جیسے کہ برے سے تطہیر — یوں پھرتا تھا جس طرح مری نظم کی تقدیر

یا حرفِ غلط پر مرا خامہ دمِ تحریر — یا دیدۂ مشتاق میں محبوب کی تصویر

یوں تیز چلا جیسے دُعا جائے دل کی

یا کان میں حیدر کے صدا نادِ علی کی

غصہ میں آنکھ بادۂ گلگوں کا جام تھی — زلفِ دراز سر پہ مصیبت کی شام تھی

رات دن فضلِ خدا سے جو سن و سال بڑھا — قد و قامت صفتِ شوکت و اقبال بڑھا

کاٹھی سے تیغ نکلی کہ قرآن سے نیک فال — مشرق سے صبحِ حشر کا خط، ابر سے ہلال

یا حکمِ رب حدیثِ رسالتؐ مآب سے — یا آیۂ جہاد خدا کی کتاب سے

چہرہ کا رنگ بن کے اڑے تھے حواس بھی

— اس قسم کی سیکڑوں لطیف و پاکیزہ تشبیہات اُن کے کلام میں جا بجا بکھری نظر آتی ہیں۔

دبیر اور انیس کے دور میں صنائع معنوی پر جس قدر توجہ دی جاتی تھی، صنائع لفظی کے بھی لوگ بہت دلدادہ تھے، چنانچہ ایک صنعت ہے جس کو عاطلہ یا مہملہ، یا غیر منقوطہ کہتے ہیں۔ اس صنعت کی رُو سے نظم میں الفاظ ایسے حروف سے مرکب ہوتے ہیں جو غیر منقوطہ ہوں۔ مرزا دبیر نے اس صنعت میں ۱۰۱ بند کا مرثیہ نظم کیا، جس کا مطلع ہے:

ع ہم طالع ہما مراد ہم رسا ہوا

— میر انیس نے بھی اپنا زورِ طبع اور قدرتِ سخن دکھانے کے لئے پچاس بند کا مرثیہ صنعت میں لکھا جس کا مطلع یہ ہے:

ع سدا ح ہوا کلک امام دوسرا کا

— لیکن یہ سب کنج کاویاں ہیں صنعتوں کے استعمال میں اپنا کمال دکھلانے کی خاطر مضمون اور تاثر کا خون کیا جاتا ہے۔ جدت پسندی اس قسم کے بے مصرف اسراف طبع سے ابا کرتی ہے لہٰذا نسیم نے بھی اس سے اجتناب کیا۔

انگریزی میں ایک صنعت ہے۔ اردو کی صنائع لفظی و معنوی میں کہیں ان کی مماثل نظر نہیں آتی لیکن اس میں کچھ ایسی کشش ہے کہ اس کا ذکر کرنا یہاں بے محل نہ ہوگا۔ اس کو SOUND ECHOING SENSE یا ONOMATOPOEIA کہا جاتا ہے۔

ہم اس کے مفہوم کو یوں ادا کر سکتے ہیں کہ کلام میں ایسا صوتی آہنگ ہو جو معنی سے مطابقت رکھے۔ اس کی مثال فارسی اور اردو کی شاعری میں کہیں کہیں مل جاتی ہے۔ مثلاً میر حسن کی مثنوی کا ایک شعر یوں ہے:

کہا زیر نے بم سے بہر شگوں کر دوں دوں خوشی کی خبر کیوں نہ دوں

یہ صوتی اور معنوی ہم آہنگی مذاق سلیم پر بڑا خوشگوار اثر ڈالتی ہے۔ نسیم کے کلام سے اس کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

سن سے جب تیغ چلی زن سے صدا آئی بزن

سنسناتی جو چلی فوج میں سناٹا تھا

یوں نہ برسات میں بادل کبھی پیہم برسا
جھوم جھوم ابر کرم خوب جھما جھم برسا

ہر جھما جھم کہہ رہی ہے جھما جھم علی علی
ہر طبل کی صدا ہے دما دم علی علی

مضامین مرثیہ میں جدت پسندی کا اثر

مرثیے لکھنے کا جو روایتی طرز چلا آ رہا ہے۔ اس سے ذرا ہٹ کر لیکن اس کے متوازی نئی راہیں نکالنے کا عمل بھی ایک ایسی کوشش ہے جو شاعر کو عہد جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگی کی سعی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس دور کے بعض مرثیہ نگاروں نے اس انداز پر نئے مضامین پیدا کئے ہیں لیکن مرثیہ کے نفس مضمون کو متاثر نہیں ہونے دیا۔

— انہی جدید اسلوبوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کربلا کے واقعات کا ذکر ایسے گواہوں سے کرایا جائے جو اس موقع پر موجود ہوں۔ چاند اور سورج بھی ایسے ہی گواہ ہیں جو زبان حال سے بیان کرتے ہیں۔ شاعر کا گوش شنوا اُن کے رمز کو سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ نسیم نے ایک مرثیہ میں رات کے وقت کے تمام خیالات چاند کی زبانی بیان کئے ہیں اور دوسرے میں دن کے وقت کے واقعات امام کے ورود کربلا سے عاشورہ کی شام تک کے آفتاب کی زبانی بیان کئے ہیں۔ یہ طریقہ بالکل نیا اور دلپذیر تھا۔ چاند کی زبانی حالات جس مرثیہ میں بیان کئے

گئے ہیں۔ اسے نسیم نے اُسی سال لکھا جس سال چاند کی سطح پر انسان کے قدم پہلی بار پہنچے۔ حالات و واقعات وہی ہیں جو عام طور سے بیان کئے جاتے ہیں لیکن یہ اسلوب فکر بالکل نیا اور نہایت دلکش ہے۔

اسی طرح ایک اور مرثیہ میں جس کا مطلع ہے:

ع خلق میں بندہ معبود نما ہیں احمدؐ

ایک خواب کی کیفیت بیان کی گئی ہے، اس خواب میں شاعر کو معراج حاصل ہوتی ہے۔ افلاک کی سیر کے دوران در جنت پر رضوان سے بڑا دلچسپ مکالمہ ہے۔ آخر میں شہادت حضرت علی اکبر کا ذکر شامل کر کے اس کو مرثیہ بنا دیا گیا ہے۔

اخلاقی۔ مذہبی اور دیگر مسائل قدیم مرثیہ گویوں نے کبھی بالواسطہ طور پر مرثیہ کے کرداروں کی زبان سے ایسے کلمات ادا کرا دیئے ہیں جو انسان کی بالعموم اور ایک مسلمان کی بالخصوص اعلیٰ اخلاقی اقدار کو اجاگر کریں۔ انھوں نے اکثر رخصت کے مقام پر اور کبھی کبھی رجز میں اس قسم کے مضامین کے ادا کرنے کا موقع نکالا ہے۔ لیکن اس دور میں قوم کی بد ذوقی اور کم ہمتی کے پیش نظر جدید شعرا نے بلا واسطہ ان مسائل پر روشنی ڈالنا شروع کر دی ہے اور منطقی استدلال سے اُبھرتی ہوئی ذہنی صلاحیتوں کے لئے نئے مہیجات پیدا کئے ہیں۔ کہیں تو مکالمہ کے ذریعہ اور کہیں مرثیہ کے چہرہ میں گنجائش نکال کر اور کبھی فضائل کے بیان کے موقع پر، اور کبھی کبھی مرثیہ کے بیچ میں ایسے مواقع پیدا کئے جن میں ان مضامین کو نظم کیا جا سکے۔ اس مخصوص رنگ میں سب سے زیادہ دلچسپ مقام وہ ہے جس میں عالم خواب میں افلاک کی سیر ہو رہی ہے۔ اسی سیر کے دوران دوزخ کے شعلوں کا منظر بھی نظر آتا ہے اور پھر جنت کے باغات کی طرف جانے کے لئے شاعر جب دروازہ بہشت پر پہنچتا ہے تو آواز آتی ہے۔

کھینچ لائی ہے تصور کی جسارت تجھ کو — داخلے کی نہیں جنت میں اجازت تجھ کو

یہ آواز رضوان کی تھی اس کے بعد شاعر نے رضوان سے مکالمہ نظم کیا ہے جس میں جنت میں داخلہ کا استحقاق جتانے کے لئے اپنے اعمال حسنہ کا سہارا لیا ہے۔ عالی نسبی سے لے کر مجاہدات ذاتی تک کا ذکر کیا گیا ہے لیکن رضوان نے ان عبادات اور حسنات کو ریاکاری بتا کر رد کر دیا۔ آخر میں شاعر نے اپنی شجاعت کا ذکر اس طرح کیا ہے

کب نہ تھے ہم ہنر جنگ میں چست و چالاک
سرکشی اب بھی کرے کوئی جو زیر افلاک
دم میں خاک کر دو اڑائیں کہ جری جائیں خاک

جس پر رضوان کا جواب ملاحظہ ہو:

آپ کی بر شش شمشیر کی دنیا ہے گواہ
خانہ جنگی ہے دلیل حشم و عظمت و جاہ

مرحبا! عزم رحیت کے سبق یاد تو ہیں
آپ غازی نہ سہی آپکے اجداد تو تھیں

کچھ بزرگوں کی شجاعت پہ نظر ہے کہ نہیں
خون میں عزم کی گرمی کا اثر ہے کہ نہیں
جھک کے پہلو میں تو دیکھو وہ جگر ہے کہ نہیں
بے خبر ہو کہ خبردار، خبر ہے کہ نہیں

دین سرسبز ہوا ذوق نمو سے اُن کے
سرخرو آج ہے اسلام لہو سے اُن کے

تیغ ان کی تھی وہ بیباک کہ پتھر کاٹے
کفر کی توڑ کی کمر، چیرے جگر، سر کاٹے
نیزہ و تیر قلم کر دیتے مغفر کاٹے
طائر روح پھڑکتے ہی رہے پر کاٹے

اس کی دہشت سے تو خود موت بھی تھراتی تھی
جب وہ پھر چلتی تھی اس وقت قضا آتی تھی

تم میں لیکن وہ ارادوں کی جوانی نہ رہی
نام جس سے ہے سلف کا وہ نشانی نہ رہی
روح جرأت کی وہ ہنگامہ فشانی نہ رہی
خوں وہی ہے مگر اس خوں میں روانی نہ رہی

وہ بھی لڑتے تھے مگر حق کی حمایت کے لئے
تم بھی لڑتے ہو مگر جہل و حماقت کے لئے

— ان اشعار کا آہنگ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یہ اسی شاعر کے نغموں کی صدائے بازگشت ہے جو کہتا ہے کہ:

"ع نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری"

اب اسی کی تائید میں خود نسیم کا ایک شعر پیش کیا جاتا ہے جو انہوں نے انیس کے متعلق کہا ہے۔

اسی کی بزم تجدد کا فیض ہیں فی الحال — نسیم و نجم و رضا، جوش و حالی و اقبال

مندرجہ بالا اشعار کو اقبال کے جواب شکوہ کے مقابلہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی زبان نسیم کے ذہن میں گھر گیا ہے۔

اسی سلام میں آگے شاعر ایک اور حق جتاتا ہے ؎

میں پکارا کہ مرا کام ہے قومی خدمت — واعظانہ ہے مرا رنگ سخن بے تہمت
برملا رضوان کہ بس رہنے بھی دیجئے حضرت — منہ سے خدمت کو جتایا تو جزا بھی رخصت
طلب جاہ کی منبر پہ یہ سب گھاتیں تھیں
وعظ و تبلیغ کہاں وہ تو فقط باتیں تھیں

غلط اندیش ہر اک فکر تو ہر راہ تھی کج — سعی دنیا میں تو کی، راہ خدا میں اعرج
منبر مدح و ثنا: پردہ خیال سیج دھج — تند الفاظ میں بھرے ہوئے طوفاں کی گرج
یوں تو کہنے کو بھی کچھ تھا مگر خاک نہ تھا
خاکساری کا تماشا تھا اثر خاک نہ تھا

یہاں اسی مضمون پر ایک دوسرے مرثیے کے تین بند بھی ملاحظہ ہوں:

قابل غور ہے یہ بعض مجالس کا نظام — جس کا آغاز حسین اور تمدن انجام
نہ عقائد سے غرض ہے نہ کسی سے کوئی کام — یہی مجلس ہے تو اس مرثیہ خوانی کو سلام
ضمن میں آئے مصائب تو پڑھے دب دب کے
آپ کے حال پہ آنسو نکل آئے سب کے

جب کوئی نکتہ دلچسپ زباں پر آیا — جس نے مجلس کی طبیعت کو ذرا گرمایا
داد لوگوں سے ملی اجر فصاحت پایا — بہر تسلیم جھکے۔ ختم سخن فرمایا،
حسرتیں آئی تھیں فردوس سے کیا کیا لیکر
فاطمہؑ اٹھ گئیں اشکوں کی تمنا لے کر

اتنی اصلاح تھی جائز کہ ثنا خوان خطیب — ذکر سیرت میں تماسی کی دلائیں ترغیب
یہ طریقہ ہے مگر مجلس ماتم کا عجیب — کم ہو حال شہداء بیش خیال تہذیب
گر یہی رنگ ہے تنظیم کے دیوانوں کا
پھر تو اللہ ہی حافظ ہے عزاخانوں کا

ـــــ عزاداری کے متعلق انہوں نے اپنا نظریہ ایک اور مرثیہ میں پیش کیا ہے۔ جہاں وہ کہتے ہیں:

بپا جو کرتے ہو مجلس شہداء کے لئے — اشاعت غم مظلوم کربلا کے لئے
نہیں ہے صرف یہ دم بھر کی واہ وا کیلئے — یہ مدرسہ بھی ہے اک دین مصطفیٰ کے لئے
نہیں یہ بزم ہدایت کا باب ہے گویا
حسینؑ علم و عمل کی کتاب ہے گویا
زباں سے کرتے ہو دعوئی حسینیت کا اگر — دکھاؤ کچھ تو حسین شہید کے جوہر،
سجو وہ اسلحہ جس پر فدا ہوں فتح و ظفر — ثبات عزم کی تلوار لو حیا کی سپر

جو حیدری ہو تو ہمت کرو دلیر بنو
بڑھو نہ بڑھ کے ہٹو۔ بڑھتے جاؤ شیر بنو

اسلام اور انقلاب

جس طرح عدم تغیر جمود اور سکون پر منتج ہوتا ہے، حرکت اور انقلاب کی برکتوں سے قافلۂ ارتقاء آگے قدم بڑھاتا ہے۔ اگر کائنات میں یہ ارتقائی جد و جہد ختم ہو جائے تو اس نظام کے ختم ہو جانے کا سبب بن سکتی ہے اور جس طرح مادی میں ارتقائی عمل کا لازمہ حرکت و تغیر ہے کائنات فکر و خیال کا ارتقا بھی انقلابات کار ہیں۔ اسلام دنیا میں سب سے بڑا انقلاب اپنے ساتھ لایا۔ اس نے فکر و خیال کی دنیا یکسر بدل ڈالی جس کے لئے حالی نے کہا ہے:۔

رہا غم نہ بیڑے کو موج بلا کا
ادھر سے ادھر پھر گیا رخ ہوا کا

نسیمؔ نے بھی ان مضامین کو ذرا تفصیل سے پیش کیا ہے چند بند ملاحظہ ہوں:۔

جاری یہی ازل سے ہے قانون لم یزل
تمہید انقلاب ہے فطرت کا ہر عمل
ممکن نہیں کہ قوت نشو و نما ہو شل
ہر بیج ایک پھول ہے ہر پھول ایک پھل
اک انقلاب نو کی تمنا لئے ہوئے،
ذرے ہیں اپنی گود میں صحرا لئے ہوئے

یہ حریت یہ جذبہ بیداری امم
سب انقلاب ہی کے توابع ہیں بیش و کم
ہر گام پر ہیں جادۂ ہستی میں پیچ و خم
گزرا ہے کاروان تمدن قدم قدم
روحانیت ترقی کامل کا نام ہے
مذہب بھی انقلاب امم کا پیام ہے

اسلام جو ہے سارے مذاہب کا ماحصل
ہے یہ بھی انقلاب کا پیغمبر عمل
چونکا کے جس نے خواب تغافل سے بر محل
سمجھا دیا کہ عقل ہے اوہام کا بدل

پیدا یہ انقلاب کے ساماں ہو گئے
اک دم میں بت پرست مسلماں ہو گئے

— اور اسی "انقلاب اُمم" کے مخالفوں نے اسلام دشمنی پر کمر باندھ لی۔ رجعت پسند طبیعتیں دین کو پلٹا کر پھر کفر کی طرف لے جانا چاہتی تھیں۔ لیکن حسینؑ نے اپنے خون سے اس انقلاب آفریں مذہب کے باغ کو سیراب کیا۔ اور پھر:

نقش الا اللہ بر صحرا نوشت
سطر عنوان نجات ما نوشت

— نسیم، حسینؑ کے متعلق لکھتے ہیں :۔

دیرانۂ جہاں میں تمدن کا اک چراغ
وہ ارتقا کا دل، تو وہ تہذیب کا دماغ
باغ وفا کے لالہ و گل جس کے دل کے داغ
شاداب جس کی شبنم خوں سے عمل کا باغ

ہاں اے حسینؑ ظلمت باطل میں حق ہے تو
قرآن انقلاب کا پہلا ورق ہے تو

میدان کربلا میں اسی انقلاب فکر کی ایک زندہ و پائندہ مثال قائم ہوئی۔ وہ حرؑ کی شہادت تھی۔ وہ حرؑ جس نے امام حسینؑ کو سب سے پہلے روک کر اس المیہ کو جنم دیا۔ وہ ہی اس معرکہ میں حق کی حفاظت میں سب سے پہلے سینہ سپر ہوا۔ اس انقلاب فکر و نظر کو نسیم نے اپنے دو مرثیوں میں نظم کیا ہے ایک مرثیہ کا مطلع ہے:

اے روح حریت شرف جسم و جاں ہے تو

اشعار ملاحظہ ہوں:

باتیں تھیں دل ہی دل میں خود اپنے سے تا سحر
باطل یہ ہے وہ حق، یہ شر ہے تو وہ قمر
نفس و ضمیر دونوں صف آرا تھے ہم دگر
مائل وہ مال پر نظر اس کی مآل پر

— پھر آگے نفس و ضمیر کا مکالمہ چار بند تک چلتا ہے لیکن نسیم نے صرف دو چیزوں کا مقابلہ کیا، مال اور عاقبت کا خیال۔ یہ مرثیہ ۳۸ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے دلائل و براہین

میں وہ پختگی اور زور نہیں پایا جاتا جو ان کے ایک بند کے مرثیہ میں پایا جاتا ہے جس میں اسی قسم کے مکالمہ میں انہوں نے پانچ ہی بند لکھے ہیں لیکن ان میں حسینؑ کی نو محاسن اور یزید کے گیارہ عیوب گنا ڈالے جو حسن استدلال اور جو انداز بیان ان پانچ چھ بندوں میں ہے وہ کسی مرثیہ گو کے کلام میں اسی موقع کے بیان میں آج تک نہیں ملتا یہاں شاعر کو یقیناً الہام ہی ہوا ہے۔ ملاحظہ ہوں:

سن کے یہ رہ جو گیا سر کو جھکا کر ضرغام ‏— حرؑ کی جانب متوجہ ہوئے آقائے انام
ڈالدیں آنکھوں میں آنکھیں جو بہ انداز امام[1] ‏— ہم سخن حرؑ سے ہوا غیب بطور الہام

لب توفیق نے جتنے بھی سوالات کیے
منقلب ان کے جوابوں نے خیالات کیے

شاہ زہراؑ کے پسر ہیں کہ نہیں؟ بولا ہیں ‏— نفس احمدؐ کے جگر ہیں کہ نہیں؟ بولا ہیں
وارث خیر بشر ہیں کہ نہیں؟ بولا ہیں ‏— نیک دل پاک نظر ہیں کہ نہیں؟ بولا ہیں

تیرے حاکم میں یہ اوصاف ہیں بولا کہ نہیں
پر جس سے قلب و نظر صاف ہیں بولا کہ نہیں

اس نے روزہ کوئی چھوڑا ہے؟ یہ بولا کہ نہیں ‏— منہ کبھی سجدے سے موڑا ہے؟ یہ بولا کہ نہیں
دل کسی شخص کا توڑا ہے؟ یہ بولا کہ نہیں ‏— خون حرمت کا نچوڑا ہے؟ یہ بولا کہ نہیں

تیرے حاکم میں ہیں یہ عیب کہا بیشک ہیں
اور بھی ہیں عیب لاریب؟ کہا بیشک ہیں

---

[1] اسی موقع کے لئے اقبال نے کہا ہے "نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں"

شہ میں ہے کوئی برائی؟ یہ پکارا کہ نہیں حرمت شرع گنوائی؟ یہ پکارا کہ نہیں
دین پر ضرب لگائی؟ یہ پکارا کہ نہیں ظلم کی تیغ اٹھائی؟ یہ پکارا کہ نہیں
تیرے عالم میں یہ باتیں ہیں؟ کہا اس نے کہ ہیں
اور کچھ ایسی ہی گھاتیں ہیں؟ کہا اس نے کہ ہیں

شہ گناہوں میں گرفتار ہیں؟ بولا کہ نہیں ترک واجب کے خطاوار ہیں؟ بولا کہ نہیں
بدعقیدت میں زبوں کار ہیں؟ بولا کہ نہیں بنتِ آدم کے گنہگار ہیں؟ بولا کہ نہیں
تیرا عالم بھی ہے زد میں کہ نہیں؟ بولا ہے
ہے وہ سود و زیاں کی حد میں کہ نہیں؟ بولا ہے

شہ کے ایماں میں خلل ہے؟ یہ پکارا کہ نہیں نیتِ خیر میں بل ہے؟ یہ پکارا کہ نہیں
بزم میں مکر و دغل ہے؟ یہ پکارا کہ نہیں بے گنہگروں کا عمل ہے؟ یہ پکارا کہ نہیں
تیرے عالم میں یہ سب ہے کہ نہیں؟ بولا ہاں
پھر ترے دستِ غضب ہے کہ نہیں؟ بولا ہاں

آدمیت

محمد کا راہِ حق میں پہلا قدم اتنا ہی اہم تھا جتنا ARMSTRONG کا چاند پر پہلا قدم۔ ARMSTRONG کا عمل تسخیرِ ماہ کی روشن دلیل تھا اور محمد کا اقدام ارتقائے انسانیت کی آخری منزل جسے اقلیم آدمیت کی تسخیر بھی کہا جا سکتا ہے۔ جو سخت دشوار عمل ہے۔ اتنا دشوار کہ بقول غالب آدمی کو انسان ہونا میسر نہیں ہے۔ حالی نے اس مضمون کو بہت سادگی اور پرکاری سے بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

فرشتے سے بڑھ کر ہے انسان بننا مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

کسی نے آدمیت کے اجزائے ترکیبی — دردِ دل، پاسِ وفا، اور جذبۂ ایمان — کو بتایا۔ مگر نسیم نے اس کو فلسفیانہ رنگ میں یوں پیش کیا ہے:

زیور شاہد اسلام ہے انساں ہونا — عمل خیر کا انجام ہے انساں ہونا
کارناموں سے بڑا کام ہے انساں ہونا — دین کا حاصل پیغام ہے انساں ہونا

رنگ آدم کا نسب میں ہے نہ بو آدم کی
ابن آدم ہے وہی جس میں ہو خو آدم کی

— مشاہیر شعراء میں بعض عشق کو اساس سمجھتے ہیں اور بعض عقل کو، نسیم امروہوی کا نظریہ ہے کہ یہ دونوں تنہا اساس بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے:

آدمی وہ نہیں در اصل جو ہو آدم زاد — عقل اور عشق ہیں انساں کی اساس و بنیاد
عقل سے پائے بشر معرفت حق کی مراد — عشق سے ذوق عبادت، خلش حق عباد

عقل سے فرق حقیقی و مجازی سیکھے
عشق سے بندگی و بندہ نوازی سیکھے

عقل کے پاؤں سے طے کرکے دو عالم کے طبق — عشق کے ہاتھ سے تحریر کرے دل کا ورق
عقل کی آنکھ سے کرتا ہو نظارۂ حق — عشق کے کان سے رہ رہ کے سنے غم کا سبق

عقل سے ملک طلب فتح کرے، مرد بنے
عشق کے فیض سے فیاض ہو، ہمدرد بنے

عقل کے نور سے ہر سود و زیاں پر ہو نظر — عشق اس سود و زیاں سے ہو بہت بالاتر
عقل تجدید و تجدد کی بنے راہ گزر — عشق قائم رہے ہر حال میں اک حالت پر

عقل ہو فکر بشر، فکر کی بنیاد ہو عشق
عقل حالات کی پابند ہو، آزاد ہو عشق

عقل ہو حکمت و تدبیر و تدبر کا ورق — عشق تلقین عقیدت کا دل افروز سبق
عقل جذبات میں ناحق کو نہ ٹھہرائے حق — عشق وجدان حقائق کا ہو ذوق مطلق

عقل کو جادۂ ہستی میں پس و پیش نہ ہو
عشق ہو مصلح کل، مصلحت اندیش نہ ہو

عقل ہو فاتحِ ابوابِ رموزِ قدرت — عشق ہر باب سے ہو داخلِ قصرِ عظمت
عقل ہو دل کی گرہ، عقل ہو دل کی بہجت — عقل ہو سعی و طلب، عشق خمیرِ فطرت

عقل کو نور ملے عشق کی تنویروں سے
عقل اقدار سے واقف ہو یہ تقدیروں سے

عقل بن جائے مزاج اور ہو عشق آب و گل — وہ تفکر یہ تاثر وہ دماغ اور یہ دل
عقل دل کی حرکت، عشق اسی کا حاصل — عقل ہو راہ نما، عشق حصولِ منزل

عقل ادراک ہو احساس کی طغیانی کا
عشق احساس ہو کیفیتِ روحانی کا

نہ فقط عقل کی اینٹیں ہوں بنائے مسکن — نہ فقط عشق کے غنچے ہوں بہارِ گلشن
جامہ زیبِ تنِ فطرت ہے وہی پیراہن — عقل اور عشق ہم جس کے ہوں چولی دامن

رشتۂ عزم سے ہر بند بندھے یوں کس کے
نہ تو دامن ہی لٹک جائے نہ چولی مسکے

عقل جلوت بنظرِ عشق ہو خلوت بکنار — عقل ہو عین نظر عشق نگاہ سرشار
عقل قافلۂ عشق کے جادے کا غبار — ناقۂ عشق کی ہو عقل کے ہاتھوں میں مہار

عشق بتلائے خطِ عقل کی پرکار ہے کون
عقل تجویز کرے عشق کا معمار ہے کون

عقل مخلوق سے تا ہستیِ خالق ہو رسا — عشق خالق سے ہو مخلوق کے دل میں القا
عقل فرمائے سب اس کے ہیں جو رب ہے سب کا — عشق کی سب پہ عنایت ہو بنامِ مولا

دہر ہے آبِ رواں، جو بھی پیے پینے دو
ہے یہی رازِ بقا، دوسروں کو جینے دو

اس "دوسروں کو جینے دو" کے فقرے میں مطالب کی جو گہرائی اور گیرائی ہے وہ بہت

فکر انگیز ہے اور توسنِ خیال کے لئے مہمیز:

سب کو دیتا ہے وہ روزی وہ بھلا چھوڑے کیسے — پیٹ بھرنے کے لئے پیٹ میں بھونکو نہ چھرے
ذکر و تلخ کلامی سے ارے اور ترے — نیک و بد سب ہیں یہاں ایک ہی گاڑی کے دھرے

اپنی اولاد کو جب رزق مقرر بخشے
شربت و شیر کا قاتل کو بھی ساغر بخشے

جس میں اس زاویہ فکر سے ہو خوئے کرم — بس وہی وارثِ آدم ہے نہ تم اور نہ ہم
وہی انساں ہے وہ انساں ملک جس کے خدم — ہے مثال اس کی اگر بزم کم و کیف میں کم

صور ہو جس کا نفس حشر اٹھانے کے لئے
اُبھر جائے جو مردوں کو جلانے کے لئے

سب کی قیمت وہ اسی ایک نظر سے آنکے — نوکِ مژگاں سے بھرے زخم میں سب کے ٹانکے
غیر کی دولت و نعمت کو نہ تک کے جھانکے — زر لٹاتا ہے اور آپ بھنے جو پھانکے

خوں میں گرمی کی جگہ سوز ہو پروانوں کا
دل میں نقطے کے عوض درد ہو انسانوں کا

شوکت و حشمت و جاہ و حشم و دولت و مال — فرق و جان و جسد و مسکن و ناموس و عیال
بہرِ بہبودِ بشر اس کا ہو سب کچھ پامال — تنگ غم سے نہ پڑے آئینۂ قلب میں بال

نفس سے لڑ کے جو یوں دہر پہ چھا جاتا ہے
ایسے انسان کو انسان کہا جاتا ہے

راہ پر خار ہے انسان کا انساں ہونا — تیغ کی دھار ہے انسان کا انساں ہونا
سخت دشوار ہے انسان کا انساں ہونا — رسن و دار ہے انسان کا انساں ہونا

کس میں ہمت ہے کہ یوں خلق کی خاطر مرے
سرِ نیزہ ہو اور انساں کا سر اونچا کرے

یہ نبی نوح کی امداد کا جذبہ یہ عطا ابن زہرا کا مقدر ہے بہ توفیق خدا

٭

حق العباد اس چہرے میں دوسروں کے حقوق کو اپنے نفس پر ترجیح دینے کی تلقین کی گئی ہے۔ آج دنیا کے انسان بعد خرابی بسیار آخر کار اس فلسفے کی افادیت کے قائل ہو کر ہی رہے۔ یہ حقوق العباد کی منزل ہے جو اللہ کی عبادت پر بھی ترجیح رکھتی ہے بلکہ اصل عبادت یہی ہے۔ نسیم کہتے ہیں ؎

نماز و روزہ و حج و زکواۃ و خمس و جہاد تمہیں جو رہ گئے دیکھے یہ چھ فریضے یاد
غضب کی جا ہے کہ بھولے نبی کا یہ ارشاد کہ ہے عبادت حق بعد پہلے حق عباد
ہر ایک طاعت خالق کی ہے قضا ممکن
یہ فرض ہو جو قضا پھر ادا ہے ناممکن

خدائے عز و جل جو کہ ہے رحیم و غفور جو لاکھ جرم بھی ہوں گے تو بخش دیگا ضرور
مگر کیا ہے اگر بندگان حق کا قصور تو پھر ہے اس کی عدالت سے رحم کوسوں دور
نجات ایسے گناہوں سے زینہار نہیں
قسم خدا کی خدا کو بھی اختیار نہیں

٭

فلسفہ غم انسانیت کا تقاضا ہے کہ تمام "بندگانِ حق" کا احترام کیا جائے اور اسی جذبہ "احترام آدمی" کی آغوش میں ایثار و کرم، جود و سخا، لطف و عطا کی پاکیزہ صفات پرورش پاتی ہیں۔ ان صفات کے پیدا ہو جانے سے دل میں جو حرارت پیدا ہوتی ہے، وہ اس کی ہستی کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ اور اس خاکستر سے ایک درد بھرا دل پیدا ہوتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں ؎

ابر رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یارب جل گیا مزرع ہستی تو اگا دانۂ دل

— اس درد بھرے دل کا خمیر غم و الم سے ہوتا ہے۔ وہ خود دکھ سہتا ہے مگر عالم کو سکھ عطا کرتا ہے۔ اس درد کی تمنا ہر اہلِ دل نے کی ہے۔ عطاؔر ارشاد فرماتے ہیں ؎

کفر کافر را و دیں دیندار را ۔۔۔ ذرہ دردے دلِ عطاؔر را

— نسیم اس درد و غم کے متعلق یوں سخن سرا ہیں ؎

ہے مشیت کا عطیہ خلشِ نشترِ غم ۔۔۔ چشمِ ظاہر میں ستم، دیدۂ باطن میں کرم
جوششِ عشق و طرب ہے کوئی لمحہ کوئی دم ۔۔۔ غم رفیقِ دل و جاں ہے ابدیت کی قسم
بحرِ آفات کا جاں بخش کنارا ہے یہی
ڈوبنے کے لئے تنکے کا سہارا ہے یہی

غم ہر اک حال سے رازِ بشریت کا امیں ۔۔۔ غمِ جاناں، غمِ انساں، غمِ دنیا، غمِ دیں
تپشِ دل سے جو خالی کوئی ذی روح کہیں ۔۔۔ ہاں وہی غم سے تہی ہے جسے احساس نہیں
لاکھ بے حس ہو کوئی اس پہ بھی غم طاری ہے
انتہا یہ ہے کہ پتھر میں بھی چنگاری ہے

غم کی تحریک سے گو روحِ عمل ہے توام ۔۔۔ پھر بھی ہر غم سے نہیں گیسوئے فطرت برہم
مر مٹے راہِ خدا میں جو شہیدانِ ستم ۔۔۔ غیر فانی ہے جو ماتم تو انہیں کا ماتم
پائداری کی کوئی حد ہے نہ اندازہ ہے
آج تیرہ سو برس بعد یہ غم تازہ ہے

— دنیا کے ہر غم سے وہ غم بہتر ہے جو کسی اصول کے تحت مر مٹنے والے کی یاد سے پیدا ہو، جس نے اپنے خون سے انسانیت کو آبِ حیات عطا کیا، جس نے اپنے جلتے ہوئے گھر کی آگ کے شعلوں سے تیرہ بخت انسانیت کی ظلمتوں میں روشنی کی شعاعیں پھیلا دیں۔ جس نے حمایتِ حق اور ابطالِ باطل کی جد و جہد قائم رکھنے کے لئے انسانیت کی راہوں میں اپنے آنسوؤں کے چراغ جلا کر اجالا کیا اور یہ سبق دیا کہ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے:

اُن دلیروں کا ہے غم دین کی شوکت کے لئے ۔۔۔ لڑ گئے موت سے جو حق کی حمایت کے لئے
صرف بخشش کے لئے ہے نہ شفاعت کے لئے ۔۔۔ یہ تمدن کا سبق ہے بشریت کے لئے

اسی غم نے تو محبت کی ترازو بخشی
اسی ماتم نے ہمیں قوت بازو بخشی

غم سے ہم کو وہ ملا ولولۂ خودداری ۔۔۔ موت ہے جس کے سبب اپنی نظر میں پیاری
بس اسی غم میں دلوں پہ ہے یہ جذبہ طاری ۔۔۔ سر تسلیم ہے خم۔ جو بھی رضائے باری

رونے والے غم شبیر میں جی کھول کے رو
دل کو میزان محبت میں مگر تول کے رو

انیس کے دور میں گریہ و بکا کا فلسفہ یہ تھا ؎

آنسو ہی وسیلہ ہے شفاعت کا ہماری

— لیکن دور جدید کے تقاضوں نے نسیم سے رونے کی جو توجیہات پیش کرائیں وہ مدلل اور مبرہن ہیں۔ بکا۔ ابکا اور تباکی تفسیر ایک جگہ بند در بند دوں میں کی گئی ہے جن کو یہاں بہ خوف طوالت نقل نہیں کیا جاتا۔ اس میں دلائل و براہین کی مضبوطی اور استواری فکر انسان کے لئے غذائے روحانی مہیا کرتی ہے۔ اس کے بعد بھی اس مرثیہ میں عزاداری کی حمایت میں دلائل پیش کئے گئے ہیں، اور نہ صرف معقول سے بلکہ منقول سے بھی اپنے دعووں کو قوت بخشی ہے۔ شامی سیوطی بخاری، ترمذی، دیلمی اور حاکم جیسے عظیم مفکروں کے افکار سے کلام کو زینت دی ہے۔ "مدارج" اور "جامع" کی اسناد سے دلیلوں کو قوی کیا ہے۔ اسی قسم کے مسائل علم کلام اور منطق و فلسفہ سے اپنے اس مرثیہ میں بھی بڑا کام لیا ہے جو جناب ابو طالب کے ایمان کی بحث پر مشتمل ہے۔ اس حسن استدلال کے لئے ہم مولانا منتخب الحق کی رائے نقل کرنے پر مجبور ہیں وہ فرماتے ہیں:

"دلائل کے استقصار میں حتی الامکان کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے، برہان خلف

اور طرد و عکس کے منطقی استدلال سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ آیات قرآنی کی اشاری، اقتضائی اور التزامی دلالتوں سے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ جا بجا قیاس استثنائی سے بھی خدمت لی ہے جس میں رفع ملزوم سے رفع لازم پر اور رفع لازم سے رفع ملزوم پر استدلال کیا جاتا ہے۔"

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے جدید مرثیوں میں ذکر فضائل کو بہ مقابلہ ذکر مصائب کے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ نسیم نے بھی اپنے متعدد مرثیوں میں فضائل کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مثلاً:

۱۔	"مسند نشین بزم طہارت ہیں فاطمہ" جناب فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا کے فضائل	۱۲ بند
۲۔	"نے کلک تو مصور معجز نگار ہے" میں جناب سید الشہدا کے فضائل	۱۳ بند
۳۔	"خلق میں بندہ معبود نما ہیں احمد" میں جناب رسالتمآب کے فضائل	۱۲ بند
۴۔	"قید میں یوسف زہرا کا تھا خواہاں بھی" میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے فضائل	۳۵ بند
۵۔	"نبی کا دین ہے اک امتحاں فکر و نظر" " " " "	۸۴ بند
۶۔	"تا ملک مسند تطہیر امامت ہیں علی" میں امیر المومنین کے فضائل	۴۲ بند

—ان میں سے موخر الذکر مرثیہ میں جہاں جناب امیر کے فضائل و محامد کو بیان کیا گیا ہے، ۱۴ حدیثوں اور ۱۲ آیات قرآنی سے اپنے کلام کو زینت دی ہے۔ جیسا وہ خود اس مرثیہ کے مقطع میں فرماتے ہیں ؎

مرثیہ ختم ہے کر شکر نسیم خوش ذات
اب رقم کر سن تصنیف کہ ہو شمع حیات

امتحاں کا الف اٹھ کر یہ پکارا حق بات
ایک سو چودہ احادیث اور اکیس آیات

۱۹۳۰ = ۱ - ۱۹۳۱

بات کی بات بھی تاریخ کی تاریخ بھی ہے
دل حاسد کے لئے خنجر مریخ بھی ہے

نسیم نے نہ صرف آیات قرآنی اور احادیث نبوی کو نظم کرنے کی سعادت حاصل کی ہے
بلکہ اقوال آئمہ معصومین سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ایک مرثیہ میں جس کا مطلع ہے ع نبی کا دین ہے
اک امتحان فکر و نظر۔ جو ایک سال پہلے کی تصنیف ہے انہوں نے ان اقوال کی ہیئت کا ذکر
اس طرح کیا ہے ؎

کلام غیب جو آیا وہ مصطفےٰ نے کہا — جو مصطفےٰ نے بتایا وہ مرتضےٰ نے کہا
جو مرتضےٰ نے سنایا وہ مجتبےٰ نے کہا — جو مجتبےٰ نے کہا شاہ کربلا نے کہا

عجیب شان سے یہ معرفت کی شاخیں ہیں
مآل ایک ہے، بدلی ہوئی زبانیں ہیں

جو ان زبانوں پہ آیا وہ آیت و تفسیر — جو ان کی فکر سے باہر رہ خار دامن گیر
سخن میں ان کے ہے لطف کلام رب قدیر — جو بات ان کی سلونی، تو پر نمک تقریر

رہی زباں جو گلریز سر زمانے میں
عمل کے پھول کھلے علم کے گھرانے میں

حکومتوں نے کبھی کی اگر زباں بندی — ہجوم غم میں زباں روک لی بہ خرسندی
مگر کشش نہ ہدایت کی آرزومندی — معین کار ہوئی قدرت خداوندی

دعا کی شکل میں تبلیغ و رہنمائی کی
خدا کے ذکر میں بندوں کی ناخدائی کی

اسی عمل کا نمونہ ہے سیرت سجاد — دعا میں رشد و ہدایت طریقت سجاد

— اس کے بعد امام مظلوم کے مصائب اور ان کی شجاعت اور اخلاق جرأت کا بیان
بہت جاذب توجہ ہے اور حقیقتوں پر مبنی ہے۔ پھر آگے فرماتے ہیں ؎

اٹھائی تیغ نہ پہنی زرہ نہ خون بہا — مگر دعا سے جو ملتا ملا بغیر دغا
خطاب و عظ و خطابت کا جو نکلوں نہ تھا — دعا کی شکل میں بتلائی ہر مرض کی دوا

اندھیری رات میں لوگ ان سے ذکر رب سنتے
بلند ہوتی تھی آواز جس کو سب سنتے

— یہ دعائیں اپنے اندر ایک دنیائے ہدایت لئے ہوئے ہیں۔ جہاں عبادت میں خلوص خضوع وخشوع کی تاکید ملتی ہے اور توحید رسالت، حیات ابعد، حسن عمل وغیرہ مسائل حل کئے گئے ہیں، وہاں تنظیم معاشرہ کے لئے جو رہنما اصول بتائے گئے ہیں وہ بہت قابل قدر ہیں۔ ان امور میں دفاع، سیاست ملک، سیاست بین الملکی، معاہدات صلح وجنگ، معاشیات، بجٹ، اتحاد، تنظیم، اور یقین بھی شامل ہیں۔ گویا صحیفہ کاملہ ایک مکمل دستور حیات بھی ہے یہ سب کچھ اس مرثیے میں نہایت دلنشیں انداز سے نظم کیا گیا ہے۔

نسیم سے پہلے اس موضوع پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا، یہ ان کی جدت پسندی کا تازہ ترین شاہکار ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ مرثیوں میں وہ دیگر ائمہ کے اقوال زریں کو بھی انسانیت کے سامنے پیش کر کے ان کی اہمیت کا احساس دلائیں گے۔

دلائل کو منطق وفلسفہ کے اصول پر قائم کرنے اور پھر آیات قرآنی اور حدیث سرکار دو عالم سے مدد لے کر تقویت دینے کا میلان نسیم کے مزاج کی راستی، حقیقت پسندی، حق جوئی اور حق گوئی کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بقول ان کے "واقعات میں اپنی طرف سے کل پھندنے لگا کر تحریف کرنے" سے انھیں احتراز رہا، اور جہاں تک ممکن ہوا کمزور اور ضعیف روایتوں کو نظم نہ کیا۔ وہ خود حضرت قاسم کے حال کے مرثیے میں لکھتے ہیں۔

سنیے وغائے قاسم ذی جاہ وگلبدن	کرنا نہیں ہے ذکر عروسی دم محن
اس رنگ میں نیا ہے یہ افسانہ کہن	جس میں ہوں دو فریق وہ زیبا نہیں سخن

اہل نظر کو شک ہے عروسی کے باب میں
ہم کیوں لکھیں ضعیف روایت شباب میں

ے نسیم صاحب نے اس مرثیے کے بعد سال گزشتہ کے مرثیے میں امام محمد باقر علیہ السلام کی حیات علمی پر اسی انداز سے روشنی ڈالی ہے۔

لیکن وہ اس پر سختی سے کاربند نہیں ورنہ حضرت مسلم کے حال کے مرثیہ میں ان کے صغیر سن صاحبزادوں کی شہادت بیان نہ کی جاتی۔

اجتماعی طور پر قوم کو بیدار کرنا۔ رجائیت جیسا کہ ابتدا میں کہا جا چکا ہے۔ مرثیہ نے ابتدائی دور میں بالخصوص اودھ کی فضا میں اجتماعی طور پر قوم کے شعور کو بیدار کیا اور آزادی کی تڑپ دیکر ان کو رزمیہ کے بیان کی تاثیر سے آمادہ جہاد کیا۔ اس نئے دور میں جب کہ زبانوں پر آمرانہ دور کے پڑے ہوئے تالے ٹوٹ چکے ہیں اور آزادی تقریر و تحریر کا دور دورہ ہے۔ نسیم نے اپنے بہت سے مراثی میں ملت کو ابھارنے کا فرض انجام دیا ہے۔ ۱۹۶۹ء کے مصنفہ مرثیہ میں ان کی لے بہت تیز ہے، اس مرثیہ کا مطلع ہے: ع عہد رفتہ کی طرح گو تشنہ اب ہم نہیں۔ اس پورے مرثیہ میں قوم کو ابھارنے اور آمادہ عمل کرنے میں ان کی نوا تلخ تر ہوتی گئی ہے، اس مرثیہ کے بعض بند تو ایسے ہیں کہ جو تحسین و تعریف سے مستغنی ہیں:

دے رہی ہے اک صدائے عام تنظیم حیات　　ہاں کمر بستہ ہیں اہل ہمت فاتحان کائنات
ہو رہا ہے امتحاں جرأت و عزم و ثبات　　مل رہی ہے تا بہ حد جستجو غم سے نجات
لیلیٰ مقصد اسی نسبت سے ہم آغوش ہے
جس قدر بازو میں طاقت دل میں جتنا جوش ہے

کروٹیں لیتی ہے ذہنوں میں ترقی کی امنگ　　منزل تقدیر میں تدبیر کا جمتا ہے رنگ
کیا حیات آموز ہے صہبائے جرأت کی ترنگ　　ضرب سے نبض عمل کی بج رہا ہے طبل جنگ
زور و زر اس عزم کو مغلوب کر سکتے نہیں
قوم کے جذبات دب سکتے ہیں مر سکتے نہیں

قوم بھی وہ قوم جو تیغوں کے سایہ میں پلی   سرکٹانا جس کا ادنیٰ کھیل ایسی منچلی
جس کا خوں تاریخ جانبازی کا عنوان جلی   رزم گاہ دہر میں نعرہ ہے جس کا یا علی
زندگی جس کی شجاعت جس کا میداں کربلا
تن مدینہ، سر نجف، دل سامرہ، جاں کربلا

مرد جس کے بندگان آستان بوتراب   عورتیں جس کی کنیز زینب عصمت مآب
جس کے بچوں میں علی اصغر کا عزم کامیاب   نوجوانوں کو عمل آموز اکبر کا شباب
وقت مشکل جس کے بوڑھوں تک کے سینے تن گئے
جب کہ رسول حبیب ابن مظاہر بن گئے

حکمت و تدبیر سے لبریز ہیں جس کے دماغ   گلشن تہذیب ہے پھولوں سے جن کے باغ باغ
آسمان زندگی کا چاند جس کے دل کے داغ   جن کے خون گرم سے روشن ہیں دانش کے چراغ
جس کی شمع علم سے دل جلوہ گاہ طور ہے
بزم حق میں تا قیامت جس کا قائم نور ہے

تخت شاہی مقصد تخلیق ہے جس کا نہ تاج   مختلف دنیا سے ہے جس کی سیاست کا مزاج
مضطرب ہے روح جس کی قتل و خونریزی سے آج   جس کے ذمہ ہے زمانہ بھر کا روحانی علاج
یہ کفن در زندان عالم کیا سنواریں گے اسے
اس کے جوہر خود جلا دے کر نکھاریں گے اسے

جن نفوس پاک کی الفت کی یہ ہے مدعی   فرض ہے اس پر تولا کے سوا کچھ اور بھی
یہ ہے اک مانا ہوا محکم اصول زندگی   دوست کی مرضی پہ چلنا ہے شعار دوستی
عشق صادق ذوق تسلیم و رضا کا نام ہے
یہ نہ ہو تو دوستی ناکام الفت خام ہے

میں نے مانا یہ عزیمت یہ شکوہ آہیں — چند ہی ذاتوں کا ہے پس منظر عین الیقین
لیکن اس کی گرد کو پانا تو مشکل تر نہیں — اٹھ کر کس لے بدل تیور چڑھالے آستین

الفت شبیر کا رشتہ عمل سے جوڑ دے
پسلیوں سے پھر تو گے چاہے تو جہاں توڑ دے

— اس آخری مصرعہ پر اقبال کا وہ مصرع یاد آ گیا ع مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
ان تمام بندوں میں اقبال کا آہنگ جاری وساری ہے۔ وہی تیور وہی انداز وہی جوش
بیان۔ بلکہ بعض جگہ وہی الفاظ مثلاً "کفن زد" غرض اس رنگ میں نسیم اس قدر کامیاب
ہیں کہ انہیں اگر اقبال ثانی کہا جائے تو بجا ہے۔

اتحاد کی تلقین۔

اتحاد کی برکتوں کا ذکر اس انداز سے کیا ہے۔ ؎

جو دین حق کے معاون ہیں وہ رہیں دلشاد — جو اتحاد کے دشمن ہیں جلد ہوں برباد
بھلا یہ سمجھیں گے کیونکر عمل صلح و جہاد — سیاست علوی کا سبق نہیں جب یاد

مٹا رہے ہیں یہ ملت کو جنگ کر کر کے
علی نے جس کی بچائی تھی جان مر مر کے

کہے یہ کون عدو گھات میں ہے نادانو — یہ جنگ چھوڑ دو آپس کی اب کہا مانو
لڑا رہے ہیں جو موذی تم ان کو پہچانو — ان آستین کے سانپوں کو دوست کیوں جانو

ارے جنھوں نے تمہیں بے چھری حلال کیا
انھیں کے دم میں تم آ گئے کمال کیا

بھرا ہے درس اخوت سے خود کلام مجید — عمل سے کر گئے اصحاب و آل بھی تائید
بھلا بتاؤ کہ پھر آپس میں کیوں ہے جنگ شدید — ہوئی جو تم میں دوئی چھوٹ گئی توحید

لڑو فریب پہ ناحق نہ مصطفےٰ کے لئے
اصول دین کی حفاظت کرو خدا کے لئے

پھرے ہیں حق سے جو کچھ دین پاک کے بدخواہ — لڑاتے رہتے ہیں ملت کو یہ معاذ اللہ
بہ حب مصلحت خود یہ حرص دولت و جاہ — بنے ہیں سنگ رہ اتحاد یہ گمراہ

فساد سے جو ملا ہیں جو نام پاتے ہیں
شگوفہ چھوڑ کے پھولے نہیں سماتے ہیں

سطور بالا میں ہم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نسیم نے اپنے جدید طرز کے مرثیوں میں دور حاضر کے تمام مسائل پر اظہار خیال کر دیا ہے افراد قوم کے لئے انفرادی طور سے اصلاح اخلاق پر اور اجتماعی طور سے پورے سماج کی برائیوں اور کوتاہیوں پر بھی نظر ڈال۔ اور اپنے مفید مشوروں اور مضبوط دلائل سے عقائد و اعمال کی اصلاح کی۔

سب سے آخر میں ہم ایک اور سماجی برائی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور وہ ہے اس قوم میں شادی بیاہ کے موقعوں پر اسراف بیجا کی لعنت، جس سے امیر و غریب اور غریب مقروض ہو جاتے ہیں اور نظام معیشت پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ اور بہت سے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔ نسیم کہتے ہیں ؎

وہ ذی خرد جو دکھاتے ہیں راہ آزادی — خلاف عقل ہوئے ہیں رسوم کے عادی
اگر عنایت حق سے کسی کی ہو شادی — تو گھر لٹاتے ہیں بر وقت خانہ آبادی

ادا رسوم جہالت تمام کرتے ہیں
خدا کے حکم میں شامل حرام کرتے ہیں

اگر پسر کی ہے شادی بہ فضل ربانی — ضیافتوں میں یہ کرتے ہیں اپنی قربانی
خوشی کے جوش میں ہوتی ہے ایسی بیہمانی — کہ جس کے بعد نہ کنبہ کو مل سکے پانی

تباہ ہو کے بھی برباد کن عمل نہ گئے
اگرچہ جل گئیں رسمیں تمام، بل نہ گئے

وہ عروسیِ دختر ہے بخت کا رونا — وہ قرض لے کے مہیا جہیز کا ہونا
وہ ایک گھر کے بسانے کو ایک گھر کھونا — حرام وہ زر و زیور کی فکر میں سونا

یہ خودکشی ہے سراسر ادائے فرض نہیں
متاعِ زیست کو گھن لگ گیا ہے قرض نہیں

مقامِ غور ہے، اے امتِ حبیبِ خدا — جہیزِ بنتِ رسولؐ حجاز تھا کتنا
پیالہ، پوشش و مشکیزہ آسیا و ردا — یہ پانچ چیزیں تھیں اور ایک دولتِ عقبیٰ

نہ مال و زر تھا نہ سامان زیب و زینت کا
حیا کا پہنے تھیں زیور لباس عصمت کا

ہم ان کے شیوۂ صبر و رضا کو بھول گئے — رسومِ بد میں پھنسے ارتقا کو بھول گئے
قدیم وضع کے بندے خدا کو بھول گئے — جدید رنگ کے رشید احیا کو بھول گئے

برائے نام جو وہ روزہ و شب نماز میں ہیں
یہ بے حجاب ہمیشہ سرود و ساز میں ہیں

نسیم امروہوی کا طریقۂ اصلاح

اور

شاگردوں سے حُسنِ سلوک

ساحر لکھنوی

(نبیرہ جناب فاخر اجتہادی لکھنوی اعلی اللہ مقامہ)

گذشتہ شعبان کی ایک شام تھی چار یا پانچ بجے کا وقت تھا موسم خوشگوار تھا مگر میں موسم کی کیفیتوں سے بے نیاز امید و بیم کی کشمکش میں مبتلا تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا استاد محترم حضرت نسیم امروہوی مدظلہ العالی کے دولت خانے کی جانب بڑھتا جا رہا تھا اور دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ وہ اس وقت گھر پہ تشریف رکھتے ہوں اور زیادہ مصروف نہ ہوں۔

بات یہ تھی کہ اس شب کو حسن کالونی میں حضرت ابوالفضل العباس کی مدح میں ایک طرحی محفل میلاد تھی۔ میں بھی مدعو تھا۔ طرح کا مصرعہ آٹھ دس روز پہلے ہی مل گیا تھا۔ مگر میری کچھ عجیب سی عادت ہے کہ سارا وقت گذار کر اس وقت شعر کہنے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جب یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب وقت بالکل نہیں رہا اور کہے بغیر مفر نہیں۔ چنانچہ ہمیشہ عین دن کے دن اور بسا اوقات محفل کے وقت سے صرف گھنٹے دو گھنٹے پہلے اشعار لیکر استاد محترم کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں تاکہ بنظر اصلاح دیکھ لیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کبھی کبھی خود میرے لئے بھی بڑی پریشان کن صورتحال پیدا ہو جاتی ہے لیکن

جو زحمت اس طرح انھیں ہوتی ہے وہ خاص طور سے قابل لحاظ ہے۔

حسن کالونی کی اس محفل کے لئے بھی حسب عادت میں نے محفل کے وقت سے چند گھنٹے پہلے منقبت مکمل کی اور استاد محترم کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے روانہ ہوا اور دولت خانے پر پہنچ کر دق الباب کیا۔ برادرم قسیم امروہوی برآمد ہوئے۔ ان سے معلوم ہوا کہ حضرت نسیم امروہوی ایک ناگزیر تقریب میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے ہیں اور شاید گھنٹے دو گھنٹے میں واپس ہوں گے۔ یعنی وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ بہرحال خود کردہ را علاجے نیست چار ناچار ان کا انتظار کرنا پڑا۔ اس رات حسن کالونی کے علاوہ ایک محفل میلاد فیڈرل ایریا میں بھی تھی جس کے لیے ایک نامعلوم کرم فرمانے ٹیلیفون کرکے بڑے اصرار کے ساتھ مدعو کیا تھا۔

تقریباً چھ بجے شام تک انتظار کرنے کے بعد میں برادرم قسیم صاحب سے ایک گھنٹے کی اجازت لیکر سمن آباد چلا گیا جہاں میری بڑی ہمشیرہ رہتی ہیں۔ وہاں نماز پڑھی اور کچھ دیر ٹھہر کر سات بجے واپس آگیا۔ یقین تھا کہ استاد محترم واپس تشریف لائے ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ خیال آیا کہ پہلے فیڈرل ایریا کی محفل میں شرکت کر آؤں مگر یہ سوچ کر کہ نہ جانے وہاں کتنی دیر لگ جائے اور رات زیادہ گذرنے کی وجہ سے استاد محترم کو اصلاح کی زحمت دینا مناسب نہ رہے، میں نے یہ فیصلہ کیا کہ حسن کالونی جاتے ہوئے پہلے فیڈرل ایریا کی محفل میں شرکت کرلوں گا۔ چنانچہ پھر انتظار کرنے لگا۔ خود برادرم قسیم صاحب نے بھی اس محفل کے لیے کہے ہوئے اپنے اشعار اس وقت تک اپنے والد بزرگوار کو نہیں دکھلائے تھے اور وہ بھی ان کے منتظر تھے۔ اسی انتظار میں سات سے آٹھ، آٹھ سے نو اور پھر دس بجے مگر حضرت نسیم امروہوی تشریف نہیں لائے۔ اب مجھے پریشانی شروع ہوئی۔

میں استاد محترم کو اشعار دکھلائے بغیر نہیں پڑھتا ہوں۔ اس کے دو سبب

ہیں۔ ایک تو خود اعتمادی کی کمی۔ دوسرے یہ کہ بعض حضرات اس فکر میں رہتے ہیں کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر میرے کلام میں خامیاں نکالیں اور اعتراض کریں۔ مقصد یہ نہیں ہوتا کہ مجھ پر اعتراض ہو بلکہ میرے توسط سے استاد محترم پر اعتراضات کیے جائیں۔ چنانچہ اگر میں کوئی غلطی کروں تو باوجود اس کے کہ میں نے اشعار استاد محترم کو نہ دکھائے ہوں، اعتراض انھیں پر وارد کیا جائے گا۔ اس صورت حال کے پیش نظر میں حسن کاکوروی کی محفل میں، اشعار پر اصلاح لیے بغیر شریک ہونا نہیں چاہتا تھا۔ ادھر رات گذرتی جا رہی تھی، پریشانی بڑھتی جا رہی تھی کہ اور کچھ دیر ہوئی تو نہ محفل میں جا سکوں گا نہ گھر جانا ہی آسان رہے گا۔ اس لیے کہ رات زیادہ گذر جاتی ہے تو میرے علاقے کے لیے سواری نہیں ملتی۔ پھر سب سے زیادہ فکر یہ تھی کہ اتنی رات کو جب وہ واپس تشریف لائیں گے تو ظاہر ہے کہ ان کو زحمت دینا مناسب نہیں۔ اب کرتا تو کیا کرتا۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ اسی ادھیڑ بن میں رات کے گیارہ بج گئے۔

اب جوں جوں وقت گذرتا جا رہا تھا نا امیدی بڑھتی جا رہی تھی۔ دل کو ایک عجیب سی بے چینی اور طبیعت کو ایک پریشان کن اضطراب لاحق تھا۔ میں اٹھا اور مکان کا بیرونی دروازہ کھول کر گلی میں جھانکا لیکن وہاں سناٹا تھا۔ واپس آکر پھر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں کسی گاڑی کے گذرنے کی آواز آئی۔ لپک کر باہر آیا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ پھر کسی کی آواز سنائی دی۔ مگر میرے شاید کان بج رہے تھے۔ پھر اٹھ کر گلی میں آیا اور بے چینی کے عالم میں گلی پار کر کے سڑک تک آگیا لیکن ان کی آمد کے کوئی آثار نہ ملے۔ ماحول پر نصف شب کا سناٹا طاری ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی کسی گاڑی کے گذرنے کی آواز کے ساتھ دل میں امید کی ایک لہر اٹھتی مگر فوراً ہی کوئی نقش چھوڑے بغیر معدوم ہو جاتی۔ فضا پر غنودگی طاری ہو رہی تھی اور میرا دل مایوسی کے اندھیروں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ اسی عالم میں رات کے بارہ بجے اور میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب واپس جانا چاہیے۔ چنانچہ برادرم قسیم صاحب

سے اجازت لیکر اٹھ کھڑا ہوا۔ گھر سے باہر آیا۔ گلی اسی طرح سنسان تھی۔ عالم یاس میں تھکے تھکے قدم اٹھاتا ہوا سڑک پر آیا۔ دور تک نظر دوڑائی۔ ایک گاڑی کی روشنیاں نظر آئیں تھوڑی دور آگے بڑھا۔ قسیم صاحب نے کہا ہو نہ ہو بابا اسی گاڑی میں ہیں۔ اتنے میں گاڑی قریب آئی۔ دل دھڑکا۔ غور سے دیکھا تو گاڑی میں مولانا زین الحسن صاحب قبلہ کے ساتھ استاد محترم بھی تشریف فرما تھے۔ فوراً واپس آیا۔ اتنی رات گئے مجھ کو دیکھ کر حیران ہوئے۔ قسیم بھائی نے بتایا کہ شام سے آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔

اب اس وقت جبکہ رات کے بارہ بج چکے تھے، استاد محترم بہت تھکے ہوئے بھی تھے اور پھر یہ کہ ڈاکٹروں نے زیادہ دیر تک ان کو جاگنے سے منع کیا ہے جس کی وجہ سے وہ اکثر محفلوں میں شرکت نہیں کر سکتے۔ ان سب باتوں کے پیش نظر میرے حسابوں ان کا آمادہ آمادہ برتھا اس لیے کہ میں ان کو اصلاح کی زحمت دینے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن ہوا کیا۔ وہ گاڑی سے اتر کر سیدھے ڈرائنگ روم میں تشریف لائے۔ لباس بھی تبدیل نہیں کیا اور اشعار سنانے کا حکم دیا۔ اس وقت میں خود اپنی خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے مسرت و امتنان کے جذبے اور شرمندگی کے احساس کے ساتھ تعمیل ارشاد کی۔ انہوں نے مناسب مشورہ اور اصلاح کے بعد برادرم قسیم صاحب کے اشعار بھی ملاحظہ فرمائے اور اس طرح تقریباً نصف گھنٹے ان کو اور بھی مصروف رہنا پڑا۔

یہ ہے استاد محترم حضرت نسیم امروہوی کے حوصلہ کی بلندی، انسانی ہمدردی، اعلیٰ اخلاق، فن کی بے لوث خدمت اور شاگردوں سے مخلصانہ محبت کی طویل داستان کا ایک چھوٹا سا حصہ۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت نسیم امروہوی ایک فطری اور سچے شاعر ہیں اور ہر سچا شاعر ایک شریف حساس اور درد مندانہ طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے

دکھوں کو اپنا دکھ اور سب کے درد کو درد مشترک سمجھتا ہے۔ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا پاس اور دوسروں کے جذبات کا احساس و احترام اس کے فن کو صداقت کا لہجہ، درد کی مٹھاس اور الہام کی پیغمبرانہ شان عطا کرتا ہے۔ بنیادی طور پر ہر شاعر کا موضوع انسانیت ہوتا ہے چاہے وہ کسی شکل یا پیرائے میں ہو۔ یہی وجہ ہے کہ فن کی بنیاد اعلیٰ انسانی اقدار پر رکھی گئی ہے جو فنکاروں کے طرز عمل سے نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔

وہ عام صفات جو کسی شاعر کی طبیعت میں فطرۃً رچی بسی ہوتی ہیں، اپنی تمام تر قوتوں اور رعنائیوں کے ساتھ حضرت نسیم امروہوی کی ذات گرامی میں جلوہ گر ہیں۔ ان کی زندگی میں ایسے واقعات کی کمی نہیں جو ہمدردی، خلوص اور خدمت کی راہ میں منارہ نور کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں سے ایک آدھ واقعہ اُس زمانے کا بھی میری یادداشت میں محفوظ ہے۔ جب میں نیشنل ہائی اسکول، حضرت گنج، لکھنؤ میں زیر تعلیم تھا جہاں حضرت نسیم امروہوی، جو اس اسکول کے بانیوں میں سے تھے، اردو پڑھاتے تھے۔ یہ زمانہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۵ء تک کا زمانہ ہے۔

نیشنل ہائی اسکول میں بہت سے طالب علم یہ بات جانتے تھے کہ جن طالب علموں کی عدم استطاعت کی بنا پر ان کی تعلیم جاری رہنے میں کچھ دقتیں پیش آتی ہیں وہ عموماً حضرت نسیم امروہوی دور فرما دیتے ہیں۔ اسکول کی انتظامیہ سے سفارش کر کے فیس معاف کروانا اور اپنی جیب خاص سے کتابوں اور کاپیوں کے لیے انتظام کر کے ایسے نادار طلباء کی تعلیم کو جاری رکھنے میں ان کو مدد دینا اپنا فرض سمجھتے تھے اس کے لیے یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ طالب علم انھیں کا شاگرد ہو۔

ایک اور واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا جس سے نہ صرف حضرت نسیم امروہوی کی عظمت اور ایثار کا پتہ چلتا ہے بلکہ دوسرے سچے فنکاروں کی اعلیٰ ظرفی، بلندی اور فن کی مخلصانہ قدردانی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ لکھنؤ کا واقعہ ہے۔ ایک مجلس کا ذکر ہے جس میں حضرت نسیم امروہوی کو وہ مرثیہ پڑھنا تھا جس میں انہوں نے خاتون جنت سیدۃ نساء العالمین جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی شادی کا ذکر بڑی دھوم دھام سے نظم کیا تھا۔ مقررہ وقت ہوتے ہوتے عاشقان فن اور مشتاقان سخن سے مجلس کھچا کھچ بھر گئی تھی۔ بانی مجلس (آغا فرخ حسین مرحوم) کے صاحبزادے مرزا اختر حسین اختر (مقیم حال محمدی کاٹن فیکٹری شہداد پور، پاکستان) نے پیش خوانی کی اور اس کے بعد درود وصلوات کی گونج میں، حضرت نسیم امروہوی منبر پر تشریف لے گئے۔ ایک آدھ رباعی اور سلام کے بعد داد و تحسین کے شور میں مرثیے کی ابتدا کی۔ شان علیؑ و فاطمہؑ میں وارد شدہ آیات و احادیث کو استعارۃً شادی کے تمام دنیوی لوازمات و رسوم کے سانچے میں ڈھال کر شاعرانہ انداز بیان میں کمال فنکاری کے ساتھ ایک بالکل اچھوتے طریقے اور ایسے اہتمام سے پیش کیا کہ ہر شعر کو عروس سخن کا زیور بنا دیا۔ سننے والے عش عش کر اٹھے۔ در و دیوار سے داد و تحسین اور درود وصلواۃ کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

مجلس میں دیگر مشاہیر شعرا کے علاوہ، حضرت انس کے چشم و چراغ، جلیل لکھنوی بھی تشریف فرما تھے۔ جلیل ایک جلیل القدر شاعر تھے۔ عمر کے اعتبار سے اتنے کہن سال کہ ضعیفی اور ناتوانی کے باعث چلنا پھرنا دشوار تھا مگر نہ صرف یہ کہ مجلس میں تشریف لائے بلکہ مرثیہ اتنا پسند فرمایا کہ مجلس میں داد دینا کافی نہ جانا اور ازراہ قدردانی اور فن سے خلوص کے جذبے کے تحت اس ضعیفی کے عالم میں بھی کسی نہ کسی طرح گرتے پڑتے نسیم کے گھر تشریف لے گئے اور داد دی۔ یہی نہیں بلکہ اس مرثیے کے حوالے سے حضرت نسیم امروہوی کی تعریف و توصیف میں ایک نظم بھی کہی جس کا مطلع اور مقطع درج ذیل ہے۔

حال شادی نظم کیا اچھا کیا اس شاہ کا
جو بنا دولھا نبیؐ کی دختر ذی جاہ کا

نظم کا اس بیاہ کے سہرا ہے ان کے سر جلیلؔ
جس طرح سہرا علیؑ کے سر رہا اس بیاہ کا

—— مندرجہ بالا نظم اس زمانے میں قوم کے ایک مشہور اخبار "نظارہ" لکھنؤ میں شائع ہوئی تھی جو میرے لائق صد احترام بزرگ اور استاد حسینی شاعر حضرت فضلؔ لکھنوی کی ادارت میں تقریباً نصف صدی سے شائع ہوتا ہے۔ حضرت فضلؔ لکھنوی میرے چچا بھی ہوتے ہیں اور پھوپھا بھی۔ جب تک میں لکھنؤ میں رہا انھیں سے اصلاح لیتا رہا اور انھیں کی شفقت اور ہمت افزائی کی بنا پر شعر گوئی کا سلسلہ جاری رکھا۔

حضرت جلیلؔ لکھنوی کے سلسلے میں ایک اور بات خاص طور سے قابل تحریر ہے۔ جب وہ حضرت نسیمؔ امروہوی کے دولت خانے پر تشریف لائے تھے تو وہیں انھوں نے حضرت نسیمؔ امروہوی کی کمسن صاحبزادی (شمیم بانو مرحومہ) کو دیکھا۔ محبت سے پاس بلایا۔ دیر تک شفقت آمیز باتیں کرتے رہے۔ خود لاولد تھے۔ حضرت نسیمؔ امروہوی سے خلوص کے رشتے اور استوار کرنے کے لیے ان سے ان صاحبزادی کو مانگ لیا۔ وہ اپنے والد بزرگوار کی اکلوتی صاحبزادی تھیں مگر حضرت نسیمؔ امروہوی کے ظرف اور جذبۂ ایثار نے اس خواہش کو رد نہ کرنے دیا اور آپ نے فرمایا کہ "یہ لڑکی آج سے آپ ہی کی ہے۔" چنانچہ حضرت جلیلؔ دوسرے روز پھر تشریف لائے اس مرتبہ ان کی اہلیہ بھی ساتھ تھیں۔ دونوں ان صاحبزادی کو اپنے ہمراہ لے گئے اور کوئی دس پندرہ روز اپنے ساتھ رکھ کر پھر ان کے والد محترم کے پاس پہنچا دیا۔ اس کے بعد جب تک وہ زندہ رہے وہ صاحبزادی پندرہ بیس روز ان کے یہاں اور پندرہ بیس روز اپنے والد بزرگوار کے ساتھ رہتی تھیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ اہل لکھنؤ کسی کی قدر نہیں کرتے۔ بعض صاحبان علم و فضل کے منہ سے یہ بات کتنی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ لکھنؤ والے تو میر انیسؔ کو بھی نہیں مانتے۔ قطع نظر اس سے کہ میر انیسؔ اگر لکھنوی نہ تھے تو کیا تھے اور اگر

میر حسن کے پوتے ہونے کی بنا پر ان کو دہلوی ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانا واجب ہے تو اور صاحبان کمال مثلاً غالب کو ان کے اجداد کی نسبت سے دہلوی کیوں کہا جائے اور تورانی کیوں نہ کہا جائے۔ میں اگر عرض کرنے کی جسارت کروں کہ لکھنؤ ہی میں میر انیس، میر انیس بنے تو چھوٹا منہ اور بڑی بات ہوگی۔ اس ضمن میں جب اس وقت کے لکھنؤ کا ذکر ہوتا ہے تو وہاں کی تعیش پسندی اور بگڑے ہوئے معاشرے کی بات بڑی شد و مد سے کی جاتی ہے۔ مگر یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ بےشک اس وقت لکھنؤ میں دولت کی فراوانی، امن و خوشحالی اور فارغ البالی نے لوگوں کو عیش و عشرت کی طرف مائل کر دیا تھا اور معاشرہ میں تعیش پسندی عام ہوگئی تھی۔ جو بالکل قدرتی بات تھی۔ اس کی مثال آج کے یورپ اور امریکہ سے دی جا سکتی ہے کہ آج وہاں تعیش پسندی اور معاشرتی خرابیاں جس حد کو پہنچی ہوئی ہیں، لکھنؤ کا وہ معاشرہ تو اس کے عشر عشیر کو بھی نہیں پہنچ سکا تھا جس کے لیے آج وہ مطعون ہے۔ لیکن عیش و عشرت کے متوالے اور دنیا کے غم سے بے نیاز لکھنؤ والے ایک غم کو جس شدت سے گلے لگائے ہوئے تھے وہ دنیا کے ہر غم سے برتر اور شدید تر ہے۔ وہ غم حسینؑ کا غم ہے۔ جان رسولؐ اور جگر بند بتولؑ کا غم ہے۔ کربلا کے بہتّر شہیدوں کا غم ہے۔ عزاداری حسینؑ لکھنؤ کا سرمایۂ افتخار تھی۔ یکم محرم سے آٹھ ربیع الاول تک دو مہینے اور آٹھ دن کی مدت اہل لکھنؤ کے لیے ہر تعیش سے بری اور آلائش دنیوی سے پاک ہوتی تھی۔ دن رات صرف عزاداری حسینؑ سے کام تھا۔ امام باڑوں کے علاوہ گھر گھر مجلسیں ہوتی تھیں جن کا سلسلہ دن رات جاری رہتا تھا۔ روساء و امراء کا تو ذکر ہی کیا، غریب غربا بھی اپنی سال بھر کی کمائی اس زمانے میں نام حسینؑ پر لٹا دیتے تھے۔ ذاکرین اور مرثیہ گو حضرات کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ ان کی قدردانی اس شہر پر ختم تھی۔ اس زمانے کی آمدنی ان کے سال بھر کے آذوقہ کا بہانہ ہوتی تھی۔

لکھنؤ کا یہی ماحول تھا جس میں میر انیس نے غزل گوئی ترک کر کے مرثیے کی طرف توجہ دی۔ اگر میر انیس کو لکھنؤ کا یہ ماحول نہ ملتا تو وہ اپنی فطری شاعرانہ صلاحیتوں کی بنا پر غالب، میر، اور مومن تو بن سکتے تھے مگر انیس نہیں۔ دنیا انہیں حزین کے نام سے جانتی، انیس کے نام سے نہیں۔ رہی مخالفت اور موافقت کی بات تو وہ ہر فنکار کے لیے ہر عہد اور ہر مقام پر ہوتی ہے۔ فنکاروں میں بالعموم اور شاعروں میں بالخصوص گروہ بندیاں آج بھی عام ہیں۔ اسی کراچی میں مجالس و محافل میں شرکت کرنے والوں پر یہ بات بخوبی روشن ہے۔ لکھنؤ میں اگر انیس کے مخالف اور دبیر کے حامی موجود تھے تو انیس کے حامیوں اور دبیر کے مخالفوں کی بھی کمی نہ تھی یہاں تک کہ سارا لکھنؤ دو گروہوں میں بٹا ہوا تھا جو انیسیے اور دبیریے کہلاتے تھے۔

معذرت خواہ ہوں کہ یہ ضمنی سی بات زبان قلم سے نکل گئی۔ اس وقت میرا موضوع نہ انیس ہیں اور نہ لکھنؤ۔ اس وقت تو موضوع سخن استاد محترم حضرت نسیم امروہوی مدظلہ العالی کی ذات گرامی ہے جو مرثیہ گوئی میں اپنے اوج کمال کی بنا پر اس عہد میں فن کی مسند پر بلا شرکت غیرے میر انیس کی طرح متمکن ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بیش بہا حصہ لکھنؤ میں گذارا ہے اور اہل لکھنؤ نے حق المقدور ان کی قدر دانی میں کبھی کمی نہیں کی۔

شعر پر اصلاح دینا بجائے خود ایک فن اور ایک مشکل کام ہے۔

اصلاح سخن:۔ کسی دوسرے کے کلام کو اس کی اپنی فکر اور سوچ کے مطابق ایک آدھ لفظ کے الٹ پھیر سے بلند کر دینا آسان نہیں ہے۔ ذاتی طور پر میں خود کسی مسودے کو درست کرنے سے زیادہ آسان یہ سمجھتا ہوں کہ خود میں لکھ لوں۔ اسی طرح میرا خیال ہے کہ کسی کے شعر کو درست کرنے کی بہ نسبت خود شعر کہہ لینا یا کہہ کر دیدینا زیادہ آسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر بہت اچھے شاعر اصلاح کے معاملے میں بہت اچھے استاد ثابت نہیں ہوتے۔ حضرت نسیم امروہوی جتنے بلند پایہ شاعر ہیں اتنے ہی اچھے استاد بھی ہیں۔

طریق اصلاح:۔ اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر میں اصلاح کے سلسلے میں چند باتوں کو

بہت اہم سمجھتا ہوں۔

اوّل تو یہ کہ استاد کا رویہ ہمت شکن نہ ہو یعنی یہ کہ اگر شاگرد نے کوئی مہمل شعر کہا یا کوئی فاش غلطی کی تو یہ نہ کہے کیا کہا ہے، کیا جھک ماری ہے یا یہ کہ کس حکیم نے آپ کو شعر کہنے کا مشورہ دیا ہے۔

دوسرے یہ کہ شاگرد کو افہام و تفہیم کے عمل میں بحث و تمحیص کی اجازت دے تاکہ وہ خود اپنی غلطی یا خامی دور کرنے کی کوشش کر سکے اور استاد کی اصلاح کی اہمیت سمجھ سکے۔

تیسرے یہ کہ استاد اصلاح کے سلسلہ میں فنی رموز سے بھی آگاہ کرتا جائے تاکہ شاگرد فن کی تمام باریکیوں سے بھی باخبر ہوتا رہے۔

چوتھے یہ کہ استاد اس طرح اصلاح کرے کہ شعر بلند ہو جائے نہ کہ اصلاح کے بعد فنی خامی تو دور ہو جائے مگر زور اور اثر کے اعتبار سے شعر اور گر جائے۔ دراصل یہی وہ منزل ہے جہاں اصلاح کی اہمیت واضح ہوتی ہے اور استاد کے جوہر کھلتے ہیں۔ اس کی ایک مثال پیش کروں۔ عید مباہلہ کے سلسلہ میں ایک طرحی محفل میلاد کے لیے ایک مصرع طرح دیا گیا: "مباہلہ حق و باطل کے درمیان ٹھہرا"۔ میں نے مصرع طرح لگا کر اسے مطلع بنایا۔ مصرع تو یاد نہیں لیکن وہ مصرع مجھے خود ہی پسند نہ تھا۔ استاد محترم ان دنوں کراچی میں تشریف نہیں رکھتے تھے۔ میں نے احتیاطاً ایک بزرگ محترم کو سنایا جو خود بے بدل شاعر ہیں انھوں نے بھی ناپسند فرمایا اور اپنی طرف سے یہ مصرع تجویز کیا "نہ حق پہ جب بنی نجراں کا کارواں ٹھہرا"۔ ظاہر ہے اس مصرع کو میرے مصرع کے بہت بلند ہونا چاہیے تھا۔ لیکن مجھے یہ ——— "نہ حق" کی ترکیب پسند نہ آئی۔ اس کے علاوہ "بنی" کی "ی" تقطیع میں گرتی تھی۔ ان وجوہ سے مصرع سست معلوم ہوا۔ فرمانے لگے "نہ حق" بالکل صحیح ہے۔ حق کیا بیشک مگر دل کو نہیں لگتا۔ کچھ فکر کرنے پر میرے ذہن میں ایک اور مصرع آیا:

"تجلیتوں کا جو ظلمت سے امتحاں ٹھہرا" سنکر خوش ہوئے۔ فرمایا اس میں شاعری ہے۔ میں تسلیمات بجالایا۔

استاد محترم حضرت نسیم امروہوی اصلاح دیتے ہوئے ان تمام نکات کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ انہوں نے میری ہمت شکنی نہیں کی۔ میں نے کتنی ہی بڑی غلطی کی ہو انہوں نے کبھی اس طرح اس کی نشاندہی نہیں کی کہ میں نے سبکی محسوس کی ہو یا اپنے شعر گوئی کے شوق پر نادم ہونا پڑا ہو۔ اصلاح کے وقت وہ مجھ کو پورا موقع مہیا فرماتے ہیں کہ میں اصلاح شدہ لفظ پر اپنی رائے کا مودبانہ اظہار کر سکوں اور ان کی مجوزہ تبدیلی کے بعد بھی اپنی طرف سے کوئی اور لفظ تجویز کر سکوں۔ طریقہ کچھ یوں ہے کہ میں نے شعر پڑھا۔ انھوں نے فرمایا کہ فلاں لفظ بدل جانا چاہیے اس لیے کہ یا تو اس میں کوئی عیب ہے یا وہ سست ہے۔ میں نے کوشش کی اور کوئی دوسرا لفظ تجویز کیا۔ انھوں نے فرمایا "مزہ نہیں آیا۔" پھر خود کوئی لفظ تجویز کیا۔ میں سنتے ہی پھڑک اٹھا۔ اور اصلاح مکمل ہو گئی۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ لفظ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں خاموش ہو جاتا ہوں اور وہ سمجھ لیتے ہیں کہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اب اگر میں کوئی دوسرا لفظ تجویز کر سکا اور ان کو پسند آگیا تو فرمایا "یہ اچھا ہے" ورنہ وہی کہ مزہ نہیں آیا۔ اور اس طرح انھوں نے کوئی دوسرا بہتر لفظ رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ فنی رموز سے بھی آگاہ فرماتے جاتے ہیں اور اس طرح میری فنی تربیت بھی ہوتی جاتی ہے۔

اب میں خود اپنے اشعار پر استاد محترم کی دی ہوئی اصلاح کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں جن سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اگر ان کا جیسا کوئی استاد فن کسی شعر پر اصلاح دیتا ہے تو کتنی باریکیوں پر نظر رکھتا ہے اور اصلاح سے شعر کو کس طرح بلند کر دیتا ہے۔

(الف) امام حسینؑ کی مدح میں ایک قصیدہ میں، میں نے ان کی ولادت باسعادت

کو مختلف تشبیہات سے آراستہ کرتے ہوئے ایک شعر کہا ؎

یا کسی جھیل میں کھلتا ہوا معصوم کنول
یا سرِ شاخ کوئی غنچۂ خنداں آیا

— استادِ محترم نے جھیل کا لفظ بدل کر بزم کا لفظ رکھ دیا۔ سبب یہ تھا کہ جس پس منظر میں یہ شعر کہا گیا تھا اس پر اگر غائر نظر کی جائے تو جھیل کا لفظ مبتذل معلوم ہوگا۔ اس کے علاوہ "بزم" کے لفظ سے "کنول" کے مفہوم میں نورانیت پیدا ہوگئی جیسے امام کی ذات سے خاص تعلق ہے۔

(ب) یزیدیت ہوئی یوں ظلم کے انجام سے غافل
فلک پر سنگ پھینکے اور اپنا سر نہیں دیکھا

— اس شعر میں پھینکے کو پھینکا سے بدل دیا اس لیے کہ جمع کے صیغے میں پھینکے کہنے سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ جیسے کوئی واقعی پتھر پھینک رہا تھا حالانکہ بات صرف "استعارۃً" کہی گئی تھی۔ جمع کے صیغے کو واحد سے بدل کر پھینکے کو پھینکا کہنے سے یہ نامناسب تاثر ختم ہوگیا۔

(ج) حضرت ابو الفضل العباسؑ کی مدح میں ایک قصیدے کی تشبیب میں قلم کی صفات بیان کرتے ہوئے میں نے ایک شعر کہا ؎

"اس قلم سے بہارِ باغِ سخن جیسے برکھا میں وادیِ کشمیر"

فرمایا کہ شعر چلے گا تو خوب مگر چونکہ پہلے مصرع میں قلم سے بہارِ باغ کہا گیا ہے اس لیے دوسرے مصرع میں برکھا سے بہارِ کشمیر کہنا چاہیے نہ کہ برکھا میں وادیِ کشمیر۔ میں نے یہ نکتہ قبول کرتے ہوئے مصرع یوں بدل دیا ع جیسے برکھا سے جاگ اٹھے کشمیر۔ اس طرح وہ عیب دور ہوگیا اور انھیں نے مصرع پسند فرمایا۔

(د) اسی سلسلہ کا دوسرا شعر ؎

"طائر ذہن کے لیے ناوک　　آ ہوئے فکر کے لیے زنجیر"

یہاں ناوک کا لفظ مناسب نہیں تھا اس لئے کہ قلم کا کام ہے خیال کو الفاظ کے قالب میں اسیر کر لینا جو دوسرے مصرع میں "آہوئے فکر کے لیے زنجیر" کہہ کر ظاہر کیا گیا۔ لیکن ناوک محفوظ یا اسیر کرنے کے بجائے کام ہی تمام کر دیتا ہے۔ چنانچہ آپ نے ناوک کو صیاد سے بدل دیا اور اس طرح طائر ذہن کے لیے صیاد کہنے سے بات بن گئی۔

(ہ) امام حسینؑ کی مدح میں ایک مطلع کہا:-

دیکھتے ہی دیکھتے خنجر رگ جاں ہوگیا　　رفتہ رفتہ کوئے قاتل کوئے جاناں ہوگیا

آپ نے فرمایا کہ "کو" مونث ہے، مذکر نہیں۔ عرض کہ جلالؔ لکھنوی نے مذکر مانا ہے۔ فرمایا، فرہنگ اثر میں اسے مونث لکھا گیا ہے اور چونکہ زمانے کے اعتبار سے اثرؔ لکھنوی جلالؔ لکھنوی سے موخر ہیں اس لیے انھیں کی بات قابل قبول ہو سکتی ہے۔ چنانچہ میں نے یہ مطلع قلمزد کر دیا،

(و) وصف ان کا اور فکر میں تاب و تواں نہیں

ذکر ان کا اور میرے دہن میں زباں نہیں

—— اس شعر کے پہلے مصرع میں فکر اور دوسرے میں ذکر کا لفظ تھا۔ استاد محترم نے حرف ترتیب بدل کر دونوں لفظ ایک ہی مصرع میں رکھ دیئے۔ یعنی "ذکر ان کا اور فکر میں تاب و تواں نہیں ہے" اور وصف کو دوسرے مصرع میں لے آئے۔ اس تبدیلی سے شعر کی بندش زیادہ چست ہوگئی۔

(ز)　　دل مومنوں کے جلوہ گہہ طور ہو گئے

انوار کی فلک سے وہ بارش ہوئی ہے آج

—— اس شعر کے دوسرے مصرع میں "فلک سے انوار کی بارش" کوئی بلند بات نہیں تھی۔ ذکر تھا امامؑ کی ولادت کا۔ امامؑ کے نور کو نورِ عرش یا نورِ کبریا سے

مناسبت ہو سکتی ہے نہ کہ نورِ فلک سے۔ چنانچہ استاد محترم نے دوسرے مصرع کو یوں بنا دیا "انوارِ کبریا کی وہ بارش ہوئی ہے آج۔"

(ح) کس گھر میں آج رحمتِ حق جلوہ گر نہیں
کس باغ میں نسیم ارم کا گذر نہیں

—— ارم چونکہ نام ہے شداد کی بنائی ہوئی جنت کا اس لیے سرورِ کائنات کی مدح کے سلسلہ میں اس لفظ کا ذکر نامناسب تھا۔ چنانچہ نسیم ارم کو نسیم جناں بنا دیا گیا۔

(ط) چھاؤں طوبیٰ کی، لب تسنیم، کوثر کی فضا
قلقل مینا کا نغمہ عیش کا پیغام ہے

—— مدح تھی خاتون جنت کی۔ اس لیے عیش کا لفظ شایانِ شان نہ تھا چنانچہ اسے عید سے بدل دیا گیا۔ اور مصرع یوں ہو گیا ؎ قلقل مینا کا نغمہ عید کا پیغام ہے۔

(ی) اس سحر کی گود میں باغ نبوت کی کلی
وہ کلی جس سے بہارِ گلشنِ اسلام ہے

—— "بہار گلشن اسلام" کہنا ایک عام بات تھی۔ پھر یہ کہ "بہار گلشن" مخدومۂ عالم کے شایانِ شان بھی نہ تھا اس لیے استاد محترم نے وقار کا لفظ رکھ دیا اور "بہار گلشن اسلام" کے بجائے "وقار گلشنِ اسلام" کہکر شعر کو بلند کر دیا۔

(ک) تاک میں ہونگی ہماری مستیاں برسات کی
ذہن کا رشتہ کریں گے دخترِ انگور سے

—— یہاں پہلے مصرع کی مناسبت سے دوسرے مصرع میں سبب کا تعین ہونا چاہیے تھا۔ یعنی مستیاں ہماری تاک میں کیوں ہوں گی۔ اس لیے استاد محترم نے مصرع کو یوں بنا دیا۔ "ذہن کا رشتہ جو ہوگا دختر انگور سے۔"

اسی طرح کی بہتیری مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ میں نے اس موضوع کو اپنی ذات

ہی تک محدود رکھا ہے۔ اس لیے کہ مجھے اپنی غلطیوں کے اعتراف میں کوئی باک نہیں ہے۔ کسی دوسرے کے کلام سے مثالیں دینا اس لیے مناسب نہیں کہ معلوم نہیں اس بات کو کون پسند کرے اور کون نہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ایسی مثالیں میرے علم میں بھی نہیں ہیں۔ استاد محترم حضرت نسیم امروہوی میں جو ایک بڑی عظیم بات میں نے دیکھی وہ یہ ہے کہ وہ اپنے کسی شاگرد کے متعلق کسی کو بھی حتیٰ کہ دوسرے شاگردوں کو بھی یہ نہیں بتلاتے کہ وہ ان سے اصلاح لیتا ہے۔ ان کے بہتیرے شاگردوں سے لوگ اچھی طرح واقف ہیں لیکن بہت سے ایسے بھی ہوں گے جن کے متعلق کوئی نہیں جانتا، بقول کسے: اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔

—— لیکن لوگوں کو معلوم نہیں ایک اور بات یہ کہ کسی دوسرے کی موجودگی میں حتیٰ کہ خود اپنے صاحبزادوں کی موجودگی میں کسی شاگرد کے کلام پر اصلاح نہیں دیتے۔ شاید اس لیے کہ اس طرح شاگرد کسی طرح کی سبکی محسوس نہ کرے۔ میرا خیال ہے کہ اپنے شاگردوں کے جذبات کا اتنا احترام شاید دوسرے نہ کرتے ہوں۔

حضرت نسیم امروہوی مدظلہ العالی اپنا بیش قیمت وقت صرف کرکے اور اپنے عیش و آرام کو تج کر اپنے شاگردوں پر محنت کرکے اور ان کے کلام پر اصلاح دے کر شعر و ادب کی جو بے لوث خدمت انجام دے رہے ہیں اس کو نظر انداز کیا ہی نہیں جاسکتا۔ یہ ان کی مسلسل توجہ انتھک محنت اور مخلصانہ ہمت افزائی ہے جو اردو نظم کے ذخیرے میں خصوصیت کے ساتھ مرثیہ قصائد اور سلام وغیرہ میں گرانقدر اضافہ ہوتا رہا ہے اور انشاءاللہ ہوتا رہے گا۔ خداوند عالم بحق چہاردہ معصومینؑ حضرت نسیم امروہوی مدظلہ العالی کو صحت و تندرستی کے ساتھ عمر نوح عطا فرمائے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

نسیمؔ امروہوی کے تلامذہ

ہلال نقوی

لیکچرار شعبہ اردو سراج الدولہ کالج، کراچی

ہم ایک ایسے دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں انسان کو اشیائے صرف (CONSUMING GOODS) میں کھپنے والی منڈیوں کا کاروبار مشینوں کی برق رفتاری سے بھی تیز ہے۔ ایک طرف انسان اندھیروں اور نامرادیوں کے جزیروں میں اپنی آرزوؤں اور امیدوں کے سورج کو غروب ہوتے دیکھ رہا ہے اور دوسری طرف چاند پر کھڑے ہو کر خود اپنے ہی ذہن کو طلوع ہوتے دیکھنے میں محو و مستغرق ہے۔ یہ دور کشمکش کا دور ہے، تضاد کا دور ہے، افسردگی، مایوسی، بے چینی اور دل گرفتگی سروں پر مسلط ہے، سرمایہ داری کی خون آشام تلواریں انسانوں کے بدن سے جونک کی طرح چمٹ کر خون چوس رہی ہیں، محنت کش طبقے کی خستہ حال اور کمزور زندگی، صبح انقلاب کے سورج کو افق معاشرہ پر کھینچ لانے کے لئے بے چین و مضطرب ہے، پوری کائنات مصائب کی زد پر ہے۔ خشک سالی اپنا جال بچھا رہی ہے۔ بھوک اور افلاس کی ناگن ڈسنے پر تلی ہوئی ہے محنت کی قدر و قیمت کا احساس مٹ رہا ہے، دھرتی کا پیار لوگ

بھگوں رہے ہیں۔ جوان طبقہ بے دلی اور حرماں نصیبی کے جال میں گرفتار ہے۔ علم و دانش کا صرف نام باقی رہ گیا ہے اور زر کی پرستش کی جا رہی ہے۔ اس افراتفری کے دور میں جبکہ ایک انسان کو اپنے برابر کھڑے ہوئے انسان کی خبر نہیں کہ وہ کس حال میں ہے، اگر میں کسی سے کہوں کہ آپ نے نسیم امروہوی کے مرثیے پڑھے یا سنے ہیں تو وہ میرے اس سوال کی بے ساختگی اور اچانک پن پر یا تو ہنسے گا یا میری دماغی صحت پر شک کرے گا اور سوچے گا کہ "روٹی، کپڑے اور مکان" کے اس دور میں اور تنازع للبقا کی اس بھاگ دوڑ کے عالم میں نسیم امروہوی کے مرثیے کا کیا ذکر اور ہوسکتا ہے وہ مجھ سے کہے کہ زندگی کے مسائل اور زندگی کے ہنگاموں سے ہٹ کر آپ نے یہ کونسا راگ الاپنا شروع کر دیا۔ یہ فکر دراصل ان لوگوں کی فکر ہے جو معاشرے کے لئے شاعر کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ ہزاروں لوگ ایسے گزرے ہیں جو سوسائٹی سے شاعر کا کوئی ربط ملتے ہی نہیں۔ افلاطون نے یونان کے لئے جمہوری سلطنت کا تصوراتی ڈھانچا بناتے ہوئے شاعر کے سوا ہر فن اور ہر قسم کے پیشے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی ضرورت محسوس کی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ افلاطون نے شاعر کی اہمیت اور اس کے رسوخ کو نہ محسوس کیا ہو بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ شاعر نے انسان کے احساسات، جذبات اور امنگوں کو جو قوت اور جولانی عطا کی ہے اسے افلاطون سمجھ ہی نہیں سکا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، یہ آج سے چار پانچ برس اُدھر کی بات ہے، نسیم امروہوی کراچی میں ایک مقام پر فوج حسینی کے خمیدہ کمر مجاہد حضرت حبیب ابن مظاہر کے حال کا مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ جب مجلس ختم ہوئی تو عزیز آباد کے ایک ضعیف العمر بزرگ جن کی پشت کسی حد تک خم، ہاتھوں میں رعشہ اور قدموں میں لرزش تھی، نسیم امروہوی کے پاس آئے مصافحہ کیا، اور کہنے لگے "حضور،

آپ نے تو مجھ جیسے بوڑھے کو بھی جوان کر دیا اور آپ کے اشعار کی حرارت نے رگوں میں تازہ خون دوڑا دیا۔" میں نے دیکھا ان بزرگ کی آنکھوں میں چمک تھی۔ ایک خاص قسم کی چمک جس میں نئے احساسات کی رو نظر آتی ہے۔ وہ بزرگ گھر کی طرف لوٹ رہے تھے مگر محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ان کے قدموں کی استقامت بڑھ گئی ہے، احساسات جوان ہو گئے ہیں اور رعشہ سلام کر کے رخصت ہو گیا ہے۔ زندگی کو یہ رنگ عطا کرنے میں جس قدر اردو مرثیے نے حق ادا کیا ہے وہ کوئی صنفِ سخن نہیں کر سکی۔

کسی بھی فنکار یا مصنف کی زندگی اور اس کے کارناموں کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہوتی ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ آنے والی نسلوں کو اس نے کیا دیا، اور اس کا فیض کن کن شکلوں میں ہمارے سامنے آیا۔ اس زاویۂ نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو نسیم امروہوی برصغیر ہند و پاک کے مرثیہ گو شاعروں میں بہت بلندی پر ہیں۔ انہوں نے جہاں ہمیں بہترین مراثی کی کثیر تعداد دی، نئی شان و شوکت کے ساتھ قصیدوں کے صدہا اشعار دیئے۔ تاریخ گوئی کے فن کو نئی آب و تاب بخشی۔ معاشی، سیاسی، سماجی، مذہبی، علمی اور ادبی موضوع پر ان گنت نثر و نظم کی کتابیں لکھیں، وہاں انہوں نے ایک بہت بڑا حلقہ اپنے تلامذہ کا بھی عطا کیا۔ جن میں اکثر، غزل۔ نظم، قطعہ، سلام، رباعی اور مرثیہ وغیرہ میں بجائے خود ایک مستقل حیثیت کے مالک ہیں، ان سب نے نسیم امروہوی کے سامنے زانوئے ادب طے کیا، یوں تو نسیم امروہوی کے زاویۂ نگاہ، طرزِ بیان، طرزِ ادا، اور خوبیٔ زبان سے دورِ حاضر کے بیسیوں شاعر متاثر ہیں اور ان کے کلام میں جا بجا اندازِ نسیم کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن اس مقام پر ہم صرف ان حضرات کا مختصراً تذکرہ کریں گے جو ان کے تلامذہ میں آتے ہیں اور اس حلقے میں بھی صرف ان لکھنے والوں

کا جہاں تک ہماری رسائی ہو سکی ہے۔ اور جو صاحب دیوان شاعر یا مرثیہ گو ہیں لیکن اس موضوع پر لکھنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم نسیم امروہوی کی مرثیہ نگاری پر اپنی ذہنی رسائی کی حد تک ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی "رثا محسن الحکیم" کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ:

اعلیٰ درجہ کی فنی اور ادبی تخلیق کے لئے شرافت اور اعلیٰ اخلاق اقدار کا پاس ناگزیر ہے۔ جو شخص ان خصوصیات کا حامل ہوگا اس کی گفتار اور کردار میں ترفع ہوگا اور جو ان سے محروم ہوگا اس کا کلام بھی ادنیٰ اور پست ہوگا۔ جناب نسیم امروہوی اصلاً و نسلاً اور اپنی ذات میں شرافت اور نجابت کا مجسمہ ہیں اور یہی جوہر ان کے کلام میں نظر آتے ہیں، ان کے وطن امروہہ میں اردو شاعری اور ادب کی صالح روایات پروان چڑھیں اور انھیں روایات میں نسیم امروہوی نے مرثیہ گوئی شروع کی۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک لکھنؤ کی تہذیبی اور ادبی فضا نے ان کی مشق سخن کو جلا بخشی، سنہ ۵۰ء میں پاکستان تشریف لائے اور آج کل ترقی اردو بورڈ میں مدیر لغت کی حیثیت سے منسلک ہیں۔"

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

"یہ (رثا محسن الحکیم) ایک ایسے شخص (نسیم امروہوی) کی تصنیف ہے جس کے روز و شب ہی زبان، لغت اور قواعد کی تحقیق و تدوین میں صرف ہوئے ہیں، اس لئے ان کی صحت اور فنی تکمیل مسلم ہے۔"

نسیم امروہوی کے مرثیے "تسبیح فاطمہ" کے پیش لفظ میں رئیس امروہوی لکھتے ہیں کہ۔

"جناب نسیم کی ذات ستودہ صفات اردو نثر و نظم، شعر و ادب، لسانیات،

اور خصوصیت کے ساتھ اُردو کے جدید مرثیے کے میدان میں محتاجِ تعارف نہیں۔
نصف صدی سے وہ فرازِ منبر اور مجلسِ عزا میں اپنی قادر الکلامی، تازہ کاری،
بدیع گوئی اور بلیغ و مرصّع اندازِ بیان کا نقارہ بجا رہے ہیں۔"

جناب سید ہاشم رضا "مومنِ آلِ ابراہیم" کے پیش لفظ میں صفحہ ۱۶ پر لکھتے ہیں کہ
"یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ پاکستان میں جناب نجم آفندی، جناب جوش ملیح آبادی
جناب سید آلِ رضا اور جناب نسیم امروہوی جیسے مرثیہ گو مقیم ہیں جن کی تخلیقات میں زمانۂ
حال کے تقاضوں کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور شہادتِ عظمٰی کے واقعات کا ذکر کر کے
دعوتِ فکر، دعوتِ اخلاق اور دعوتِ عمل دی گئی ہے۔" نسیم امروہوی کے مرثیوں کی یوں
تو بے حد خصوصیات ہیں۔ ایک طالبِ علم کی حیثیت سے میری کیا مجال کہ میں ان کا احاطہ
کر کے ان کی قدر و قیمت کا تعین کروں۔ لیکن ایک اہم نکتہ ـــ جس کی طرف کم ہی
لوگوں کی نظر شاید گئی ہو، اور جو تمام خصوصیات سے قطعِ نظر ایک یادگار اور تاریخ ساز
خصوصیت ہے ـــ یہ ہے کہ نسیم امروہوی دو صد سالہ مرثیہ نگاری کے وہ پہلے
"مرثیہ گو شاعر" ہیں جنہوں نے قطعِ نظر واقعۂ کربلا اور شہدائے کربلا کے ممتاز علمی
شخصیتوں کے مرثیے کہنے کا آغاز کیا، اس میدان میں ان کی باقاعدگی ایک ایسا
کارنامہ ہے جسے اُردو نظم کی تاریخ میں جلی حروف سے لکھا جائے گا۔ مرثیہ
"رثائے محسن الحکیم" میں تاثرات کے عنوان سے ڈاکٹر یاور عباس نے اس نکتے کی
طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"نسیم امروہوی نے انسانوں کی تاریخ کا ایک خاکہ کھینچ کر رکھ
دیا ہے۔"

ـــ یہ ایک حقیقت ہے کہ موصوف کے انیسؔ انداز کے مرثیوں نے جذباتِ انسانی
میں وہ کیفیت پیدا کر دی ہے جس کے تصور سے بلندیوں کی طرف جانے کیلئے

قدموں میں سیمابیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ کیونکہ اس قسم کے مرثیے سن کر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ لوگ بھی تو ہماری طرح تھے۔ ہمارے ہی دور کے تھے۔ ہمارے ہی سماج میں رہتے تھے۔ یہ بھی اسی چودھویں صدی کے لوگ تھے جسے ہم طے کر رہے ہیں پھر ان میں اور ہم میں اتنا فرق کیوں؟ ہم بھی کوشش کریں تو ان کے ایسے ہو سکتے ہیں! یہ ایسے خیالات ہیں جنھیں ہم شہدائے کربلا کے مرثیے سن کر کبھی نہیں سوچ سکتے بلکہ ایسی باتوں کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ اور جب یہ نہیں تو ارتقا کی طرف قدم اٹھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہ سوال صرف انھیں ہستیوں کے مرثیوں کو سنکر ہو سکتا ہے جو ہم سے زیادہ مقدس تو ہیں لیکن ہماری طرح وہ بھی شہدا اور آئمہ کے غلاموں کی فہرست میں شامل ہیں۔ ان کے مرثیے کہہ کر نسیم امروہوی نے اس بات کا بھی ثبوت فراہم کر دیا کہ زندگی کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر میں ٹھہراؤ، جمود اور تنگ نظری کا شائبہ تک نہیں، انھوں نے فکر و نظر کے نئے علاقوں کو تسخیر کر کے اردو مرثیہ کے اقلیم میں شامل کیا ہے، وہ مسائل زندگی سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ترقی کیا ہے اور ہماری زندگی کے لئے اس کی کتنی ضرورت ہے:

ہر اک قدم پہ فلک ہے نیا زمین نئی
حیات ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتی

— معاشی ضروریات کا احساس انھیں بدرجۂ اتم ہے۔

ع دانا بھی بھول جاتے ہیں تسبیح بھوک میں

جاں نثاری، اتحاد، محبت، رواداری، اخوت اور مساوات کی ولولہ خیزی کا زور شور ان کے یہاں نمایاں ہے:

فراتِ دہر کا پانی سبھی کو پینے دو
یہی ہے رازِ بقا دوسروں کو جینے دو

نسیم امروہوی کوئی درباری شاعر نہیں، حاکموں کی چتون کے اشاروں پر ان کا قلم نہیں چلتا۔ انھوں نے اپنے آپ کو طبقۂ امرا تک محدود نہیں کیا۔ عوام سے انھوں نے اپنا رشتہ جوڑا ہے۔ سامعین پانچ ہوں یا دس، یا سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں، مکان غریبوں کے ہوں یا امیروں کے۔ جہاں بھی انھیں بلایا گیا، انھوں نے انتہائی عقیدت سے وہاں مرثیہ پڑھا۔ پاکستان اور خصوصاً کراچی کے چپے چپے میں انھوں نے مرثیے پڑھے ہیں۔ اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اور اس طرح وہ عوام کے شاعر بن گئے ہیں اور یہی بحیثیت ایک مرثیہ گو شاعر کے ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ فیض احمد فیض "میزان" کے صفحہ ۱۲۹ پر لکھتے ہیں کہ:

"مرثیہ نویسوں کا کلام اس لئے قابل قدر ہے کہ انھوں نے امراء سے ہٹ کر دوبارہ عوام کی طرف رجوع کیا۔"

نسیم امروہوی کے مرثیوں میں اعلانِ امرِ حق میں ان کی آواز دبی نہیں۔ بلکہ کچھ اور ابھر گئی ہے لیکن وہ مرثیے کو سیاست کی بازی گاہ بنانے کے لئے تیار نہیں، ان کے یہاں نہ انتہا پسندی ہے اور نہ فراریت۔ بلکہ اعتدال کی وہ آواز ہے جو جینے اور جینے دو کا پیغام دیتی ہے۔ وہ اپنے ایک مرثیے میں (جو عزاداری کے مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہے) ان مرثیہ گو، مرثیہ خواں اور مقررین کو انتباہ کرتے ہوئے، جو بیانِ مصائب سے گریز کرتے ہیں، گریہ ماتم کے نفسیاتی پہلوؤں کو سمجھتے ہوئے اس کی ضرورت کی اہمیت کو پرکھتے ہوئے اور اربابِ حکومت کے عزائم کو جانتے ہوئے اس انداز سے اظہارِ خیال کرتے ہیں:

ہے ابھی تک تو یہ اربابِ حکومت کا خیال اپنے مظلوم کو رونا ہے مجالس کا مآل
ختم ہو جائے گا جب گریہ و ماتم کا سوال ہوگی ہر بزمِ عزا غیر کے جلسوں کی مثال
دخل دے بیٹھیں گے حکام عزاخانوں میں
قفل پڑ جائیں گے تبلیغ کے کاشانوں میں

— ہو سکتا ہے کہ یہ بند پڑھ کر نقاد، شاعر کی فکر کو "گریہ و ماتم" کے سوال تک محدود کردے۔ نہیں ایسا نہیں ہے، نسیم امروہوی کا ایک اور بند سنیئے جس میں انہوں نے "گریہ و ماتم" کی حد سے آگے، بہت آگے بڑھ کر "مجلس" کے انعقاد کی غرض بیان کی ہے اور مرثیہ گوئی کے مقصد کا کھل کر اظہار کیا ہے:

بپا جو کرتے ہو تم مجلسیں عزا کے لئے　　اشاعت غم مظلوم کربلا کے لئے
یہ صرف بہر بکا ہیں نہ واہ وا کے لئے　　یہ مدرسے بھی تو ہیں دین مصطفیٰ کیلئے
نہیں یہ بزم ہدایت کا باب ہے گویا
حسین علم و عمل کی کتاب ہے گویا

نسیم امروہوی کی تمام کاوشوں، کوششوں، خدمات اور قلمی کارناموں کو اگر ان کے گرد و پیش کے ماحول کے پس منظر میں دیکھا جائے تو ان کی قدر قیمت میں اتنا اضافہ ہو جاتا ہے کہ عام ذہنی سطح کا انسان اس کا تصور نہیں کر سکتا، گجرات کے مستند اور مشہور ادیب اور اردو کے صاحب دیوان شاعر صابر بھاریانی مرحوم نے اپنی مطبوعہ گجراتی نظموں کے مجموعے میں دو مسدس (ایک جناب جوش سے متعلق اور ایک جناب نسیم سے متعلق) لکھے ہیں، اتفاق سے مجھے ایک دوست کے پاس یہ کتاب نظر آئی، بہت دیدہ زیب ہے، کھول کر دیکھا تو جوش اور نسیم کے فوٹو نظر پڑے، میں خود گجراتی نہیں پڑھ سکتا، اس لئے یہ نہ سمجھ سکا کہ ان بزرگوں کے متعلق کس نے اور کیا لکھا ہے؟ اپنے دوست سے یہ اجزا پڑھوائے اور سنے تو معلوم ہوا کہ یہ صابر بھاریانی مرحوم کی کتاب ہے اور انھوں نے مسدس کی صورت میں جوش اور نسیم کی شعری، ادبی اور علمی اہمیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ اس مسدس میں نسیم امروہوی کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

آل کی سیرت ہے تیری زندگانی کا چراغ — شمع کی مانند لَو دیتا ہے تیرے دل کا داغ
اہلیہ اور اک جواں بیٹا ہے محروم دماغ — جس کے باعث بد تر از صحرا ہے تیرے گھر کا باغ

وقفِ مدحِ آل ہے، با ایں ہمہ، تیرا وجود
خانہ داری اور ہجومِ شور و غل کے باوجود

— صاحب دل و نظر خود فیصلہ کریں کہ یہ نامساعد ماحول اور اس میں شعری تخلیقات کی جادوگری، اور یہ شعری کوششیں جو اپنی ہی ذات تک محدود نہیں بلکہ ان گنت شاعروں کے کلام کو سننا، اسے دیکھنا اور باریک نکات کو سمجھنا، یہ سب کچھ اسی پُر انتشار ماحول میں جس کی طرف صابر بھاریانی مرحوم نے اشارہ کیا ہے، جاری رکھنا ایک ایسا کارنامہ ہے جسے تاریخ ادب فراموش نہیں کر سکتی۔

نسیم امروہوی ۱۹۶۱ء سے کراچی میں مقیم ہیں یہاں ہر سال، قصیدہ، منقبت، سلام، نعت خوانی اور مرثیے کی صدہا محفلیں اور مجلسیں ہوتی ہیں۔ ان میں شاید ہی کوئی ایسی نشست ہوتی ہو جس میں نسیم امروہوی کے دبستانِ شعر و سخن سے مستفیض ہونے والے شعرا اپنے کلام کا سکہ نہ منواتے ہوں۔ ان میں کہنہ سال بزرگ بھی ہوتے ہیں اور جوان طبقہ بھی۔

نسیم امروہوی کی سرپرستی میں ۱۹۶۳ء سے جامعۂ امامیہ ناظم آباد نمبر ۲ میں جدید مراثی کی سالانہ مجالس کا انعقاد عمل میں آیا۔ ہر سال ان مجالس کا افتتاح انیسؔ کے مرثیے سے ہوتا ہے اور باقی سات مجلسوں میں مختلف شعرا اپنے جدید مراثی پیش کرتے ہیں اس طرح ۱۹۶۳ء سے لیکر ۱۹۷۳ء تک دس برس کی مدت میں اب تک ۷۰ نئے مرثیے پڑھے گئے جن میں چھ سات مرثیوں کو چھوڑ کر[عہ] کوئی مرثیہ ایسا نہیں

عہ جو ڈاکٹر یاور عباس، کوکب شادانی، کرار جونپوری، ضیاء الحسن موسوی اور سردار نقوی نے پیش فرمائے گئے

جس کو نسیم امروہوی نے شروع سے آخر تک پڑھ کر نظر ثانی نہ کی ہو، جدید مراثی کے اور بھی مراکز کراچی میں ہیں جو ایک طویل عرصے سے اردو مرثیے کے فروغ میں نمایاں خدمت کر رہے ہیں، ان مراکز میں پڑھے جانے والے بعض مراثی کی اصلاح کی ذمہ داری بھی نسیم امروہوی ہی پر ہے۔

جہاں تک میں تحقیق و جستجو کر سکا، مجھے اس قدر معلوم ہوا کہ نسیم امروہوی نے اصلاحِ سخن کا کام ۲۰ برس کی عمر سے انجام دینا شروع کیا۔ چنانچہ جب وہ فاضل ادب میں مولوی سید نورین احمد مرحوم کے ساتھ پڑھتے تھے اس وقت بھی مرحوم کے بڑے بھائی اور مشہور زمانہ مصور، صادقین صاحب کے والد گرامی جناب سید سبطین احمد صاحب سبطین جو کراچی کے مشہور منقبت گو اور تاریخ گو شاعر ہیں، نسیم صاحب ہی سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے اور غالباً آپ ہی وہ پہلے قصیدہ گو اور مرثیہ گو شاعر ہیں جن کی نگاہ نے نسیم امروہوی کی صلاحیتوں کو اب سے بہت پہلے پہچان لیا تھا۔ امروہے میں بہت سے بزرگ اور کہنہ مشق شاعروں کی موجودگی میں وہ برابر نسیم امروہوی سے مشورہ سخن کرتے رہے۔ جناب سبطین کے علاوہ کراچی کے مشہور شاعر قائم امروہوی نے اس زمانے میں بھی نسیم امروہوی سے استفادہ کیا تھا اور آج بھی شعر و سخن کے مشکل مرحلوں سے گزرنے کے لیے موصوف کی طرف رجوع کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور وہ اس کا ذکر بارہا مجالس و محافل میں کرتے رہتے ہیں۔

نسیم امروہوی کی یہ خدمات اپنے خاندان یا امروہے کے باشندوں تک، یا صرف مراثی اور قصائد کی اصلاح تک محدود نہیں، غزل کے صاحب دیوان شاعر بشیر درانی کے پورے دیوان "نادرات" پر نسیم امروہوی کی اصلاح ہے۔ اس کا اعتراف بشیر درانی نے اپنے دیوان نادرات میں اظہار تشکر کے ذیل میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"نسیمؔ امروہوی نے نادرات پر نظر ثانی کرنے کی زحمت گوارا کی اور اپنا قیمتی وقت صرف کر کے مجھے مطمئن کر دیا۔"

یہ بشیر درانی ہی ہیں جن کے بارے میں اس دیوان میں جگرؔ مراد آبادی لکھتے ہیں:

"زمانہ مدہوش کے بے شمار شاعر میرا ساتھ چھوڑ چکے ہیں یا یوں سمجھیے کہ میں نے اس زمانے کے بے شمار ملاقاتیوں کا ساتھ چھوڑ دیا ہے لیکن بشیر درانی نہ مجھے چھوڑ سکے اور نہ میں بشیر درانی کو۔"

بشیر درانی کو جگرؔ کا جانشین بھی کہا جاتا ہے۔

غزل کے ایک اور مشہور شاعر حضرت شاعر لکھنوی بھی نسیم امروہوی سے مستفید ہوئے، یہ بات اُس زمانے کی ہے جبکہ وہ لکھنؤ میں مقیم تھے۔

غزل کے صاحب دیوان شاعر صابر بھاریانی کے بارے میں بقول جوش ملیح آبادی "مرحوم فخر ماتری یہ کہا کرتے تھے کہ "یہ گجراتی شاعری کے امام ہیں۔" انھوں نے بھی نسیمؔ امروہوی کے سامنے زانوے ادب طے کیا اور ...۳ صفحات پر مشتمل "دیوان صابر" میں نشستِ الفاظ کی مماثلت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں نسیمؔ امروہوی کی توجہات کو کس حد تک دخل ہے، صابر بھاریانی مرحوم خود اس کے معترف ہیں اور اپنی اسی نظم میں جس کا ایک بند پہلے نقل کیا جا چکا ہے فرماتے ہیں:

میرے گلدستے پہ بھی تیرا بڑا احسان ہے   تیری اصلاحوں سے اس میں گلستاں کی شان ہے
تیرا ممنونِ توجہ میرا کُل دیوان ہے   تیرے ہی الفاظ کی برکت سے میری جان ہے

فکر کو میری انھیں الفاظ سے زینت ملی
ٹک گئے لفظوں کے موتی تاج کو عظمت ملی

صابر بھاریانی نے دو مرثیے جناب فاطمہؑ اور حضرت علی کی شان میں کہے ہیں۔ یہ تقریباً تین سو بندوں پر مشتمل ہیں جن میں تاریخی واقعات کو نظم کیا گیا ہے۔ ان پر

بھی نسیم امروہوی کی اصلاح ہے۔ "گلدستۂ عقیدت" مرحوم کے قطعات کا مجموعہ ہے جس میں کم وبیش چار سو قطعات حمد و نعت و منقبت کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ ان کے علاوہ تقریباً ایک سو قصائد غیر مطبوعہ ہیں۔ جو مرحوم کے صاحبزادگان جناب سلیم بھاریانی اور جناب منصور بھاریانی کے پاس محفوظ ہیں، یہ کل کلام بھی نسیم امروہوی کی اصلاح سے مشرف ہو چکا ہے۔

مرثیے کی دنیا میں نسیم امروہوی نے اتنے مرثیہ گو شاعروں کی تربیت فرمائی اور رہبری کی جس کا احصاء اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔ لکھنؤ میں نواب سجاد علی خاں اختر مرحوم بی اے بی ٹی اپنے قصائد اور مرثیے آپ کو دکھلاتے رہے۔ اجین میں ملا کیکا بھائی راحتؔ اس وقت تک اپنے مرثیے اور دوسرا کلام دکھلاتے رہے جب تک بھارت سے ارسال و ترسیل کی راہیں کھلی رہیں۔ سارنگپور مالوہ میں ملا احمد علی احمدؔ اب تک کسی نہ کسی ذریعے سے اپنے مرثیے اصلاح کے لئے بھیجتے ہیں۔ بنارس میں حکیم کاظم بنارسی نے ایک مرثیہ امام حسینؑ کے حال میں بحر رمل میں نسیم امروہوی کی ترغیب سے کہا اور اصلاح لی۔ ہزہائی نس رضا علی خاں مرحوم والی رامپور نے نسیم امروہوی کو لکھنؤ سے اپنے یہاں، پروفیسر شاداں بلگرامی مرحوم کی جگہ پر اسی غرض سے بلوایا تھا کہ مرحوم کو اپنے کلام کی اصلاح مدنظر تھی جو زیادہ تر قصائد، مناقب، نوحہ جات اور مختصر مرثیوں پر مشتمل تھا۔ پاکستان میں خیر پور ہز ہائی نس میر علی مراد تالپور کے چچا صاحبزادہ میر غلام حسن مرحوم نے اپنا زندگی بھر کا اردو کلام بغرض اصلاح نسیم امروہوی کو دکھایا اور اصلاح لی۔

ڈاکٹر منظور رائے پوری مرحوم

حضرت ناصر الملت مرحوم کی ہدایت کے مطابق ڈاکٹر سید منظور مہدی منظور

رائے پوری نے نسیم امروہوی کے سامنے زانوئے ادب طے کیا۔ ان کے مراثی کی جلد طبع ہو کر ۱۹۶۶ء میں ہمارے سامنے آ چکی ہے۔

مرحوم، رائے پور یو پی (انڈیا) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد گرامی سید اولاد حسین سجاد مرحوم پر گو شاعر تھے اور جلالؔ لکھنوی نیز ثاقبؔ مرحوم سے اصلاح لیتے تھے۔ منظور رائے پوری نے بیس سے زیادہ مرثیے کہے "شاہراہِ بلاغت" ان کا شاہکار مرثیہ ہے، جس میں تمام صنائع و بدائع کا انتہائی خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں لکھنؤ میں یہ مرثیہ ناظم صاحب کے امام باڑے میں پڑھا گیا جسے اہل علم نے بہت پسند کیا، اسی زمانے میں وہ نسیم امروہوی کے شاگرد ہو گئے اور یہ سلسلہ آخر حیات تک جاری تھا۔ مرثیہ کے علاوہ نعت، منقبت، سلام اور قصیدے بھی کافی تعداد میں کہے البتہ غزل کی طرف انھوں نے توجہ نہیں دی۔
منظور رائے پوری کے مرثیوں میں ربط و ترتیب کا بڑا لحاظ رکھا گیا ہے۔ تمام بند ایک سلسلے کی کڑی نظر آتے ہیں۔ تہذیب اخلاق و اصلاح کردار کا ساز و سامان خصوصیت کے ساتھ ان کے ہاں موجود ہے۔ ان کی مرثیہ نگاری کا اولین مقصد مذہب اور عقائد کی تقدیس و تمجید ہے فکر سادہ ہے لیکن جس نکتے کو پیش کیا ہے اس کے دلائل بھی دیئے ہیں، زبان و اسلوب بیان میں طرزِ نسیم کی جھلک ہے۔ ان کا مرثیہ "چشم مردم کے لئے نعمت رب ہے پردہ" منطقی اندازِ فکر کا ایک کامیاب نمونہ ہے۔ جس میں پردے کی ضرورت و اہمیت کو طرح طرح سے واضح اور ثابت کیا گیا ہے۔

ایک ہی قاعدۂ خلقِ دو عالم ہے عیاں — اصل بنیاد رہا کرتی ہے پردے میں نہاں
سارے اعضائے رئیسہ ہیں بدن میں پنہاں — دیکھیے خوں کی روانی نظر آتی ہے کہاں
چھپ کے ہر پیکرِ ذی روح میں جاں رہتی ہے
زندگی سانس تک پردے میں نہاں رہتی ہے

عاشق کیرانوی

ہندوستان سے پاکستان منتقل ہو کر جب نسیم امروہوی نے خیرپور میں قیام کیا تو وہاں بھی اصلاح سخن کی خدمات جاری رہیں۔ خیرپور کے نوخیز شاعر پیرزادہ سراج عثمانی المعروف عاشق کیرانوی نے جو غزل کے فطری شاعر ہیں نسیم امروہوی کی ترغیب سے مرثیے کہے اور غزلوں کی طرح مرثیوں پر بھی جناب نسیم امروہی سے اصلاح لی۔ عاشق کیرانوی کی شاعری کی عمر تقریباً بتیس برس ہے۔ چار کتابیں "زہر عشق، امام رازی، حضرت بو علی قلندر پانی پتی اور پہیلی بوجھ پہیلی" آپ کی شائع شدہ تخلیقات ہیں۔ دو کتابیں "مثنوی طلوع سحر" اور "مرقع شعر و شاعری" زیر طبع ہیں۔ عاشق کیرانوی پاکستان رائٹرز گلڈ کی مجلس عاملہ کے رکن اور پاکستان ریڈرز گلڈ کے چیئرمین ہیں۔ تجارت کتب ان کا پیشہ ہے:

صحن حرم میں جاؤں تو خود کو نہ پا سکوں　　تیری گلی میں آؤں تو دنیا دکھائی دے

موت لیکر تو چلی ہے عدم آباد مجھے　　راہ میں کوچۂ جاناں ہے کہو کیا ہوگا

انتہائے شوق میں آنسو بہانے کے لئے　　عید ہے عاشق کسی کی یاد آجانے کا نام

عاشق کیرانوی کے مرثیوں میں جرأت اخلاق، ولولہ اور جانبازی کا حوصلہ ابھر کر سامنے آتے ہیں:

نور خدا ادھر تھا، ادھر ظلمت تمام　　ظلمت بھی وہ دمشق میں ہر وقت جس سے شام
نمرودیت کی آگ بھڑکتی تھی گام گام　　وہ داغ یہ چراغ وہ فاسق تو یہ امام
یاں حق تھا سر بسر دل شاہ شہید میں
شیطان کا مزاج تھا قلب یزید میں

— عاشق کے یہاں زبان کا بھی لطف ہے اور بیان کا بھی۔ طرزِ ادا، پُر زور، پر اثر، اور دلآویز ہے، ان کے مرثیے کے بعض مصرعے خوبصورتی میں "منہ بولتی تصویر" بن گئے ہیں مثلاً ان کا مصرعہ:

ع منہ بولتی رسولؐ کی تصویر ہیں حسینؑ

حکیم محمد اشرف خاں اشرف

کہنہ مشق شاعر حکیم محمد اشرف خاں اشرف، مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے نواسے ہیں۔ دہلی سے منتقل ہو کر پاکستان تشریف لائے۔ ریاست خیرپور میں طبِ یونانی کے انچارج کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔ ریاستی علاقوں کے تقریباً بیس سے زائد سرکاری یونانی مطب کی نگرانی کرتے رہے۔ حال ہی میں ریٹائر ہوئے ہیں اور کراچی میں رہائش پذیر ہیں۔ نسیم امروہوی کی شاگردی کا شرف انھیں خیرپور میں حاصل ہوا۔ غزلوں کے پورے دیوان پر نسیم صاحب سے اصلاح لی۔ سلاموں کا بھی ایک مجموعہ مرتب کیا۔ مرثیہ گوئی کی طرف رجحانِ طبع نسیم امروہوی کی ترغیب و تحریک سے ہوا۔ مرثیہ کہا، بڑا خوب کہا۔ مطلع یہ ہے:

لازم نہیں انسان کو حذر بزمِ عزا سے — ماتم ہے یہ اُن کا جو نبیؐ کے ہیں نواسے
کیوں پھیرے منہ سبطِ رسولِ دوسرا سے — مظلوم سے بیکس سے غریب الغربا سے

قائل نہیں مولا کی جو منصوص ولا کا
امت وہ نبیؐ کی ہے، نہ بندہ ہے خدا کا

— تقریباً یہی موضوع مرثیے کا مرکزی خیال ہے۔ طرزِ قدیم کی جھلک ہر جگہ موجود ہے۔ مرثیے میں جس کا مطلع اوپر ہم نے لکھا، چہرے کے بعد شب عاشور کا منظر نظم کیا

ہے اور یہ بڑے دلنشیں پیرائے میں ہے۔ خوبصورت مصرعے جگہ جگہ ملتے ہیں:

ہم رنگ تھی آنکھوں میں سفیدی و سیاہی

پرواز کی طاقت بھی تو پرواز ہوئی تھی　　تاریکیٔ شب سرمۂ آواز ہوئی تھی

میر رضی میر

میر رضی میر کا شمار ان شاعروں میں ہے جو کہنے سے زیادہ پڑھنے کے انداز میں ایک خاص قسم کی شہرت رکھتے ہیں۔ کراچی کے جانے پہچانے اور دیکھے بھالے مرثیہ گو شاعر ہیں۔ انھوں نے اُس زمانے سے نسیم امروہوی سے اصلاح لینا شروع کی جب وہ خیرپور میں رہا کرتے تھے۔ آپ ہی کی ترغیب و تحریک سے مرثیہ گوئی کی طرف میر رضی میر کا رجحان ہوا، قطعہ اور سلام کہنے میں ان کا ایک مخصوص طرز ہے، جو نسیم صاحب کے رنگ اور ان کی اصلاح سے بے نیاز ہے۔ جس میں عوام پسند انداز نمایاں ہے۔ ابتدا میں میر رضی میر نے دو مرثیے نسیم امروہوی کو دکھلائے اس کے بعد عدیم الفرصتی یا فکر معاش کی وجہ سے یا ممکن ہے اپنے مرثیوں کو اصلاح سے بالاتر جان کر وہ اصلاح کے لئے نسیم امروہوی کی طرف رجوع نہیں ہوئے لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ میر رضی میر کا شمار اس حلقے سے ہے جو حضرت نسیم امروہوی سے گہری عقیدت رکھتا ہے۔ کوشش کے باوجود ان کا کلام دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ہم اس موقع پر نمونۂ کلام پیش نہیں کر سکے۔

اطہر جعفری

اطہر جعفری کا شمار ان مرثیہ گو شاعروں میں ہوتا ہے جو نسیم امروہوی سے

بہت ہی قریب رہے، اطہر مرحوم ۱۳ اگست ۱۹۰۷ء کو سادات جعفری کے ایک پُر وقار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان میں نسیم بہرسری، فضل رسول فضل، محمود الحسن محمود، وزیر حسن وزیر اور سید آل حسن جیسے متعدد مرثیہ گو شاعر پیدا ہوئے۔

اطہر جعفری نے ۱۹۲۳ء میں پہلا سلام کہا۔ اس کے بعد نعت، منقبت، سلام اور نوحے برابر کہتے رہے۔ جناب رئیس امروہوی کی تحریک اور مشورے سے ۱۹۶۱ء میں پہلا مرثیہ کہا اور انھیں کے ارشاد سے نسیم امروہوی کے شاگرد ہوئے، یہ مرثیہ اسی سال "گلدستۂ عقیدت" کے نام سے شائع ہوا۔

علی اطہر کے مرثیے پڑھ کر بیک نظر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان میں محنت اور مطالعے کو بڑا دخل ہے۔ جذبات نگاری، ڈرامائی عناصر، خوبیٔ زبان اور قدرت کلام کے نمونے جا بجا نظر آتے ہیں۔ وہ نفسیاتی کیفیات کو حسین شاعرانہ انداز سے پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ مثلاً حضرت عون و محمد حصول علم کے آرزومند ہیں اور علم سے کچھ دور کھڑے ہوئے مصروف گفتگو ہیں۔ مادر گرامی جناب زینب مصلے پر ہیں، جب سجدے میں جھکتی ہیں تو چپکے چپکے آگے بڑھ کر علم کو اٹھا کر دیکھتے ہیں۔ اس منزل پر علی اطہر نے انتہائی خوبصورتی کے ساتھ منظر کشی کی ہے:

ماں کو سجدے میں وہ جز اجو پالیتے تھے ۔۔۔ چپکے چپکے وہ علم جاکے اٹھا لیتے تھے

—— اب یہ انداز ملاحظہ فرمائیں جو دونوں بھائیوں کی گفتگو کا ہے۔

فتح کوفے سے ہوں فارغ تو کریں شام کو سر ۔۔۔ سر دربار جو واں ہم کو یزید آئے نظر
نذرِ شبیر کو بس کاٹ لیں اُس نحس کا سر ۔۔۔ ماں سے شاباش ملے شاہ سے انعام ظفر

ساتھ ہم دونوں کے ہر عاشق باری جائے
دھوم سے شام کو اماں کی سواری جائے

ماں نے سجدے میں جو بچوں کی سنی یہ گفتار — سر اٹھاتے ہی کڑی آنکھ سے دیکھا اک بار
غیظ کے ساتھ ہی طفلی پہ بھی آنے لگا پیار — سہم کر زیرِ علم رہ گئے دونوں جرار
آپ ہی اپنی جسارت پہ وہ شرمانے لگے
اشک بھی بہنے لگے جسم بھی تھرانے لگے

— انیس کا رزمیہ زور شور اور نسیم امروہوی کی زبان کی چاشنی۔ اطہر جعفری کے ہاں مزا دیتی ہے۔ رجز میں جاہ حشم ہے، مصرعوں میں روانی ہے، مصائب کا انداز اگرچہ پرانا ہے لیکن زبان کی سادگی نئی تاثیر پیدا کر دیتی ہے۔ نسیم امروہوی کا فیضِ صحبت ان کی مرثیہ گوئی پر شدت سے اثر انداز ہوا ہے:

جون ۱۹۶۳ء میں ڈاکٹر یاور عباس کے مکان پر جدید مراثی کی مجالس میں انھوں نے ایک مرثیہ "میں شمع فروزِ حرمِ مدحِ علی ہوں" پڑھا اس کے یہ چار بند دیکھیے جو نسیم امروہوی سے ان کی گہری عقیدت کے مظہر ہیں:

قسمت سے شباب ایسی فضاؤں میں گزارا — چمکا دیا پیری نے مرا اور ستارا
قدرت نے دیا ذوقِ سخن کو یہ سہارا — گھر بیٹھے ہوا فیضِ نسیمِ سخن آرا
ہر گام یہ جذبہ خضرِ راہِ سخن ہے
استاد مرا ماہرِ فن، شاہِ سخن ہے

وہ شاہِ سخن مالکِ اورنگِ معانی — مانی ہے بلاغت نے بھی جس کی ہمہ دانی
بحروں پہ عبور اس کو ہے اور قافیہ پانی — کوثر کی ہے موج اس کی طبیعت کی روانی
مداح ہے اور شاملِ فردِ شعرا ہے
عالم بھی ہے فاضل بھی ہے تخصیص جدا ہے

دل پایا ہے وہ پاک جو اخلاق کا قلزم — کھلتے ہوئے غنچے ہیں کہ اندازِ تکلم
اعدا کے جو دریائے حسد میں ہو تلاطم — سو زخمِ زباں کھا کے یہ فرمائیں تبسم
کیا کیا کہوں اوصاف خفی کب ہیں جلی ہیں
کافی ہے یہ اک بات کہ مداحِ علی ہیں

بنے فیض انھیں کا یہ ثنائے مشہ والا — جس سے مری تو قیر ہوئی آج دو بالا
قدرت نے ہے فطرت کو عجب سانچے میں ڈھالا — ہے مرثیہ خوانی مری آنکھوں کا اجالا
کچھ جبر ہے دل پر نہ یہاں نفس کشی ہے
غم میں بھی مجھے مدحتِ مولا سے خوشی ہے

فیض بھرتپوری

تلامذۂ نسیم امروہوی میں فیض بھرتپوری ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کے دادا بقیر مرحوم اپنے عہد کے جانے پہچانے مرثیہ گو شاعر تھے۔ والد گرامی کلیم بھی غزل، قصیدہ، مرثیہ اور دوسری اصناف میں طبع آزمائی کرتے تھے۔

فیض بھرتپوری نے ۱۹۲۸ء میں پہلی غزل کہی اور تقریباً ۳۴ برس تک اسی میدان کے شہسوار رہے۔ ۱۹۶۲ء میں کراچی میں پہلا مرثیہ کہا، اور نسیم امروہوی سے اصلاح لی یہ سلسلہ اب تک باقاعدگی اور پابندی کے ساتھ جاری ہے۔ ان کے پانچ مرثیوں کی ایک جلد سید نائب حسن نقوی کے مقدمے کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

فیض بھرتپوری کے مرثیے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی فکر پر نسیم امروہوی کے فیضِ تربیت کا گہرا اثر پڑا ہے، چنانچہ وہ خود کہتے ہیں:

ایک تو خود برکت مرثیہ گوئی کی قدیم
دوسرے پھر مرے استاد کا فیضِ تعلیم
کیوں رہوں چپ رہِ حق میں کہ ہوں فرزندِ کلیم
چمنِ فیض ہے پروردۂ الطافِ نسیم
پھول چنتا ہی چلا جاتا ہوں گلزاروں سے
میں نہ الجھا ہوں نہ الجھوں گا کبھی خاروں سے

انیس نے کہا تھا: "ناقدریِ عالم کی شکایت نہیں مولا"
اور شکایت کی تو یہ کی:

عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے
اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

فیض بھرتپوری یہاں بھی یہ آواز بدلے ہوئے لہجے میں ملتی ہے:

طالبِ داد نہیں طالبِ انصاف ہوں میں

فیض کے یہاں ذکرِ کربلا میں نئی فکر ہے۔ اس بیان میں نئی آواز اور نئے احساسات ہیں:

ثابت قدم رہو یہ بتاتی ہے کربلا — حریتِ خیال سکھاتی ہے کربلا
باطل کو حق کی راہ دکھاتی ہے کربلا — قدروں کا امتیاز مٹاتی ہے کربلا

فیض نے کئی مرثیے لکھے لیکن "پانی" کے موضوع پر ان کا شاہکار مرثیہ ہے۔ ان کے ہاں تلوار کے بیان میں نیا انداز اور لفظوں کی نئی نشست ہے:

"اس کے قبضے میں تن و سر کا ہے قانونِ فراق" تلوار کی جامع تعریف ہے۔

نائب حسن نقوی امروہوی "مراثی فیض کے مقدمے" میں لکھتے ہیں:

"فیض کے یہاں شوکتِ الفاظ، بندش کی چستی، ندرتِ مضامین، روایات، اصطلاحات، ضرب الامثال، محاورات، روزمرہ، صنائع بدائع کا حسنِ امتزاج ہر جگہ ملتا ہے، ساتھ ہی ڈرامائی عنصر اور مکالمہ بھی ہے۔ اسلوبِ بیان میں انوکھا پن ہے۔ الفاظ زیادہ تر آسان استعمال کرتے ہیں، مشکل مسائل کو بہ سہولت سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ عام گھڑے ہوئے مبتذل الفاظ سے پرہیز کرتے ہیں، ساتھ ہی شریعت کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ رونے رلانے کا سامان بھی خاصا موجود ہے، اور یہ سب خصوصیات آپ کو اپنے استاد کی پرخلوص تاسی سے میسر آئی ہیں۔"

بدر الہ آبادی

بدر الہ آبادی نسیم امروہوی کے شاگرد ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے حلقۂ احباب میں بھی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ بدر پہلے غزل اور قصیدہ کہتے تھے، آپ کا مجموعہ کلام سو سے زیادہ قصیدوں پر مشتمل ہے، جن میں سے بیشتر پر نسیم سے اصلاح لے چکے ہیں۔ ۱۹۶۱ء سے مرثیہ کہنا شروع کیا۔ ہر سال ایک مرثیہ کہتے رہے، مگر طبیعت کی خرابی کے سبب یہ سلسلہ پچھلے دو سال سے ٹوٹ گیا ہے۔ بدر الہ آبادی کے مرثیے میری نظر سے گزرے جنھیں پڑھکر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے مرثیوں کی اٹھان نئی بنیادوں پر ہے، زبان و بیان میں نسیم امروہوی کا رنگ مختلف انداز سے سامنے آتا ہے۔ طرز ادا سرسری یا سادہ نہیں بلکہ فکری اور منطقی اسلوب کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے مرثیوں میں غم، نشاط ابد کا پیام بن گیا ہے:

؎ یہ غم نہیں نشاطِ ابد کا پیام ہے　　　اس غم کے ساتھ موت حیاتِ دوام ہے

کشمکش، جد و جہد، کاوش و سعی، اور جستجو ان کے یہاں ایک مستقل جہاد کی صورت میں ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اس تگ و دو اور کشمکش پیہم میں زندگی کا راز پنہاں ہے:

یہ کشمکش یہ جہد، یہ کاوش یہ جستجو　　　عینِ حیات و باعثِ تکمیلِ آرزو
جس سے ہے ذرے ذرے میں ہنگامۂ نمو　　　اک مستقل جہاد ہے دنیائے رنگ و بو

کانٹوں کو چاہ ہے گل رنگیں عذار کی
غنچوں کو آرزو ہے نسیم بہار کی

——ان کے یہاں مکالمے بھی ہیں، ڈرامائی کیفیت بھی، جذبات نگاری بھی، مگر ان سب میں کہیں تقلیدی اور کسی حد تک اپنا رنگ ہے۔ رزم میں انیس سے

متاثر ہیں۔ تلوار اور گھوڑا اسی رنگ میں رنگے ہوتے ہیں، زبان، نسیم اسکول کی ہے۔ کہیں کہیں تغزل کا رنگ بھی ہے۔ مصائب میں روایتی باتیں اور جانے پہچانے الفاظ ملتے ہیں مگر اجتماعی طور پر مرثیہ ایک اچھا تاثر دیتا ہے۔

حسن علی سرفراز

حسن علی سرفراز کا تعلق بمبئی سے ہے۔ اکاؤنٹس کے آدمی ہونے کے باوجود شعر و ادب سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ گجراتی زبان کی شاعری میں تھڑیانی مرحوم کے ہم پلہ خیال کئے جاتے ہیں۔ پانچ مرثیے گجراتی زبان میں کہے، جو حضرت امام حسینؑ، حضرت مسلم، حضرت علیؑ، حضرت عباسؑ اور آل محمدؐ کے مصائب سے متعلق ہیں۔ اردو مرثیے کی طرف ان کے دھیان میں نسیم امروہوی کو بہت بڑا دخل ہے۔ پانچ سال قبل جامعہ امامیہ ناظم آباد میں انھوں نے اپنے تصنیف کردہ اردو مرثیہ جس میں حضرت ابوذر کے حالات ہیں، اپنی علالت کے باعث جناب مولانا سید مسعود الحسن نقوی صاحب سے پڑھوایا تھا۔ اس مرثیہ پر جناب نسیم امروہوی سے اصلاح لی تھی۔

حسن علی سرفراز کے بیان میں جدت و ندرت کا احساس ابتدا ہی سے ہونے لگتا ہے، ان کے مرثیے میں جگہ جگہ ان کی عقیدت مندی جھلکتی ہے۔ زبان میں ایسی سلاست ہے جسے سن کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آپ بمبئی کے باشندے ہیں، بیان میں زور ہے۔ پہلے مرثیے کے بعد دوسرا جناب امام حسینؑ کے حال میں کہا جو اصلاح سے مشرف ہو چکا ہے:

قرآں کی جاں صحیفۂ رحمت حسینؑ ہیں   روز جزا سدا شفاعت حسینؑ ہیں
مختار کارخانۂ قدرت حسینؑ ہیں   پشت و پناہ اہل قیامت حسینؑ ہیں
غم کیا جو اپنا نامۂ اعمال زشت ہے
مولا کا مجھ کو سایۂ اماں بہشت ہے

قرآں کی زیب و زین، وصی رسولِ حق کنزِ خفی، صحیفۂ توحید کے ورق
اخلاص کی اساس تو بنیادِ صدق و حق مختارِ خلق، فخرِ رسولانِ ماسبق

یہ ابتدائے عصر ہیں پایانِ وقت ہیں
تختِ یداللّٰہی کے سلیمانِ وقت ہیں

ان کا کرم ہے بابِ گلستاں کا افتتاح ہر صبح ہے درود سے غنچوں کا انشراح
کلیاں چٹک کے کہتی ہیں پیہم علی الصباح حی علی الصلاح و حی علی الفلاح

صادق یہاں حدیثِ رسولِ حجاز ہے
اول ولائے آل ہے آخر نماز ہے

اصغر رضوی

تلامذہ نسیمؔ امروہوی میں اصغر بہرسری بھی بزرگ مرثیہ گو شاعر ہیں۔ ان کے دادا مولوی سید محمد علی گڑھ میں دینیات کے مدرس تھے اور حضرت ناصر الملۃ کے پدر بزرگوار جناب مولوی حامد حسین صاحب قبلہ (طاب ثراہ) صاحب عبقات کے ہمعصر تھے۔ "مثنوی منشور غدیر" مرحوم کا شاہکار ہے جس میں دس ہزار اشعار ہیں اور یہ فارسی زبان میں ہے۔ علامہ رشید ترابی مرحوم کے کتب خانہ میں اس کا نسخہ موجود ہے۔

اصغر بہرسری کے والد سید سجاد حسین بھرتپور میں سیشن جج تھے۔ جنوری ۱۹۰۸ء میں اصغر پیدا ہوئے، سینٹ جونس کالج آگرہ اور علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے خاندان میں باکمال مرثیہ گو شعرا گزرے ہیں جن کا ذکر اطہر جعفری کے حالات میں ہم نے کیا ہے۔ اصغر بہرسری علی اطہر مرحوم کے قریبی عزیز ہیں۔

۱۹۲۰ء سے غزل گوئی شروع کی مگر والد کے ٹوکنے پر ۱۹۲۹ء میں ترک کر دی۔

۱۹۳۰ء سے منبر پر باقاعدگی سے انیسؔ کے مرثیے پڑھتے رہے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

دس برس اُدھر کی بات ہے جبکہ حضرت نسیمؔ امروہوی، اصغر یرسری کے مکان (واقع عزیز آباد) کے پڑوس میں آکر مقیم ہوئے تو رجحانِ طبع کو دیکھ کر موصوف نے اصغر صاحب کو مرثیہ کہنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ انھوں نے چار مرثیے کہے اور نسیمؔ امروہوی سے اصلاح لی۔ ان چاروں مرثیوں کے مطلعے یہ ہیں: (۱) میں نخل بندِ گلشنِ توصیف آل ہوں" (۲) "اے طبع نور بار دکھا آب وتابِ نظم" (۳) "بھائی کی موت دوسرے بھائی سے پوچھیے" (۴) "ہجرت ہر ایک قوم کی تازہ حیات ہے" یہ چاروں مرثیے میری نظر سے گزرے بہت اچھے ہیں، مگر آخرالذکر مرثیہ اُن کا شاہکار ہے۔ اس کے ابتدائی بندوں میں ہندوستان سے پاکستان کی طرف آنے کے واقعے کو بڑی خوبصورتی سے نظم کیا گیا ہے انیسؔ کے رنگِ سخن، زورِ بیان اور طرزِ ادا کے عاشق ہیں انھوں نے انیسؔ کی بات کو "ادب کی حدیث" کے نام سے یاد کیا ہے: فرماتے ہیں کہ انیسؔ کا شعر:

ع قولِ خدا = شاہِ عرب کی حدیث ہے
لیکن جو کہہ دیا ہے ادب کی حدیث ہے

اصغر یرسری کے گلدستۂ سخن کی رنگینیوں اور بندشوں میں نسیمؔ امروہوی کی تربیت کو بڑا دخل ہے:

گلدستۂ سخن کی جو بندش ہے پُر بہار ہے تربیتِ نسیمؔ کی ہر گُل سے آشکار

انیسؔ و نسیمؔ دونوں کے مشترکہ رنگ سے وہ فیضیاب ہیں:

ع ہوں فیض یاب رنگِ جدید وقدیم سے
جادہ ملا انیسؔ کا مجھ کو نسیمؔ سے

اصغر یرسری کے یہاں بیان کی ندرت، زبان کی چاشنی الفاظ و معانی کی

شوکت اور اسلوب کا نکھار خوبصورت انداز میں موجود ہے۔ مصائب واقعاتی طرز کے ہیں۔ مانوس بند شیں سننے میں آتی ہیں لیکن بیانِ رزم میں انوکھا پن اور جدیدیت ہے۔ کئی بندوں کا نمونہ پیش کرنے کی بجائے ان کی ایک بیت لکھتا ہوں جو انتہائی سلیس اور جنگ کے کافی تاثرات سے بھرپور ہے:

منہ سرخ ہو گیا کہ لہو جوش کھا گیا
زورِ علی سمٹ کے کلائی میں آگیا

عروج بجنوری

عروج بجنوری ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید قائم حسین قائم بجنوری بھی شاعر ہیں، عروج نے ابتداء میں انھیں سے اصلاح لی، بعد میں استاد قمر جلالوی مرحوم سے فیض حاصل کیا۔ سنہ ۶۳ء سے نسیم امروہوی کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہوئے اور اُس وقت سے آج تک مسلسل انھیں سے اصلاح لیتے ہیں، اور موصوف کے تلامذہ میں کافی شہرت رکھتے ہیں عموماً مدحیہ قطعات، سلام نوحے منقبتیں اور گاہے غزل کہتے ہیں۔ دو مرثیے بھی کہہ چکے ہیں۔ بحروں کے انتخاب کے وقت شعر میں موسیقیت پیدا کرنے کا پہلو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ ردیفیں عموماً طویل اور مشکل ہوتی ہیں۔ تغزل کا رنگ بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ ان کے مرثیے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فکر کے مقابلے میں زبان کی لطافت کو ترجیح دیتے ہیں اکثر تراکیب عام روش سے ہٹ کر استعمال کرتے ہیں، جدید رجحانات اور جدید تقاضوں کی فضا سے بھی کافی متاثر ہیں۔

"ازل سے عشق کا پرچم اڑا رہی ہے وفا" آپ کے ایک مرثیے کا مطلع ہے اس کے چہرے کا خلاصہ یہ ہے کہ 'وفا' نظامِ ہستی کی روحِ رواں ہے اور یہ نقدِ جاں کے عوض

بھی مل جائے تو سستی ہے:

وفا بہارِ گلستانِ حق پرستی ہے — وفا ہی روحِ دورانِ نظامِ ہستی ہے
بساط ہے یہ اسے جس کے دل میں بستی ہے — یہ نقدِ جاں کے عوض بھی ملے تو سستی ہے

سقربانِ خدا میں ہے کاروبار اس کا
وہ جنس ہے کہ خریدار کردگار اس کا

وفا۔ نئی حیات کے لئے فکر و نظر کی قسمت بیدار بن کر ان کے یہاں ابھرتی ہے:

وفا کی قسمتِ بیدار جس بشر کو ملی
نئی حیات خیال و دل و نظر کو ملی

"وفا" کا تصور ان کے یہاں اتنا عام نہیں کہ اس سے ہر ایک فیض یاب ہو سکے:

ہر ایک دل کو ملی ہے نہ ہر جگر کو ملی
جہاں میں چند ہی افرادِ معتبر کو ملی
وفا شعار ہزاروں میں ایک ہوتا ہے
مہ تمام ستاروں میں ایک ہوتا ہے

وفا کی یہ تصویر مرثیے کے علاوہ ان کے قطعوں میں بھی ملتی ہے:

وفا کی گرمیٔ بازار کو نہ چھین سکا
عمل کی عزم کی تلوار کو نہ چھین سکا
بزور چھین لیا گو یزید نے سب کچھ
مگر حسینؑ کے کردار کو نہ چھین سکا

جمیل نقوی

جمیل نقوی کا تعلق سادات امروہہ سے ہے۔ آپ نے آگرہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا ہے۔ عربی، فارسی اور یونانی زبانوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔

جمیل نقوی کی کئی تالیف و تصانیف ہمارے سامنے موجود ہیں: "انتخاب اصغر، انتخاب میر، انگریزی ناول کا ترجمہ، عمر خیام، نعتوں کا مجموعہ، ذکر جمیل، قومی نغموں کا مجموعہ، پرچم کا ہلال جگمگایا اُن کی تخلیقات ہیں، دو شعری مجموعے کف خاکستر اور بازگشت زیر طبع ہیں، ان کے علاوہ بہت سے تاریخی اور ادبی مضامین اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

جمیل نقوی مرثیے میں نسیم امروہوی سے تلمذ رکھتے ہیں۔ ان کے مرثیے کا انداز روشِ عام سے کسی حد تک ہٹا ہوا ہے اور حمد، نعت و منقبت ان کے ہاں جزو مرثیہ ہے مدحیہ پہلو میں بھی وہ فکری عناصر کے ساتھ چلتے ہیں۔ جذبات نگاری، ڈرامائی عناصر اور مکالمہ ان کے یہاں نہیں ملتا۔ البتہ بیان کا وہ زور نمایاں ہے جو دل کی بات سمجھانے اور منوا لینے کا ضامن ہے:

امت کی رہبری میں ضروری ہے اک امام   ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں ایمان کی زمام
پاتے ہیں فیض جس کی توجہ سے خاص و عام   خالی ز مصلحت نہیں یہ حسنِ انتظام
تشریح کو رسول و خدا کے کلام کی
ہر دور میں رہی ہے ضرورت امام کی

جمیل نقوی کے یہاں ذکر مصائب طرز روشِ عام سے ہٹ کر اس راستے پر آجاتا ہے جہاں مرثیے کا یہ حصہ بھی فکری رخ اختیار کر لیتا ہے۔ ان کے یہاں آنسوؤں کے ساتھ جذبات کا وہ دھارا بھی ہے جو عقل و دل کے توازن سے ابھرتا ہے۔ معرکۂ رزم کے

بیان میں "مظلومیت کی تیغ" اور "ایثار کی سپر" ان کے یہاں ملتی ہے:

وہ یادگار معرکۂ رزمِ خیر و شر　　نرغہ کئی ہزار کا تنہا حسینؑ پر
وہ اسلحۂ امام کا خود مژدۂ ظفر　　مظلومیت کی تیغ تو ایثار کی سپر
دفن و کفن کی فکر، نہ ساماں تھا قبر کا
دشمن بھی زود دیادہ تصرف تھا صبر کا

یاور اعظمی

نسیم امروہوی کے تلامذہ میں یاور اعظمی خاصی شہرت رکھنے والے، مرثیہ گو شاعر ہیں۔ انھوں نے اب تک کل آٹھ مرثیے کہے ہیں۔ میر انیس اور نسیم امروہوی کا مشترک رنگ ان کے ہاں ایک نئے رنگ سے جلوہ گر ہے، ان کے مصرعوں میں برجستگی اور روانی ہے۔ زبان و بیان کا لطف پُر تاثیر ہے رزم کے بیان میں انیس کی ولولہ خیزی کا پرتو نظر آتا ہے:

یہ سن کے فرطِ غیظ سے تھرائے باوفا　　قبضہ پہ ہاتھ ڈال کے ہر شیرِ نر بڑھا
للکار کر یہ ثانیِ حیدر نے دی صدا　　خیمہ ہٹاؤ تم۔ یہ تمہاری مجال کیا
بے فائدہ اڑو گے جو چھوٹی سی بات پر
دریا بہے گا خون کا نہرِ فرات پر

یاور اعظمی کے یہاں رجز میں بہت زور ہے بیان میں نئی ترکیبوں کا استعمال یہی نظر آتا ہے:

اے فوجِ ستمگر میں جری ابن جری ہوں　　دشمن کے لئے پنجۂ آشفتہ سری ہوں
ضیغم ہوں مگر ظلم و تشدد سے بری ہوں　　میدانِ وغا میں نگہِ دیدہ وری ہوں
سایہ ہے مرے سر پہ ولی ابن ولی کا
بندہ ہوں میں درگاہِ حسینؑ ابن علی کا

یاد اعظمی کے یہاں میدان کارزار اور اس کے لوازمات کا بیان تفصیل ملتا ہے۔ ذکر مصائب کا انداز بیانیہ اور روا تعاتی ہے اور کسی حد تک تقلیدی۔ ان کے یہاں فکری پہلو سنجیدہ اور مربوط ہے۔

زائر امروہوی

آباد محمد زائر امروہوی، کراچی کے مشہور سوز خواں ہیں ان کے اسی شوق نے انھیں شعر کہنے کی طرف مائل کیا، چٹاگانگ میں مولانا محمد احمد صاحب عابدی مرحوم نے ۱۹۶۳ء میں مدح گوئی میں مشق سخن کرائی۔ ۱۹۶۵ء سے مرثیے کی طرف رجحان ہوا اور اسی سال مرثیہ کہا۔ مولانا محمد احمد مرحوم کے مشورے سے نسیم امروہوی سے اصلاح لی۔ میری نظر سے ان کے دو مرثیے گزرے:

(۱) جب سر تے نہر بازوئے شاہ امم چلے (۲) پھر نماز صبح جو شکل کشا چلے

یہ مرثیے اگرچہ دیکھنے میں مختصر ہیں لیکن حاضر میں کم نہیں۔ زائر امروہوی اپنے حالات میں لکھتے ہیں کہ:

"انیس کے بعد جس کا مطالعہ میں نے سب سے زیادہ کیا وہ نسیم امروہوی ہیں"

انہوں نے بالکل صحیح فرمایا اس کا ثبوت ان کے مرثیوں کے مطالعے سے ملتا ہے۔ زائر امروہوی اس حد تک نسیم امروہوی سے متاثر ہیں کہ جگہ جگہ ان کا رنگ جھلکتا ہے۔ استادکی کھلی ہوئی تقلید ہے اور اس تقلید پر انھیں فخر ہے۔ مصائب پر زیادہ زور دیا ہے لیکن رزمیہ حصے بھی سست نہیں۔

وہ شوکتِ علم وہ علمدار ذی وقار — دریا کی چاہ میں صفتِ موج بے قرار
عزمِ جہاد گو کہ نہ تھا دل میں زینہار — آئے جو تیر، تن کے بڑھے پیر کارزار

رعب جری سے دم میں لگی خیرہ سر ہوئے
تلوار کیا کھینچی کہ فنا اہل شر ہوئے

سالک نقوی

سالک نقوی نہ صرف کراچی بلکہ پاکستان کے مشہور قصیدہ گو شاعر ہیں، ہندوستان میں بھی ان کے اشعار جگہ جگہ پڑھے جاتے رہے ہیں۔ پرانے لکھنے والوں میں ہیں۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں شاعری شروع کردی تھی۔ اسی زمانے میں عزیز لکھنوی مرحوم سے تلمذ رہا۔ حیدرآباد دکن میں راجا کشن پرشاد کے مشاعروں میں برابر شرکت کیا کرتے تھے۔ ان مشاعروں میں جوش، فانی، تراب یار جنگ اور عزیز یار جنگ وغیرہ بھی شرکت کرتے تھے۔

سالک نقوی کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا کر حضرت نسیم امروہوی نے انھیں مرثیہ کہنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ انھوں نے اس میدان میں قدم رکھا اور انتہائی کامیابی سے اب تک آگے بڑھ رہے ہیں۔

نسیم امروہوی کے طریقۂ اصلاح کی خوبی سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنا کل کلام بغرض اصلاح پیش کیا اور جیسے جیسے اصلاح ہوتی جارہی ہے اسے شائع کراتے جاتے ہیں۔

نعتوں، منقبتوں اور قصائد کا مجموعہ "یادِ حرمین" مئی سن ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا اس مجموعے میں مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ کے شعائر اور سرورِ کائنات سے متعلق نظمیں بھی ہیں۔

سالک نقوی کے اشعار جذبات وارفتگی سے معمور ہیں۔ ان کی شاعری میں ان

کا دل دھڑکتا ہے کیونکہ یہ ان کے کلام کی پختگی کی ضمانت بن گئی ہے۔ غزل کی ادا دو بیانی اور تغزل کی چاشنی ان کے نعتیہ کلام میں نو بہ نو انداز سے موجود ہے:

کسی کی اک نگہہ غم نواز کی خاطر — متاعِ حسرتِ ہستی لٹائے بیٹھا ہوں
کبھی تو بادِ بہاری ادھر سے گزرے گی — اسی امید میں آنکھیں بچھائے بیٹھا ہوں

سالک نقوی کے کلام میں جو روانی اور تسلسل ہے وہ ان کا اپنا حصہ ہے:

نظر میں جلوۂ بیت الحرام لایا ہوں — منیٰ کی صبح، مدینے کی شام لایا ہوں
خارِ ہستیِ فانی سے تنگ آیا تھا — سے بشارتِ عمرِ دوام لایا ہوں
رواق و صحنِ حرم سے لپٹ کر دل میں — تجلّیِ شبِ ماہِ تمام لایا ہوں
بہ فیضِ ساقیِ میخانۂ حرم سالک — شعورِ بادۂ دمینا و جام لایا ہوں

سالک نقوی کے یہاں مرثیوں میں بھی ان کا اپنا رنگ ہے، نئے اندازِ بیان سے مرصع:

اُف وہ پنجے کی شعاعوں کا تزلزل عالم — ندیہ آئے تو جھلس دیں نگہہ نامحرم
شک لگی ہوں کاندھے پہ بعد جاہ و حشم — سنگِ اسود کی طرح زیبِ درِ رکنِ حرم

قدسیوں میں یہ تقاضا ہے غلُّ ابرِ کرم آتا ہے
زمزمی بھرنے کو سقائے حرم آتا ہے

ہلال نقوی

قیام پاکستان کے ایک سال بعد ۱۹۴۸ء میں راولپنڈی میں پیدا ہوئے پچھلے ۱۸ برس سے کراچی میں مقیم ہیں۔ اردو ادب کے ایم اے اور سراج الدولہ کالج کراچی میں اُردو کے لیکچرار ہیں۔ آج کل اردو مرثیہ پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔

تلامذہ نسیم امروہوی میں ہلال نقوی سب سے کم عمر ہیں اور غالباً اس دور میں برصغیر ہند و پاک کے سب سے کم عمر مرثیہ گو شاعر۔ شعر گوئی کی عمر صرف ۷ برس ہے لیکن

اس قلیل مدت میں جو نام پیدا کیا وہ کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

ہلال نقوی مرثیہ کے علاوہ نظم جدید کے بھی شاعر ہیں۔ ۵۰ بند پر مشتمل بالکل تازہ ترین مسدس "سقتل و مشعل" اس سلسلے کی کڑی ہے۔ شروع میں حضرت جوش ملیح آبادی سے قرب حاصل تھا۔ کالج کے ابتدائی زمانے میں ہلال نے پانچ نظمیں لکھیں: سیلابِ نفرت، اقوام متحدہ کے نام، جامن کے تلے، اور اے عصرِ نو کے نوجوان ——

جوش ان نظموں کے متعلق لکھتے ہیں:

"ہلال نقوی ہمارا ایک ایسا نوجوان شاعر ہے جس سے مستقبل کی امیدوں کو وابستہ کیا جا سکتا ہے، ہلال کے سینے میں آگ ہے لیکن ابھی اس آگ کو اور ہوا دیں۔"

۱۹۷۱ء میں ہلال نقوی نے پہلا مرثیہ کہا۔ زبان و بیان کی کمزوریوں کو محسوس کرتے ہوئے جوش کو اصلاح کے لئے مرثیہ پیش کیا، لیکن جوش کے ایما و اشارے پر نسیم امروہوی کی طرف رجوع ہوئے۔ ہلال نے اب تک پانچ مرثیے کہے۔ ان کے پہلے مرثیہ "انقلابِ عزم و عمل" کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فطرتاً انقلابی احساسات سے بھرپور مزاج رکھتے ہیں۔ انگریزی ادب کے مشہور نقاد، اور شعبۂ انگریزی بلوچستان یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر احسن فاروقی "انقلاب عزم و عمل" کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

"ہلال نقوی کا مسدس انقلابِ عزم و عمل اسی قسم کی جدید نظم میں اہم اضافہ ہے جو مراثی انیس اور مسدس حالی کے امتزاج سے اس وقت ظہور میں آ رہی ہے اس مسدس میں، مسدس حالی کی طرح عصرِ جدید پر تنقید کی گئی ہے، اس تنقید میں اُن خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے جو حالی کی سمجھ سے بہت دور تھے اور جن کی مثال اقبال کے ایسے مسدسوں میں ملتی ہے جیسے شکوہ و جواب شکوہ، ہلال نقوی فکر کے نقطۂ نظر سے ترقی پسندوں کے ساتھ ہیں اور سرمایہ داروں کی خرابیوں پر سخت تنقید کرتے ہیں جو مصلح

ہیں اور انقلاب لانا چاہتے ہیں۔ فن کے نقطۂ نظر سے یہ نظم بچی شاعرانہ قوتوں کا مظہر ہے یہ مسدس ہلال نقوی کی اگرچہ پہلی نظم ہے مگر اس میں زبان پر قابو، مضامین کی فراوانی، عروضی صفات کی دلکشی یہ ثابت کرتی ہے کہ ان میں شروع ہی سے کہنہ مشقوں کی سی پختگی موجود ہے۔"

اس مرثیے کے بارے میں مشہور شاعر و نقاد اور شعبہ اردو جامعہ کراچی کے پروفیسر منظور حسین شور لکھتے ہیں کہ:

"یہ مرثیہ ملک کے جواں فکر اور جواں سال شاعر ہلال نقوی کی ایک ایسی تخلیق ہے جو ایک ہی وقت میں فن کی ایک قابلِ قدر تخلیق بھی ہے اور اخلاقی نقطۂ نظر سے انتہائی بصیرت افروز نظم بھی۔"

ڈاکٹر یاور عباس رقمطراز ہیں کہ

"اس نو عمری میں جس سلیقے سے ہلال نقوی نے مرثیہ کہا ہے اس کی داد دینا پڑتی ہے۔"

ہلال نقوی کے سلاموں کا ایک مجموعہ "چشم نم" پروفیسر مجتبیٰ حسین (صدر شعبۂ اردو جامعۂ بلوچستان) کے تعارف اور جوش کے پیغام کے ساتھ ۱۹۷۰ء میں سامنے آیا۔

"رجز نامے" کہنے کا ایک موثر انداز ان کے یہاں ملتا ہے ان کے تین رجز نامے قبولِ عام کی سند حاصل کر چکے ہیں:

(۱) جا کے کہہ دو کہ دریا پہ ہم آتے ہیں

(۲) میں علی کا شیر ہوں فاطمہ کا لال ہوں

(۳) عباس میرا نام ہے اے فوجِ روم و شام

ہلال نقوی کی شاعری ان کی فکر سے علیٰحدہ نہیں۔ ان کی شاعری میں صرف دل ہی نہیں، بلکہ دماغ بھی ہے، ایک نئی آواز ہے، نئے احساسات میں نیا مقام ہے

اور نئے راستے ہیں۔ ان کے یہاں مسلمانوں کی تباہی پر احساس غم ہے اور دین فروش ملاؤں کے خلاف جوشِ غضب بھی۔ سرمایہ داروں کے خلاف غصہ بھی ہے اور مزدوروں کی حمایت میں تائیدِ قلب بھی، جنگ و امن دونوں کی نئی نئی تعبیریں ان کے ہاں ملتی ہیں؛

جنگ کثرت کا تجبر، طاقت ظلم شدید　　　امن قدرت کا تحمل، صبر مظلوم سعید

جنگ آمر کا تسلط، مرضیٔ شمر و یزید　　　امن، مومن کی تمنا، خواہشِ قلب شہید۔

جنگ دولت کی سوئی سے دو نوں لب سِلنے کا نام

امن مزدوروں کی اجرت وقت پر ملنے کا نام

مختصر یہ کہ ہلال نقوی تلامذہ نسیم امروہوی میں ایک ایسے شاعر ہیں جو مستقبل میں ایک زندہ و بیدار شاعر کی حیثیت سے اردو ادب کا سرمایہ بن سکتے ہیں۔

قسیم امروہوی

نسیم امروہوی کے منجھلے صاحبزادے قسیم امروہوی نے سالِ گزشتہ پہلا مرثیہ کہا اس سے قبل تقریباً چھ برس سے وہ سلام اور منقبتیں کہتے رہے۔ جامعہ امامیہ ناظم آباد نمبر ۲ میں انھوں نے پچھلے سال اپنا پہلا مرثیہ پڑھا اور اس طرح وہ بقولِ انیسؔ یہ کہنے کے حقدار ہو گئے:

ع　پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

قطع نظر اس کے کہ وہ نسیم امروہوی کے صاحبزادے ہیں ان کا شمار تلامذۂ نسیم امروہوی میں بھی ہوتا ہے، کیونکہ وہ باقاعدگی سے اپنے "استاد" سے اصلاح لیتے ہیں۔

قسیم امروہوی کا پہلا مرثیہ: "عزت سے گر بسر ہو تو نعمت ہے زندگی" پہلے میں نے ان کی زبان سے سنا اور پھر ان سے لے کر اپنے مقام پر بغور پڑھا، امن و جنگ، زندگی کے یہ دونوں پہلو ان کے مرثیے میں ملتے ہیں:

حسب عمل ہے مقصدِ تعمیرِ زندگی
ہر صلح زندگی کبھی شمشیرِ زندگی

زندگی کے اس بیان میں مذہبی عقائد پیش پیش ہیں:

ایک معرفت کی ہے اور ظرف پانچ ہیں
لفظ ایک زندگی ہے مگر حرف پانچ ہیں

قسیم امروہوی کے مرثیے میں نیا رنگ ڈھنگ ملتا ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ شعوری طور پر نہیں بلکہ ماحول کا اثر انھیں اس طرف رجوع کرتا ہے:

ظلمت میں ہے گھرا ہوا انسان۔ اک طرف
آپس میں پنجہ کش ہیں مسلمان۔ اک طرف
رکھا ہوا ہے طاق پہ قرآن۔ اک طرف
بجتا ہے زر کی حرص میں ایمان۔ اک طرف

ملت میں یہ عجیب سیاست کا دور ہے
بوجہل بھی کہے کہ جہالت کا دور ہے

لیکن یہ سب کچھ ان کا مزاج نہیں۔ بلکہ حالات سے متاثر ہو کر وہ یہ روش اختیار کرتے ہیں۔ اُن کا اصل رنگ تو یہ ہے:

ممدوح میرے راحتِ جانِ بتول ہیں ؛ یہ ہیں رسولِ پاک سے ان سے رسول ہیں
صلِّ علیٰ ریاضِ رسالت کے پھول ہیں
قائم انھیں سے دینِ خدا کے اصول ہیں

خود بھی، پدر بھی اور پسر بھی امام ہیں
قبضے میں ان کے کون و مکاں کے نظام ہیں

ساحر لکھنوی

ساحر لکھنوی کے جدِ امجد حضرت فاخر لکھنوی (اجتہادی) لکھنؤ کے مشہور مرثیہ گو تھے، اس اعتبار سے آپ پشتینی مرثیہ گو ہیں، آپ کا شمار کراچی کے ان شاعروں میں ہوتا ہے

جو مطالعے اور مشاہدے کی گہرائیوں سے اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کی رونمائی کرتے ہیں ساحر لکھنوی کے تمام کلام کو بیک نظر دیکھ جائیے، صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ اشعار کسی باشعور اور سلجھے ہوئے ذہن کی تخلیق ہیں پیچیدگی اور آورد کا شائبہ تک نہیں، آپ منقبت سلام اور قصیدے کے ملنے ہوئے شاعر ہیں۔ ان کی آواز میں نیا جوش اور کلام میں نئی تاثیر ہے۔ ان کے سلاموں میں نئی زمینیں، نئی ردیفیں، اور نئے قافیے ملتے ہیں جو ان کی اپج کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ جامعہ امامیہ ناظم آباد نمبر ۲ میں گزشتہ سال میں نے ان کا ایک سلام سُنا:

مرے آنسو بجز آل پیمبر مول لے گا کون

انتہائی خوبصورت اور دلآویز اشعار اس میں ملتے ہیں "مول لے گا کون" کی ردیف نہایت مشکل اور بالکل نئی ہے، لیکن اس سنگلاخ ردیف میں آپ نے پانی کی طرح رواں اشعار نکالے ہیں، جن میں آمد ہی آمد ہے۔ قصیدہ گوئی میں آپ ایک منفرد انداز کے مالک ہیں، حضرت عباس علمبردار کے ایک قصیدے کی تشبیب اس طرح شروع کرتے ہیں:

"والقلم" ہے مرا خیط تقدیر — یہ قلم جس کی معنوی جاگیر

یہ قلم نوجِ فکر کا ہے علم — یہ علم لشکرِ سخن کا امیر

اس قلم سے بہارِ باغ سخن

جیسے برکھا سے جاگ اٹھے کشمیر

ساحر لکھنوی کے مرثیوں کا بیشتر حصہ اگرچہ مصائب پر مشتمل ہے لیکن یہ انداز گراں نہیں گزرتا۔ مصائب کے بیان میں ان کے یہاں ایک نیا طرز ہے جس کو سن کر راہِ حق میں سب کچھ قربان کردینے کے لئے اُٹھ کھڑے ہونے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ زبان و بیان کی خوبی، ان کا شعر سنتے ہی فوری طور پر محسوس ہونے لگتی ہے۔ جذبات نگاری اور

نفسیاتی کیفیات کا اظہار دلنشیں پیرائے میں ملتا ہے۔

ساحر لکھنوی کے یہاں آنسوؤں میں تڑپ ہے۔ اس تڑپ میں حرارت ہے اور اس حرارت میں دیدار کی آرزوئیں کروٹیں لیتی ہیں:

اللہ دکھائے ہمیں اکبر کی جوانی — اکبر کی جوانی کو پیمبر کی جوانی
عباس کے آئینے میں حیدر کی جوانی — قاسم کے خدوخال میں شبر کی جوانی
دل کو ہے یقیں پھول امیدوں کے کھلیں گے
اصغر بھی ہمکتے ہوئے جھولے میں ملیں گے

وزیر جعفری

وزیر جعفری کراچی کے مرثیہ گو شاعر، علی اطہر جعفری (مرحوم) کے صاحبزادے ہیں۔ ان کے خاندان کے حالات ان کے والد کے ذیل میں ہم اسی مضمون میں لکھ چکے ہیں۔ وزیر جعفری آجکل لاڑکانہ میں ایگزیکٹیو انجینیر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ابتدائے شباب سے شعر و ادب کی طرف مائل ہیں متعدد قومی نظمیں کہی ہیں جو اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں اور ریڈیو پاکستان سے بھی نشر ہوتی رہی ہیں، آپ کے والد مرحوم نسیم امروہوی سے تلمذ رکھتے تھے ان کے بعد آپ نے بھی نسیم امروہوی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ ابتداً سلام، منقبت اور نوحے کہتے تھے آخر نسیم امروہوی کی نہائش اور فرمائش سے مرثیے کی طرف رجحان ہوا۔ جس کے لئے استاد نے یہ پابندی لگا دی کہ اول انیس کا کلام درسیات کے طور پر پڑھیں، آپ نے اس حکم کی تعمیل کی اور جب استاد کو اطمینان ہو گیا تو مرثیہ کہنے کی اجازت دی۔ اب تک تین مرثیے کہے ہیں جن میں مصائب پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ میں نے وزیر جعفری سے پوچھا تھا کہ آپ فضائل کے مقابلے میں مصائب پر اتنا زور کیوں دیتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میرے استاد نسیم امروہوی نے مجھ سے فرمایا کہ میری زندگی میں مصائب لکھنے کی جتنی مشق کرنی ہے کر لو

فضائل تو سب کہہ لیتے ہیں لیکن مصائب کہنا آسان نہیں اور اس کا جاننے والا پھر کوئی نہیں ملے گا۔

نذیر جعفری کی ایک اور خصوصیت ہے جو ان کے ذوق و شوق کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور وہ یہ کہ استاد سے اصلاح لیتے وقت وہ وجہ اصلاح معلوم کئے بغیر آگے نہیں بڑھتے۔

تیس چالیس نوحے بھی کہے ہیں جو اس سال محرم تک شائع ہو جائیں گے، مرثیے میں حضرت علی اکبر کے فضائل پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وردِ زباں ہے شیرِ مجازی کی منقبت
نوخیز و نوجوان نمازی کی منقبت
راہِ خدا میں عشق نوازی کی منقبت
اللہ اکبر، اکبر غازی کی منقبت
لہجے میں جس کے شانِ رسالتمآب ہے
گلدستۂ اذاں کا شگفتہ گلاب ہے

فطرت کہ دولتوں کی حسن و رسال سے نمود
اس پر جہاد نفس کی اعمال سے نمود
ہیں حیدری یہ صولت و اجلال سے نمود
حسن پیمبری کی خدو خال سے نمود
شہرت ہے دو جہاں میں نبی کے جمال کی
ایسے ہی ہوں گے عمر میں اٹھارہ سال کی

سینہ ہے اس دلیر کا گنجینۂ شباب
یوسف کا حسن تقدۂ پارینۂ شباب
خط کی نمود، عارضِ سبز زینۂ شباب
رخ ہے شباب آئنہ، آئینۂ شباب
حسنِ ازل ہے احمد ثانی کے بھیس میں
بانو کی آرزو ہے جوانی کے بھیس میں

تاثیر نقوی

تاثیر نقوی تلامذہ نسیم امروہوی میں مرثیے کے ایک اچھے شاعر ہیں۔ یہ ہفت روزہ ادبی د

دینی مجلے "عظیم" کے مدیر ہیں، ابتدا میں اپنا کلام آرزو لکھنوی کو دکھاتے رہے، ان کی وفات کے بعد ایک مدت تک یہ سوچتے رہے کہ کس سے مشورۂ سخن کیا جائے۔ آخرکار حضرت نسیم امروہوی کی جانب رجوع ہوئے، اور اب اپنا کلام انھیں کو دکھاتے ہیں۔ تاثیر کے کلام میں تاثیر ہونے کی بڑی وجہ ان کا مطالعہ اور ادب پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ اس میدان کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ لکھنؤ سے نسیم امروہوی کو سنتے چلے آرہے ہیں اور ان کے کمال کے معترف ہیں، چنانچہ وہ اپنے ایک مضمون "حضرت نسیم امروہوی" میں رقمطراز ہیں کہ:

"جب میں نے آنکھ کھولی تو آپ لکھنؤ میں اُستاد مانے جاتے تھے، یہ تقسیم ہند سے پہلے کی بات ہے تو اتنے دن گزرنے کے بعد اب آپ کے استادالاساتذہ ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے، آپ نے مرثیہ گوئی میں اجتہاد کیا، نئی نئی راہیں نکالیں نئے نئے موضوعات تلاش کیے، ایسے موضوع جن کے لیے صرف کہنہ مشقی اور شاعرانہ مہارت ہی کافی نہیں ہوتی حد درجے کا علم و فضل بھی ضروری ہے۔"

تاثیر نقوی کے مرثیوں میں جوش اور دبدبہ نمایاں ہے، ان کے بیان کی دلوں انگیزی متاثر کیے بغیر نہیں رہتی، ان کے یہاں نفس الامر، فلسفہ اور فکر و نظر ساتھ ساتھ چلتے ہیں، زبان کیسی ہے؟ اس کے لئے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں جو زبان و ادب کا کل بھی مرکز تھا اور آج بھی ہے، مستزاد یہ کہ علامہ ہندی (طالب ثراہ) کے فرزند ہیں۔

کردار و عزم میں جو پیمبر ہے وہ حسینؑ — میدان میں جو ثانیٔ حیدر ہے وہ حسین
تنہا جو ایک لاکھ میں لشکر ہے وہ حسین — جو صابروں میں صبر کا پیکر ہے وہ حسین

رنگیں لہو سے جس کے قبائے حیات ہے
جو تاجدار کرب و بلائے حیات ہے

دل کا سکون گلشنِ امید کی بہار — ذہنوں کا بادشاہ خیالوں کا تاجدار
آفاق پر محیط، زمانے پر اقتدار — انسانیت کی روح، تمنائے کردگار

جس کا مقام مدحتِ رسولِ انام ہے
جو حق سے زیرِ تیغ و سناں ہمکلام ہے

نسیم امروہوی کے تلامذہ کی شعر گوئی کا ایک مختصر خاکہ ہم نے آپ کے سامنے پیش کیا شاعر آلِ محمد نسیم امروہوی کی ان خدمات کا دائرہ نصف صدی سے زائد عرصے تک پھیلا ہوا ہے۔ اس طویل مدت میں سیکڑوں شاعر آپ سے اصلاح لیتے رہے۔ ہم نے جن شاعروں کا تذکرہ کیا یہ تو صرف وہ ہیں جن کی تصویریں ان کے تلامذہ کا ذکر شروع ہوتے ہی فوری طور پر نگاہوں میں پھرنے لگتی ہیں۔ ان گنت شاعر ایسے ہیں جو نسیم امروہوی سے برابر اصلاح لیتے رہے مگر اُن کا نام تک موصوف کو یاد نہیں۔

ہم نے ابتدائے مضمون میں یہ جملہ لکھا تھا کہ کسی بھی فنکار یا مصنف کی زندگی اور اس کے کارناموں کی کامیابی سب سے بڑی دلیل یہ ہوتی ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ آنے والی نسلوں کو اس نے کیا دیا اور اس کا فیض کن کن شکلوں میں ہمارے سامنے آیا۔" ہمارے اس جملے کی قدر و قیمت نسیم امروہوی کے تلامذہ کے تذکرے کے بعد بہت بڑھ جاتی ہے، نسیم امروہوی اس وقت برصغیر کے وہ مرثیہ گو شاعر ہیں جنہوں نے اپنی ہی ذات میں گم ہو کر خود کو محدود نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے علم و فن سے دوسروں کو بھی فیض یاب کیا ہے اپنے چراغ سے دوسروں کو بھی روشنی دکھائی ہے، اُن کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں، ان کی محفل میں اور ان کی بزم شعر و ادب میں بزرگ بھی ہیں اور نوجوان بھی۔ انھوں نے آنے والی نسلوں کو اتنا کچھ دے دیا ہے کہ یہ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا سلسلہ اردو زبان کی تاریخ کے ساتھ ہمیشہ باقی رہے گا۔ انہوں نے اپنی تربیت سے بعض ایسے نوجوان بھی تیار کر دیے ہیں جو آنے والی نسل کی بھی نسل کو ان کا فیض پہنچائیں گے اور اس طرح ایک مدت تک ہماری نسلیں مرثیہ کے ذوق سے انشاء اللہ محروم نہیں ہوں گی۔ تاریخ ادب ان کی اس جدو جہد کو فراموش نہیں کر سکتی۔ آخر مضمون میں اس مقام پر حق تلفی ہوگی اگر میں جناب سید علی سید امروہوی کا شکریہ ادا نہ کروں

جنھوں نے دھوڑ دھوپ کر کے صاحبانِ دیوان اور مرثیہ گو تلامذہ نسیم کے کلام اور حالات فراہم کئے اس سے ان کی اس دلچسپی اور لگاؤ کا اندازہ ہوتا ہے جو انھیں شعر و شاعری سے ہے۔ سید علی سید کراچی میں ایک طویل عرصے سے سلام، منقبت، قطعہ اور غزل وغیرہ کہتے رہے ہیں۔ ابھی مرثیے کے میدان میں قدم نہیں رکھا اور اسی وجہ سے ہم نے باقاعدہ طور پر اس مقالے میں ان کی شاعری پر تبصرہ اور تلامذہ نسیم میں ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے ہماری دعا ہے کہ خداوندِ عالم انھیں اتنی توفیق صلاحیت اور فرصت دے کہ اپنے دوسرے رفقاء کی طرح انھیں بھی مرثیہ کہنے کا موقع ملے تا کہ دنیا و آخرت میں ان کی صلاح و فلاح کا وسیلہ ہو۔

*

نسیم امروہوی کی شاعری کا علمی پس منظر

جون ایلیا

جناب جونؔ ایلیا نے "حضرت نسیمؔ امروہوی کی شاعری کے علمی پس منظر" سے متعلق ایک طویل مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے، جس کا اقتباس "جشنِ زریں" کے جلسے میں پڑھنے کی بجائے آپ نے اس کے ابتدائی حصّے کا ماحصل زبانی بیان فرمایا، آپ کی یہ تقریر ٹیپ کرلی گئی جو بعینہٖ ذیل میں درج کی جاتی ہے:

تقریر:

نہ میں کوئی مقرر ہوں اور نہ کوئی نقاد۔ کیا فرمایا! شاعر! نہیں جناب میری شاعری بھی کیا۔ اور ایک بات اور مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ مجھ سے پہلے میرے گئی محترم بزرگ تشریف لاچکے ہیں، مگر جواز کی ایک صورت یہ نکلتی ہے کہ انھیں اولیّت حاصل ہے اور مجھے بعدیت، سو میں بعد کو آیا کہ اولیّت کو پہلے آنا چاہیے تھا اور بعدیت کو بعد میں۔ بہرحال میں معذرت خواہ ہوں۔

قبلہ وکعبہ مولانا نسیمؔ امروہوی کی سرگزشتِ ذات اصل میں میری کچھ اپنی یادوں سے شروع ہوتی ہے، میری عمر کوئی ڈھائی سال کی ہوگی، میں باباؔ کی گود میں بیٹھا تھا اور مولانا مجلس میں مرثیہ پڑھ رہے تھے، اور کبھی کبھی مجھے نیند کے جھونکے آجاتے تھے، تو یہ موقع تھا جب میں نے پہلی بار مولانا کو دیکھا، اس کے بعد یہ کہ میں جس خاندان سے تعلق رکھتا ہوں اس کا گہرا تعلق مولانا کے خاندان سے صدیوں سے چلا آرہا تھا، تو میں نے مولانا ہی کے بارے میں نہیں بلکہ ان کے عظیم الشان ماضی۔ عظیم الشان علمی وادبی ماضی۔ کے بارے میں۔

ﮯ حضرت علامہ شفیق حسن صاحب اعلی اللہ مقامہ

ان کے دادا حضرت شمیم امروہوی کے بارے میں اپنے گھر کے بزرگوں سے بہت کچھ سنا اور اس سے میں نے بہت کچھ سیکھا، اور اس روایت کا ادراک حاصل کیا جو اس وقت گزر رہی تھی، تو یہ سلسلہ تھا، پھر جب وہ وقت آیا کہ مولانا یہاں تشریف لے آئے پاکستان میں، اور میں وہاں رہا، تو مولانا غیبت میں تھے، یہاں "قائم" تھے اور میں وہاں تھا۔

ایک عجیب اتفاق ہوا کہ میں اپنی اسکولی تعلیم کے علاوہ امروہہ کے ایک دارالعلوم سے بھی متعلق ہوا جس کا نام سید المدارس ہے اور اس کے طلبہ میں بعض بڑے اہم نام آتے ہیں۔ حضرت حیات امروہوی جن کی یہ غزل پورے برصغیر میں گونجتی رہی ہے ؎

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے

بج رہا ہے اور بے آواز ہے

میرے بھائی سید محمد تقی، رئیس امروہوی، کمال امروہوی، اور یہ تمام لوگ اسی دارالعلوم کے طالب علم رہے ہیں، تو جب میں اس دارالعلوم میں گیا تو ابتداء سے ہم نے پڑھنا شروع کیا، فارسی اور عربی کو، تو میں نے بات یہ دیکھی، کچھ کتابوں کے نام بھول گیا ہوں، برس گزر چکے ہیں، یاد بھی نہیں رہا کہ ہم نے کیا پڑھا تھا اور کیا بھولا ہے، ہاں تو کچھ ایسا تھا کہ ہم پڑھ رہے ہیں، عربی کا آغاز کر رہے ہیں تو ہمیں پڑھایا جا رہا ہے، مثلاً صرف و نحو میں صرف میر، نحو میر کو، اور آگے چل کر ہدایت النحو، کافیہ، شرح ملا جامی، جار بردی یا شافیہ شریف رضی کی، تو جو کوئی کتاب بھی ہم اٹھائیں تو اس پر مولانا نسیم امروہوی کا تشریحی حاشیہ موجود، یہ صرف و نحو کا معاملہ تھا، یہ کتابیں نور المدارس سے سید المدارس میں آئی تھیں، چونکہ نور المدارس بند ہو چکا تھا، تو یہ وہ دور تھا کہ میں نے مولانا سے غائبانہ تلمذ حاصل کیا،

؎ امروہہ کا ایک اور دارالعلوم جس میں مولانا نسیم امروہوی اوّل متعلم تھے پھر معلم۔

ویسے میرے استاد مولانا سید محمد عبادت صاحب قبلہ مدظلہ العالی، مولانا سید مصطفیٰ مرتضیٰ مرحوم، حضرت مولانا عبدالقدوس مرحوم اور مولانا نسیم احمد فریدی تھے جو ممتاز ادیب اور شاعر ہیں اور علمِ تصوف کے نابغہ، مولانا نسیم احمد فریدی بھی مولانا (نسیم امروہوی) کے شاگرد رہے ہیں۔

اس طرح مولانا سے میرا غائبانہ تعارف شروع ہوا اور یہ سلسلہ چلتا رہا، اور پھر میں یہاں پاکستان میں حاضر ہوا؛ وہاں میں بھولا، یہ صَرف و نحو کی بات ہوئی، اضافہ ہوا۔ جب بلاغت کی کتاب اٹھائی، مثلاً مختصر المعانی تو تشریحی حاشیے پائے، منطق کی باری آئی تو مرقات شرحِ تہذیب، قطبی اور سُلّم، وہاں مولانا تشریحیں کر رہے ہیں اور ہم استفادہ کر رہے ہیں۔ بعض بڑی مشکل کتابیں تھیں ان میں سے، عروض میں مثلاً محققِ طوسی کی معیار الاشعار جو فارسی کے سب سے اعلیٰ نصاب میں شامل تھی الہ آباد بورڈ کے، واقعی مشکل کتاب تھی، سوتی کہلاتی تھی وہ عروض کی سوئی، چھوٹی سی کتاب مگر بڑی تکلیف دہ، وہاں بھی مولانا نے ہماری اور ہمارے ساتھیوں کی اپنی قلم فرسائیوں سے مدد کی، فلسفے میں ایک کتاب تھی ہدایۃ الحکمۃ مولانا فضلِ حق خیرآبادی کی اور میبذی، یہاں بھی مولانا قلم فرسائی کرتے ہوئے نظر آئے۔ افادہ ہوتا رہا، استفادہ کیا جاتا رہا۔ یہ فلسفے کی بات تھی۔ پھر اصولِ فقہ کا مسئلہ آیا، یہ فقہ اور اصولِ فقہ، ان سے مجھے کہاں مناسبت مگر نصاب وہ ایسا تھا کہ اس میں مختلف علوم و فنون شامل ہوتے تھے، ہیئت میں شرحِ چغمینی تھی، یہ وہ علوم تھے جو چوتھی صدی ہجری سے لے کر انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل تک جاری رہے، یہ سب اس نصاب میں ہوتے تھے اور ہیں۔ تو اب مسئلہ پیش آیا اصولِ فقہ کا جس کی ایک کتاب ہے معالم الاصول، دقیق ترین کتاب، مولانا اس کے حاشیوں پر بھی موجود پائے گئے، سرمدانیاں بنی ہوئی تھیں اس کتاب کے صفحوں پر، کوئی جگہ بھی نہیں چھوڑی گئی تھی، پورا صفحہ کالا اور اس پہ

ے انھوں نے بھی عربی کے درسیات مولانا نسیم امروہوی سے پڑھے تھے۔

مولانا نسیم امروہوی بین السطور میں تشریحیں کر رہے ہیں اور ہم مستفید ہو رہے ہیں۔ عربی ادب کی بھی بہت سی کتابیں اس وقت مجھے یاد آرہی ہیں۔ متنبی، حریری وغیرہ، یہاں بھی میں مولانا سے مستفیض ہوا۔ فارسی ادب کی سنیئے، اہلی شیرازی کی سحرِ حلال پھر عرفی، عرفی جیسا مشکل شاعر، خاقانی جیسا سنگلاخ شاعر، اتنی دشوار کتابیں، مگر مولانا ہر جگہ ہماری انگلی پکڑ کر آگے بڑھاتے تھے، ہمیں سمجھاتے تھے۔ یہ کہانی ختم ہوئی، یہ غائبانہ تلمذ کی کہانی تھی۔

پھر میں یہاں آیا، اور ایک وقت آیا کہ میرے برادرِ محترم ملک کے عظیم دانشور اور شاعر جناب شان الحق حقی اور قبلہ نسیم امروہوی کی ذرہ پروری اور خورد نوازی کے باعث مجھے یہ شرف حاصل ہوا کہ ترقی اردو بورڈ کے ایک ناچیز لغت نویس کی حیثیت سے کام کروں، وہاں میں نے مولانا نسیم امروہوی کے تبحر کو دیکھا۔ مگر اس موضوع پر غالباً حقی صاحب مجھ سے بہتر فرما سکتے ہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے بڑے ناساعد حالات میں، بہت مطعون ہو کر بے لوث اور بے غرضانہ خدمات انجام دی ہیں اس عظیم لغت کی، جس کی مثال بہت سی زبانوں میں ملنی مشکل ہے، مگر حقی صاحب کو مطعون و مطرود ہی قرار دیا گیا، داد کبھی نہیں دی گئی، تو مولانا کے اس پہلو کی طرف شاید حقی صاحب زیادہ فرما سکیں گے جن کی نگرانی میں یہ کام کر رہے ہیں۔ ہم نے محسوس کیا، ہم جو سیکھنے والے ہیں کہ مولانا لفظ کے باطن اور معنی کی باطنیت میں اتر جاتے ہیں، کوئی لفظ میرے سامنے آیا اسے دیکھ کر مولانا سے عرض کیا کہ حضرت یہ لفظ تو کچھ عجیب ہے، کیا بات کسی لغت میں بھی نہیں ہے، قیاس بھی نہیں کہتا کہ یہ کوئی بامعنی لفظ ہے مگر مولانا معنی نکالتے تھے اور پھر تصدیق بھی ہو جاتی تھی، ان تمام باتوں سے میں جس نتیجے پر پہنچا اور میں نے جو بات محسوس کی وہ یہ ہے کہ آج جدید شاعر کے لیے جن اکتسابی شرائط کی ضرورت ہے وہ بہت مختلف ہیں، لیکن کلاسیکی شاعری کے لیے جن علوم اور جن فنون کا جاننا ضروری ہے بلاشبہ اس دور میں "مولانا" ان چند لوگوں میں شامل ہیں

ﮯ اردو کی وہ لغت جو آکسفورڈ ڈکشنری کے نمونے پر ۱۲ جلدوں میں وزارتِ تعلیم مملکتِ پاکستان مرتب کرا رہی ہے اور مولانا نسیم امروہوی اس کے مدیر ہیں

ہیں جو ان کلاسیکی شرائط کے اکتسابی شعبوں کو پورا کرتے ہیں، پورا ہی نہیں کرتے بلکہ وہ اس میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔

اب ایک بات ذہن میں آگئی اور مولانا شاید اسے پسند نہ فرمائیں، نہ جانے یہ میری کوئی کمینگی ہے یا کیا ہے، مولانا اس گلی میں بھی گئے ہیں ذہنی طور پر، جہاں بڑے گُل کھلتے ہیں، وہی کوے ملامت، مولانا کو علم نہیں کہ اس کوے ملامت کا سامان میں نے کس طرح حاصل کیا، وہی بدنام، وہی عیّارہ صنفِ غزل، غزل، اسی کے چند شعر میں سناؤں، مولانا کی غزلوں کے چند شعر، ہاں میں یہ کہنا بھول گیا کہ مولانا کے اس تبحّر اور نابغیت کو اگر دیکھنا ہے، اس علمی پس منظر کو جو انھوں نے اصطلاحوں کی شکل میں اپنے مرثیوں میں برتا ہے، اور خاص طور پر "وانا صراہ" "رشار محسن الحکیم" اور علّامہ رشید ترابی مرحوم کے مرثیوں میں تو آپ ایک خاص بات دیکھیں گے، جب آپ دیکھیں گے تو علمی اصطلاحوں کا استعمال کچھ اس طرح پائیں گے کہ اصطلاح، اصطلاح نہیں محسوس ہوگی متحرک لفظ بن جائے گی، لفظ کا آہنگ بن جائے گی اور آہنگ کا رنگ بن جائے گی، حالانکہ شعر کے حق میں اصطلاح کا استعمال سمِ قاتل کی حیثیت رکھتا ہے، مگر مولانا نے اصطلاح کو ایک عجیب قسم کا انشاد بنا دیا ہے نشید بنا دیا ہے، نعت میں فرماتے ہیں ؎

ہے ہستیِ خدا کی سند ان کی ہست و بود
حق واحد الوجود، نبیؐ شاہد الوجود

—— "وحدتِ وجود" اور "وحدتِ شہود" کے معرکۃ الآرا مسائل کی طرف کتنی خوبصورتی اور روانی کے ساتھ اشارہ ہوگیا کہ بظاہر یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ کسی اہم مسئلہ کا ذکر ہے۔

لکھنؤ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے :-

پائے ہر ایک عہد میں تو نے وہ باکمال — جن کے فیوضِ علم کی دولت ہے لازوال
وہ عالمانِ امتِ محبوبِ ذوالجلال — جو انبیائے عترتِ یعقوبؑ کی مثال

تھی یوں تو ابتدا میں بھی اک انتہا کی شان
آخر کے "دور" میں ہے "تسلسل" خدا کی شان

"دَور" اور "تسلسل" حکمت کے مشہور مسائل ہیں۔

شیرینیاں کلام و ادب کی زبان میں
مثلِ عرب بلیغ معانی، بیان میں

— "کلام، ادب، معانی" اور "بیان" بجائے خود مصطلحات ہیں لیکن یہاں!

ہر اک قدم پہ فلک ہے نیا زمین نئی — حیات ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتی
یہ جد وجہد بھی ہے اور یہی جہاد بھی ہے — جو ارتقا ہے مسلّم تو اجتہاد بھی ہے

— "اجتہاد" ایک اصطلاحی لفظ ہے، مگر یہاں عام روزمرّہ کا آہنگ بن گیا ہے۔

یہ چند مثالیں مشتے نمونہ از خروارے، پیش کی گئی ہیں، اگر نسیم صاحب کا کلام بالاستیعاب پڑھا جائے تو ایسی صدہا بلکہ ہزار ہا مثالیں ملیں گی جو اور جگہ نہیں ملتیں۔

تو بھائی بات غزل کی آ گئی تھی (نسیم صاحب کی طرف مڑ کر) مولانا! شاید آپ کو اپنے وہ اشعار یاد بھی نہ ہوں، کچھ شعر جو متفرق غزلوں کے مجھے مل سکے، زمانے کی دست برد سے:

کیا جو غور تو سمجھا نہ جانے کیا ہوں میں — نہ کچھ سمجھنے پہ سب کچھ سمجھ گیا ہوں میں

— اب میرا خطاب مولانا سے نہیں ہے چونکہ مجھے جھینپ چڑھ رہی ہے، مولانا سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کیا بکواس شروع ہو گئی۔

سمجھ کے نقشِ قدم وہ بگاڑتے ہیں مگر — مٹانے والے کے قدموں سے بن رہا ہوں میں
سنادے خیریتِ آشیاں تو اے صیاد — جلا ہوا ترے دامن کو دیکھتا ہوں میں
جو صبح ہو تو بتاؤں میں انتظار کی حد — ابھی تو رات ہے تاروں کو گن رہا ہوں میں

ایک اور غزل کے شعر سنیے:

نگاہوں میں دفتر زبانوں پہ تالے — محبت کے بھی معجزے ہیں نرالے

محبت کا مقصد ہے تعمیرِ ہستی — یہ کس نے کہا اپنی ہستی مٹا لے
وہ آگاہِ رازِ جنوں ہی نہیں ہے — جو اپنے جنوں کو تماشا بنا لے

اب ایک اور غزل کے چند شعر سنا رہا ہوں:

یا تو راہِ عشق میں دل کی کوئی منزل نہیں — یا کوئی منزل بقدرِ آرزوے دل نہیں
ابتداے عاشقی میں دل بقدرِ غم نہ تھا — انتہاے عاشقی میں غم بقدرِ دل نہیں
یا یہ عالم تھا کہ منزل تھی مگر مقصد نہ تھا — یا یہ حالت ہے کہ مقصد ہے، مگر منزل نہیں

واہ واہ مولانا، سبحان اللہ:

ناخداے عشق میری ہمتوں کی داد دے — میں وہاں کشتی ڈبوتا ہوں جہاں ساحل نہیں

انقلاب اے مقصدِ تخلیقِ ہستی انقلاب
یہ جہانِ آب و گِل اب تک مرے قابل نہیں

ایک اور غزل کے دو شعر:

وہ دنیا دردِ دل والوں کی دنیا ہو نہیں سکتی — مئے عشرت جہاں کھنچتی ہے خونِ گرمِ دہقاں سے
مرے دل کے سفینے کا ابھر کر غرق ہو جانا — مسیحا دارسے دیکھا کیے اور نوح طوفاں سے

غالبؔ کی زمین میں مولانا کے چار شعر اور یاد آئے

وہ دل کہ منزلِ مقصد ہے خود جہاں کے لیے — بھٹک رہا ہے کسی راہِ بے نشاں کے لیے
حرم میں سجدۂ بت، بتکدے میں طوفِ حرم — مطالبات ہیں کیا کیا کہاں کہاں کے لیے
حرم میں صرف ہوئے، بتکدے کی نذر ہوئے — بچا رکھے تھے جو سجدے اک آستاں کے لیے
میں خود ہوں خوگرِ آدابِ ضبطِ غم ورنہ — ہزار طرح کے حیلے ہیں اک فغاں کے لیے

اور ہاں! مولانا کا ایک اور شعر ۱۳-۱۴ برس کی عمر کا یاد آیا، جو میری یادوں سے پہلے مولوی مصور حسین نجم کے ہاں مشاعرے میں پڑھا تھا، بڑے فکر خیز اور بحث انگیز انسان تھے مولوی مصور حسین، افسوس ہے کہ موت نے اس گراں بہا جوہر کو ہم سے چھین لیا، تو مولوی مصور حسین نے ایک گفتگو

کے دوران مولانا کا یہ شعر سنایا، طرح تھی ان کے مشاعرے میں

داغِ دل گر نظر نہیں آتا

نظر قافیہ اور نہیں آتا ردیف۔ کہتے تھے مرحوم کو مولانا کا یہ شعر حاصلِ مشاعرہ تھا ؎

لذّتِ موت بھی ہے کیا لذّت　　　یہ مزہ عمر بھر نہیں آتا

جناب جون ایلیا نے اس نقطے پر پہنچ کر اپنا خطاب ختم کر دیا کیونکہ ابھی اور کئی حضرات کو اپنے مقالوں کے اقتباسات پیش کرنا تھے اور شام ہو چلی تھی۔ اپنے طویل مقالے کا یہ حصّہ جو موصوف نے زبانی پیش کیا اس کے بعد وہ اپنے مقالے میں تحریر فرماتے ہیں :-

بقیّہ مقالہ :

گزشتہ سطور میں جناب نسیم امروہوی کی شاعری کا جو علمی پس منظر پیش کیا گیا اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی شاعری محض شاعری ہی نہیں بلکہ عالمانہ ساحری بھی ہے، افسوس ہے کہ مجھے کثرتِ مشاغل کے باعث زیادہ وقت نہیں مل سکا، ممکن ہے کہ ابھی بہت سے پہلو اور بھی ہوں اور میری نظر سے اوجھل رہ گئے ہوں، البتہ اس مقام پر ان کے ایک منظوم ترجمے کا ذکر نامناسب نہ ہوگا جس سے ان کی مخصوص علمی و ادبی صلاحیت اور پختہ کاری پر روشنی پڑتی ہے، میرا اشارہ صدرِ اسلام کے مشہور شاعر ابو نواس فرزدق کے قصیدے کی طرف ہے، جو اس نے حرم شریف میں حج بیت اللہ کے موقع پر حضرت امام زین العابدینؑ کی شان میں ارتجالاً نظم کیا تھا، یہ قصیدہ عربی ادب کا شاہکار ہے، نسیم صاحب نے ایک مرثیہ میں جو ان کے مراثی کی جلد اول میں شائع ہوا تھا، اس قصیدہ کا حرف بحرف با محاورہ ترجمہ کیا ہے، لیکن پورا ترجمہ پڑھ جایئے آپ کو کہیں روانی میں کمی محسوس نہ ہوگی، اور اگر پہلے سے معلوم نہ ہو تو یہ اندازہ نہیں لگا سکیں گے کہ یہ ترجمہ ہے۔

اس قصیدے کے دو ترجمے اور بھی میری نظر سے گزرے ہیں، جن میں سے ایک ملا عبدالرحمٰن جامی علیہ الرحمہ ؎ کا ہے، جو فارسی کے مشہور شاعر تھے، شاعر ہونے کے علاوہ انھوں نے عربی نحو کی مشہور کتاب "کافیہ" (مصنفہ ابن حاجب) کی شرح لکھی تھی، جو "شرح ملا جامی" کے نام سے ساری دنیا میں مشہور ہے اور درسِ نظامی کے مدارس میں علم حاصل کرنے والے اصحاب کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ دوسرا ترجمہ اردو کے مشہور قصیدہ گو اور غزل گو شاعر، مولانا محمد ہادی عزیز لکھنوی مرحوم کا ہے جو ان کے مجموعۂ قصائد "صحیفۂ ولا" سے لیا گیا ہے، میں اس جگہ ان تینوں منظوم ترجموں کا نقل کر دینا اس اعتبار سے مفیدِ مطلب سمجھتا ہوں کہ کسی شاعر کی صلاحیت اور زورِ قلم کو پرکھنے کے لیے نقادوں نے ایک یہ معیار بھی برتا ہے کہ اس کے کسی معاصر یا متقدم استاد کا ہم مضمون شعر سامنے رکھ کر متاخر کے شعر پر غور کیا ہے اور جانچا ہے کہ اس نے کس طرح اپنے شعر میں ندرت اور تازگی پیدا کی ہے، جس کے پیشِ نظر اس کی استادانہ اہلیت کو تسلیم کیا جائے۔ میرا مقصد اس سے ہرگز یہ نہیں ہے کہ ان تینوں شاعروں کے کلام کا موازنہ کیا جائے، اس لیے میں نے اوّل فرزدق کے قصیدے کا شعر لکھا، اس کے نیچے نثر میں اس کا لفظی ترجمہ، اور اس کے بعد ملا جامی، عزیز لکھنوی اور نسیم امروہوی کے منظوم تراجم۔ اربابِ ذوق پڑھیں اور محظوظ ہوں، میں تینوں ترجموں کے تقابلی مطالعے میں رائے زنی کا اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا، میری نظر میں یہ سب قابلِ احترام بزرگ شاعر ہیں اور اپنی اپنی جگہ استاد ہیں۔ البتہ ملا جامی اور عزیز مرحوم کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے یہ ترجمہ بہت پہلے نظم کیا، عزیز مرحوم کے ترجمے پر سنِ تصنیف ۱۹۰۸ء درج ہے۔ ملا جامی کا ترجمہ ان سے بھی پہلے کا ہے، جبکہ جناب نسیم امروہوی کا ترجمہ ۱۹۳۹ء کا ہے۔

؎ دیکھیے سلسلۃ الذہب جامی

آغاز

مُلّا جامی:

پورِ عبدالملک بنامِ ہشام — در حرم بود با اہالیِ شام
میزد اندر طوافِ کعبہ قدم — لیک از ازدحامِ اہلِ حرم
استلامِ حجر ندادش دست — بہرِ نظارہ گوشۂ بنشست
ناگہاں نخبۂ علیِ ولی — زینِ عبّاد، بن حسینؑ علیؑ
در کساءِ بہا و حُلّۂ نور — بر حریمِ حرم فگندہ عبور
زد قدم بہرِ استلامِ حجر — گشت خالی زِ خلق راہ گزر
شامیے کرد از ہشام سوال — کیست ایں با چنیں جلال و جمال
از جہالت در او تغافل کرد — وز شناسائیش تجاہل کرد
گفت نشناسمش ندانم کیست — مکی و یا یمانی و مدنی است
بو فراس آں سخنور نادر — بود در جمعِ شامیاں حاضر
گفت من می شناسمش نیکو — زو چہ پرسی بسوے من کن رو

عزیزؔ لکھنوی مرحوم:

ہشام زادۂ عبدالملک بنِ مرواں — چلا ہے حج کو، جلو میں ہیں بندگان و عباد
کھڑا ہوا ہے بقصدِ طوافِ بیت اللہ — ہجوم حاجیوں کا، مانعِ حصولِ مراد
کبھی غرور سے بہرِ نظارۂ حجّاج — فرازِ عرشۂ منبر ہے جائے پست نہاد
کہ سامنے سے پئے استلامِ رکنِ حطیم — ہوا ظہورِ شہنشاہ عالمِ ایجاد

شگفتہ ہوئی ہر صف جلیے مرے مولا — معاند ہیں یہ گردوں نے کی نئی بیداد

کہا ہشام سے اس وقت ایک شامی نے — یہ کون مردِ مقدس ہے مفخرِ اجداد
خیال اس کو ہوا دل نہ اس کا مائل ہو — کروں بیان اگر اس کے فضل کی روداد
کہا کہ میں نہیں واقف ہوں اس سے ہو گا کوئی — کھٹک رہا تھا مگر دل میں خارِ بغض و عناد
یہ اتفاق کہ تھا اس گروہ میں حاضر — ابو فراس فرزدق بھی نظم کا استاد
رگوں میں دوڑا جو خونِ حمیتِ اسلام — تو فی البدیہ قصیدہ یہ اک کیا انشاد
کہا کہ پوچھ لے مجھ سے جو پوچھنا ہے تجھے — وہ جانے کیا کہ نہیں جس کے دین کی بنیاد

نسیم امروہوی :

اپنے بیگانے ہیں سب قدر شناسِ مولا — آج تک حج ہشام اس کا ہے شاہد بخدا
سنگِ اسود کے جو بوسے کو سیہ کار چلا — تھی وہاں کثرتِ مردم سے نہ تل دھرنے کی جا

لاکھ کوشاں تھے خدم پر نہ جگہ پاتا تھا
شاہ، قدموں میں فقیروں کے گرا جاتا تھا

ناگہاں دور سے اک بندۂ اللہ بڑھا — بر میں کہنہ تھی قبا، دستِ مبارک میں عصا
چار سو اس کے رُخِ پاک کی پھیلی جو ضیا — ابر مجمع کا پھٹا، راہ کھلی، شور گھٹا

جس نے دیکھا، یہی سمجھا مرادِ دل جاتا ہے
ایک سے پوچھتا تھا ایک، یہ کون آتا ہے

دشمنِ آلِ نبی تھا جو ہشامِ خود سر — بن گیا جان کے انجان عدوے حیدر
مشتعل بغض کے شعلوں سے جو اس کا تھا جگر — دے دیے چھینٹے فرزدق نے قصیدہ پڑھ کر

تھا یہ مطلب کہ خدم سے نہ حشم سے پوچھو
تم بصیرت سے محروم تو ہم سے پوچھو

قصیدہ فرزدق

مع ترجمہ منثور از راقم الحروف و ترجمہ منظوم از ملا جامی و عزیز مرحوم و نسیم امروہوی:

(۱) هذا الذی تعرف البطحاء وطأته — والبیت یعرفه والحل والحرم

(ترجمہ) یہ وہ ہے جس کے نقش قدم کو بطحا پہچانتا ہے، کعبہ، حل اور حرم سب پہچانتے ہیں۔

ملا جامی:- آں کس است ایں کہ مکہ و بطحا — زمزم و بوقبیس و خیف و منا

حرم و حل و بیت و رکن حطیم — ناودان و مقام ابراہیم

ہر یک آمد بقدر آں عارف — بر علوے مقام او واقف

عزیز: یہ وہ ہے جس کے نشانِ قدم سے ہے آگاہ ۵ — زمینِ حل و حرم اور بیتِ رب عباد

نسیم: یہ وہ ہے جس کی طریقت سے ہے واقف بطحا — حرم و کعبہ ہیں عارف تو شناسا دنیا

(۲) هذا ابن خیر عباد الله کلهم — هذا التقی النقی الطاهر العلم

ترجمہ:- یہ سارے بندگانِ خدا سے بہتر (فرد) کا بیٹا ہے، یہ تقویٰ، پاکیزگی اور طہارت میں مشہور ہے۔

جامی:- قرۃ العین سید الشہدا است — زہرہ شاخ دوحہ زہرا است

میوۂ باغ احمد مختار — لالۂ راغ حیدر کرار

عزیز: یہی تقی و نقی طاہر اور امیر القوم — یہی جہان میں فرزند بہترین عباد

نسیم: تھا جو سب خلق سے بہتر یہ پسر ہے اس کا — پاک بھی، صاف بھی، مشہور بھی، اہلِ تقویٰ

(۳) هذا الذی احمد المختار والده — صلی الاله علیه ماجری القلم

ترجمہ:- یہ وہ ہے جس کے باپ احمد مختار ہیں، خدائے تعالیٰ قیامِ قیامت تک ان پر درود نازل کرے

جامی:- ترجمہ نہیں کیا

عزیز:- ترجمہ نہیں کیا

نسیم:- یہ نشانی بخدا احمدِ مختار کی ہے — صلوٰت اس پہ سدا خالقِ غفار کی ہے

(۴) هذا علیٌّ رسول الله والده — امست بنور هداه تهتدی الامم

---

۵ وہ علاقہ جہاں شکار کرنا حلال ہے یعنی ساری دنیا بجز حرم و کعبہ

ترجمہ:۔ یہ وہ علیؑ ہے جس کے باپ خدا کے رسولؐ ہیں، جس کے نورِ ہدایت سے امتیں مستفیض ہوتی رہیں گی۔

جامیؔ: جدِّ او مصدرِ ہدایتِ حق | از چنیں مصدرے شدہ مشتق

عزیزؔ: ترجمہ نہیں کیا

نسیمؔ: نام اس کا ہے علیؑ جد ہیں رسولِ اکرمؐ | راہ یاب اس کے ہیں انوارِ ہدایت سے امم

(۵) ھذا الذی عمہ الطیار جعفر والـ | مقتول حمزۃ لیث حبہ قسم

ترجمہ:۔ یہ وہ ہے جس کی محبت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کے چچا جعفر طیارؑ اور حمزہؑ شہید چچا ہیں

جامیؔ: ترجمہ نہیں کیا

عزیزؔ: ترجمہ نہیں کیا

نسیمؔ: حمزہ و جعفرِ طیار شہید و ضیغم | ہیں اسی کے تو چچا اس کی محبت کی قسم

(۶) ھذا ابن سیدۃ النسوان فاطمۃ | وابن العلی الذی فی سیفہ سقم

ترجمہ:۔ یہ سردارِ نسواں جناب فاطمہؑ کا فرزند اور علیؑ کا دلبند ہے (وہ علیؑ) جن کی تلوار کے قبضے میں موت ہے۔

جامیؔ:۔ ترجمہ نہیں کیا

عزیزؔ: ترجمہ نہیں کیا

نسیمؔ: جانِ زہراؑ، جگرِ ابنِ ابی طالبؑ ہے | جن کی شمشیرِ دودم موت پہ بھی غالب ہے

(۷) ولیس قولک من ھذا بضائرہ | العرب تعرف من انکرت والعجم

ترجمہ:۔ تیرے "یہ کون ہے!" کہنے سے انھیں ضرر نہیں پہنچا (اس لیے کہ) جسے تو نہیں پہچانتا اسے عرب اور عجم سب پہچانتے ہیں۔

جامیؔ:۔ در عرب در عجم بود مشہور | گو نداند (؟) مفضلے مغرور

عزیزؔ: ضرر نہیں ہے اگر تو نہ اس کو پہچانے | عرب سے لے کے عجم تک سب اس کے ہیں معتقد

نسیم: کیا مضر ہے ترا کہنا کہ یہ ہے کون بشر   تو نہ پہچانے مگر جانتی ہے دنیا بھر

(۸) لو یعلم الحجر من جاء یلثمہ   لخر یلثم منہ ما وطا القدم

ترجمہ:۔ اگر حجرِ اسود جان جائے کہ کون اسے چومنے کو آرہا ہے تو وہ گر کر اُس کے قدموں کے نیچے کی زمین کو چوم لے۔

جامی: ترجمہ نہیں کیا

عزیز: ترجمہ نہیں کیا

نسیم: بوسہ دینے کو وہ آیا ہے جو ہو جائے خبر   چوم لے خاکِ قدم خاک پر اسود گر کر

(۹) یکاد یمسکہ عرفان راحتہ   رکن الحطیم اذا ما جاء یستلم

ترجمہ:۔ (وقت) قریب ہے کہ جبکہ یہ (حجرِ اسود کو) چومنے کے لیے آئیں گے تو وہ اُن کی ہتھیلی کو پہچانتے ہی اس کو پکڑ لے گا۔

جامی:۔ ترجمہ نہیں کیا

عزیز: جب آتے ہیں یہ پئے استلام رکنِ حطیم   تو ہاتھ چومنے آجاتا ہے قریب جماد

نسیم: کچھ نہیں دور کہ وہ اس کے جو پاس آئے گا   دیکھ کر دستِ مبارک یہ لپٹ جائے گا

(۱۰) اذا رأتہ قریش قال قائلہا   الی مکارم ھذا ینتھی الکرم

ترجمہ:۔ قریش جب ان کو دیکھتے ہیں تو ہر کہنے والا یہ کہتا ہے کہ یہ ہیں وہ جن کی بزرگیوں پر بزرگی ختم ہے۔

جامی: چوں کند جائے درمیانِ قریش   رود از فخر بر زبانِ قریش

کہ بریں سرورِ ستودہ شیم   بے نہایت رسید فضل و کرم

عزیز: بوقتِ دید یہ کہتے ہیں سب قریش اسے   کہ منتہی ہیں انھیں پر مکارم و امجاد

نسیم:۔ کہتے ہیں سب قریشی دیکھ کے ان کو یہ بات   منتہائے کرم و فضل انھیں کے ہیں صفات

(۱۱) حمال اثقال اقوام اذا فدحوا   حلو الشمائل تحلو عندہٗ النعم

ترجمہ:۔ یہ قوموں کا بوجھ اٹھاتے ہیں جبکہ وہ مصیبت میں مبتلا ہوں، ان کی عادتیں میٹھی ہیں اور ان کی نعتیں بھی میٹھی ہیں۔

جامی: ترجمہ نہیں کیا

عزیز:۔ نہ بار قرض سے کیونکر وہ دبے سبکدوشی | شمائل اس کے ہیں شیریں وہ ہے کریم نہاد
نسیم: حاملِ بارِ مصیبت زدگاں ان کی ذات | ان کی نعمات میں سیرت کی طرح لطفِ نبات

(۱۲) ھذا ابن فاطمۃ ان کنت جاھلہ | بجدہ انبیاء اللہ قد ختموا

ترجمہ:۔ اگر تو ان سے ناواقف ہے تو (جان لے) یہ فاطمہؓ کے بیٹے ہیں (اور) ان کے جد پر انبیائے خدا کا خاتمہ ہے۔

جامی:۔ جدِّ او را بمسندِ تمکیں | خاتم الانبیا است نقش نگیں
عزیز: یہ ابنِ فاطمہ زہرا ہے جانے اس کو | اسی کے جد ہیں نبیوں میں آخر الافراد
نسیم: ابنِ زہرا ہیں جو تو نے نہیں پہچانا ہے | ان کا نانا ہے جسے ختمِ رسل مانا ہے

(۱۳) ینشق نور الھدیٰ عن صبح غرتہ | کالشمس ینجاب عن اشراقھا الظلم

ترجمہ:۔ ان کی پیشانی کی صبح سے ہدایت کا نور (اس طرح) پھوٹتا ہے جس طرح سورج (کہ) اس کے نکلنے ہی ظلمتیں دور ہو جاتی ہیں۔

جامی:۔ لائح از روے او فروغِ ھدیٰ | فائح از خوے او شمیم وفا
طالعش آفتاب روز افروز | روشنائی فزا و ظلمت سوز
عزیز: زوالِ کفر ہوا یوں رخِ منور سے | کہ جیسے مہر کے اشراق سے فنا ہو سواد
نسیم: ہے ہدایت کی چمک صبحِ جبیں سے پیدا | ظلمتیں کھوتی ہے سورج کی طرح جس کی ضیا

(۱۴) منشقۃ من رسول اللہ نبعتہ | طابت عناصرہ والخیم والشیم

ترجمہ:۔ ان کی شاخ رسول اللہ صلعم سے مشتق ہے، ان کے عناصر طبیعت و مزاج اور عادات طیب و پاک ہیں۔

جامیؔ : ترجمہ نہیں کیا۔

عزیزؔ : اسی کی ذات ہے اک فرعِ دوحۂ نبوی ‏ ‏ ‏ زہے عناصر و اخلاط طبعِ نیک نہاد

نسیمؔ : اصل میں آپ کے شجرے کی رسولِ دوسرا ‏ ‏ ‏ نیک خو، نیک سیر، پاک نسب، اصل علی

(۱۵) ان قال، قال بما یھوی جمیعھم ‏ ‏ ‏ وان تکلم یوما زانہ الکلم

ترجمہ:۔ اگر کبھی کچھ کہتے ہیں، تو وہ ان تمام اسلاف کے اقوال پر حاوی ہوتا ہے، اور اگر کبھی کلام کرتے ہیں تو وہ کلام انھیں زیب دیتا ہے۔

جامیؔ : ترجمہ نہیں کیا

عزیزؔ : ترجمہ نہیں کیا

نسیمؔ : قول اسلاف کا حاصل جو سخن ان کا ہے ‏ ‏ ‏ پھول ہی جھڑتے ہیں جس سے وہ دہن ان کا ہے

(۱۶) اللہ شرفہ قدما وفضلہ ‏ ‏ ‏ جری بذلک فی الواحہ القلم

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے ان کو قدیم شرف وفضل عطا کیا ہے، اور اس کے متعلق قلم، لوحِ محفوظ میں (احکام) لکھ چکا ہے۔

جامیؔ : ترجمہ نہیں کیا

عزیزؔ : کیا خدا نے بزرگ اس کو بدو فطرت سے ‏ ‏ ‏ قلم نے لوح پہ لکھے شرف پئے اسناد

نسیمؔ : ازلی فضل و شرف حق نے کیا ان کو عطا ‏ ‏ ‏ لوح میں صاف ہے محفوظ یہ فرمانِ قضا

(۱۷) فی کفہ خیزران ریحہ عبق ‏ ‏ ‏ من کف اروع عرنینہ[۱] شمم

ترجمہ: ان کے ہاتھ میں ایک عصا ہے جس کی خوشبو تیز ہے (یا) ایسے ہاتھ میں ہے جو حسین ہے اور جس کی ناک میں بلندی ہے۔

جامیؔ : ترجمہ نہیں کیا

عزیزؔ : لیے ہے ہاتھ میں اک چوب خیزران وہ جواں ‏ ‏ ‏ بلند بینی و خوش صورت و بزرگ نہاد

---

[۱] یہ عربی کا ایک محاورہ ہے اور اس موقع پر مستعمل ہے جب کسی کے لیے یہ کہنا ہو کہ بہت باحیا اور اونچی ناک والا ہے۔

نسیم: جس کی ہتھیلی ہے ملائم ہاتھ میں ایسا ہے عصا　　ناک اونچی ہے حیا داروں میں، صورت زیبا

(۱۸) من جده وان فضل الانبياء له　　وفضل امته وانت له الامم

ترجمہ: اس کے جد کون ہیں؟ وہ ہیں کہ سب انبیاء کی بزرگی جن سے پست ہے، اور جن کی امت کی بزرگی سے دوسری امتیں پست ہیں۔

جامی: ترجمہ نہیں کیا

عزیز: یہ وہ ہے جس کے جد افضل ہیں سب نبیوں سے　　اور امت اس کی شرف میں سب امتوں سے زیاد

نسیم: ان کا نانا ہے رسولانِ سلف میں اولیٰ　　جس کی امت بھی ہے اوروں سے شرف میں اولیٰ

(۱۹) كلتا يديه غياث عم نفعهما　　يستوكفان ولا يعروهما عدم

ترجمہ: ان کے دونوں ہاتھ بادل ہیں، جن کا نفع عام ہے، برابر دیتے رہتے ہیں اور انھیں عدم عارض نہیں ہوتا۔

جامی: فیض او ابر بر ہمہ عالم　　گر بریزد ہمی نگردد کم

عزیز: ترجمہ نہیں کیا

نسیم: عام جن کی ہے عطا ہاتھ ہیں وہ ابرِ کرم　　نقص ذرہ نہیں، گو صرف عطا ہیں پیہم

(۲۰) سهل الخليقة لا تخشى بوادره　　يزينه الخصلتان العلم والكرم

ترجمہ: نرم خو ہیں، جن کے غیظ و غضب کا ڈر نہیں کیا جاتا، انھیں دو خصلتیں یعنی علم اور کرم زینت دیتی ہیں۔

جامی: ترجمہ نہیں کیا

عزیز: یہ حسنِ خلق و شیم سے ہوا مزین وہ　　متاعِ خوف کبھی غصے سے ہو گئی برباد

نسیم: نیک خو ایسے کہ غصے کا نہیں ڈر ہر دم　　کیوں نہ ہو ان کی ہیں زینت کرم و علم بہم

(۲۱) الليث اهون منه حين تبغضه　　والموت أيسر منه حين يهتضم

ترجمہ: شیر ان کے مقابلے میں ہلکا ہے جبکہ تو ان سے دشمنی کرے، اور موت آسان تر ہے جبکہ

انھیں غصہ دلایا جائے ۔

جاؔمی : ترجمہ نہیں کیا

عزؔیز :۔ تخفیف قہر اسد اور موت کی سختی | جب ان کو غیظ میں لائے کوئی دم بیداد

نسیؔم :۔ گر کبھی غیظ میں اعدا کی جفا لاتی ہے | شیر تو چیز ہے کیا موت بھی تھراتی ہے

(۲۲) ای الخلائق لیست فی رقابھم | لاولیتہ ھذا اولہ نعم

ترجمہ :۔ وہ کون سی مخلوق ہے جس کی گردنوں میں نہ ہوں ، ان کے بزرگوں کی یا ان کی نعمتیں ۔

جاؔمی : ترجمہ نہیں کیا

عزؔیز : ترجمہ نہیں کیا

نسیؔم :۔ کس کی گردن پہ نہیں بارِ سیانِ خلقت | ان کے اسلاف کی یا خاص انھیں کی نعمت

(۲۳) لا یخلف الوعد میمون نقیبتہ | رحب الفناء اریب حین یعتزم

ترجمہ :۔ یہ وعدہ خلافی نہیں کرتے ، ان کی طینت مبارک ہے (سخاوت میں) وسیع میدان والے ہیں ، دانا ہیں جبکہ کوئی عزم کریں ۔

جاؔمی : ترجمہ نہیں کیا

عزؔیز : براہِ جادۂ اقبال رہروِ دانا | خلاف وعدہ کرے کیوں کہ ہے وہ پاک نہاد

نسیؔم : کیوں نہ وعدے کے ہوں سچے کہ ہیں عالی طینت | عزم میں حزم ہیں شامل تو سخا میں سعت

(۲۴) ینمولی ذروۃ العز التی قصرت | عن نیلھا عرب الاسلام والعجم

ترجمہ : یہ عزت کی اس چوٹی تک پہنچے ہیں جس کے پانے سے اسلام میں ، عرب اور عجم سب قاصر رہے ۔

جاؔمی : ذروہ عزت است منزلِ او | حامل دولت است محملِ او

از چنیں عز و دولتِ ظاہر | ہم عرب ہم عجم بود قاصر

عزؔیز : رسا ہے کون بھلا اس کے اوجِ عزت تک | عرب ہو یا کہ عجم کس میں ہے یہ استعداد

نسیؔم : نقطۂ اوج جو اس اہلِ حشم نے پایا | دینِ حق میں نہ عرب نے نہ عجم نے پایا

(۲۵) من معشرٍ[1] حبّهم دینٌ و بغضهم　　　کفرٌ و قربهم منجیً و معتصم

ترجمہ: یہ ایسے گروہ سے ہیں جن کی محبت دین ہے، جن کی دشمنی کفر ہے، اور جن کی قربت ملجا و مامن ہے۔

جامی: ہست زاں معشر بلند آئیں　　　کہ گزشتند اوجِ علیین
حبِ ایشاں دلیلِ صدق و وفاق　　　بغضِ ایشاں دلیلِ کفر و نفاق
قربِ شاں مایۂ علو و جلال　　　بعدِ شاں مایہ عتو و ضلال

عزیز: ہے نجات ہے قرب اس کا ایک دستاویز　　　ولایت اس کی ہے اسلام، کفر اس کا عناد

نسیم: کفر و دیں آپ کے کہنے سے عناد اور ولا　　　مغفرت قرب میں جن کے ہے وہ ایسے ملجا

(۲۶) هم الغیوث اذا ما ازمةٌ ازمت　　　واللیث لیث الشریٰ والباس محتذم

ترجمہ: جب قحط پڑے تو وہ بادل ہیں، اور جب گھمسان کی جنگ ہو رہی ہو تو شیر نیستاں ہیں۔

جامی: ہم غیوث البدیٰ اذا رہبوا　　　ہم لیوث الشریٰ اذا نہبوا

عزیز: دمِ جدل ہے اسد راہ کو وہ سلمیٰ کا　　　زمانِ قحط میں ہے وہ سخی و راد

نسیم: جب پڑے قحط تو ہیں فیض کے بادل گویا　　　جب پڑے رن تو وہی رن میں ہیں شیرِ ہیجا

(۲۷) ان عد اهل التقی کانوا ائمتهم　　　او قیل من خیر خلق اللّٰہ قیل هم

ترجمہ: اگر اہلِ تقویٰ گنے جائیں تو یہ (گروہ والے) ان کے امام ہیں، یا جب یہ کہا جائے کہ خلقِ خدا سے بہتر کون ہے تو یہی کہا جائے گا کہ وہ[2] بہتر ہیں۔

جامی: گر شمارند اہلِ تقویٰ را　　　طالبان رضائے مولا را
اندراں قوم مقتدا باشند　　　واندراں خیل پیشوا باشند
گر بپرسد ز آسماں بالفرض　　　سائلے "من خیار اهل الارض"

---

[1] یہاں سے فرزدق نے اس گروہ کی مدح کی ہے جس کا اس شعر میں ذکر ہے۔ عزیز مرحوم نے گروہ کی بجائے ان سب شعروں کے ترجمے میں امام کی مدح کی ہے۔ [2] یعنی گروہ والے

بزبانِ کواکب و انجم — ہیچ لفظی نیاید الّا "ھم"

عزیز: محیط دہر میں جز ذاتِ اقدسِ اعلےٰ — ہے کون امامِ تقی اور کوئی خیرِ عباد

نسیم: اہلِ تقویٰ کا جو ہو ذکر تو وہ اولیٰ ہیں — بہتر از خلق کو پوچھو تو وہی مولا ہیں

(۲۸) مقدم بعد ذکر اللہ ذکرھم — فی کلِّ بدءٍ ومختومٌ بہٖ الکلم

ترجمہ: ان (گروہ والوں کا) کا ذکر، خدا کے بعد سب سے مقدم ہے، ہر کام کی ابتدا میں، اور یہی ذکر خاتمہ کلام ہے۔

جامی: ذکرِ شاں سابق است در افواہ — در ہمہ خلق بعدِ ذکرِ الٰہ

سرِ ہر نامہ را رواج افزا — نامِ ایشاں است بعدِ نامِ خدا

ختمِ ہر نظم و نثر را الحق — بود از یمن نامِ شاں رونق

عزیز: ہر اک سخن میں ہوا تیرا ذکر حسنِ ختام — تقدم اس کو ہوا بعدِ ذکرِ ربِّ عباد

نسیم: سب سے ماقبل ہیں مابعد خدا اُن کے نام — ہر سخن کا وہی آغاز وہی ہیں انجام

(۲۹) یستدفع الضر والبلوی بحبہم — ویسترق بہ الاحسان والنعم

ترجمہ: ان (گروہ والوں) کی محبت سے مضرتیں اور بلائیں دور بھاگتی ہیں، اور نیکیاں اور نعمتیں غلام بنائی جاتی ہیں۔

جامی: ترجمہ نہیں کیا

عزیز: ترجمہ نہیں کیا

نسیم: اُن کی الفت سببِ دفعِ ہموم و آلام — نعمتیں ان کی کنیزیں ہیں تو احسان غلام

(۳۰) لا یستطیع جواد بعد غایتھم — ولا یدانیھم قوم وان کرموا

ترجمہ: کوئی سخی ان (گروہ والوں) کی حد تک نہیں پہنچ سکتا، اور کوئی قوم چاہے کتنی بخشش کرے ان کے برابر نہیں کر سکتی۔

جامی: ترجمہ نہیں کیا۔

عزیز: نہ پہنچا اس کے کرم تک کوئی کریم القوم — نہ پہنچا اس کی سخا تک کوئی سخی وجواد

نسیم: کس میں ہمت ہے سخاوت جود کھلائے ان کی — لاکھ فیاض بنے حد کو نہ پائے ان کی

(۳۱) لاینقص العسر بسطا من اکفھم — سیان ذلک ان اثروا وان عدموا

ترجمہ: تنگ دستی ان کے ہاتھوں کی کشادگی کو کم نہیں کر سکتی، چاہے وہ دولت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں، دونوں صورتیں برابر ہیں۔

جامی: ترجمہ نہیں کیا

عزیز: نہیں ہے عسر ترا مانع فراخیٔ دست — کہ ایک حال پہ دونوں ہیں یاں نہ کم نہ زیاد

نسیم: دست فیاض کو ان کے نہیں عسرت سے زوال — پاس ہو یا کہ نہ ہو مال، برابر ہے مآل

(۳۲) بیوتھم من قریش یستضاء بھا — فی النائبات وعند الحکم ان حکموا

ترجمہ: ان (گروہ والوں) کے گھر قریش میں ہیں جن سے مصیبتوں میں، اور معاملات میں اگر وہ فیصلہ کریں، تو نور حاصل کیا جاتا ہے۔

جامی: ترجمہ نہیں کیا

عزیز: ترجمہ نہیں کیا

نسیم: ہے وہ ما بین قریش ان کے مکانوں کا جمال — جو مصائب میں سہارا ہے مسائل میں مثال

(۳۳) مواطن قد علت فی کل نائبۃ — علی الصحابۃ لم اکتم وان کتموا

ترجمہ: وہ ایسے مکان ہیں جو ہر مشکل میں بالادست ہیں (یعنی ان سے مدد چاہی جاتی ہے) صحابیوں کے لیے، چاہے وہ چھپائیں، مگر میں نہیں چھپاؤں گا۔

جامی: ترجمہ نہیں کیا

عزیز: ترجمہ نہیں کیا

نسیم: خود صحابہ بھی طلبگار مدد رہتے ہیں — وہ چھپاتے ہیں چھپایا کریں ہم کہتے ہیں

(۳۴) یغضی حیاء ویغضی من مھابتہ — فما یکلم الا حین یبتسم

ترجمہ: وہ (امام) حیا سے نظر جھکائے رہتے ہیں اور ان کی ہیبت سے لوگ نظریں نیچی رکھتے ہیں، جب تک چہرے پر مسکراہٹ نہ ہو ان سے گفتگو نہیں کی جا سکتی۔

جامی: از حیا نایدش پسندیدہ — کہ کشاید بروئے کس دیدہ
خلق از او نیز دیدہ خوابانند — کز مہابت نگاہ نتوانند
نیست بے سبقت تبسم او — خلق را طاقت تکلم او

عزیز: نگہ حیا سے وہاں جھکتی ہے تو ہیبت یہاں — کرے تبسم اگر کچھ تو آئے دل کی مراد
نسیم: رعب سے چشم حیا میں کہ جھکے چشم جہاں — مسکرائیں جو نہ یہ، کب ہے سخن کا امکاں

(۳۵) ما قال لا قط الا فی تشہدہ — لولا التشہد کانت لائہ نعم

ترجمہ: تشہد کے سوا انھوں نے (امام نے) "لا" (= نہیں) نہیں کہا۔ اگر تشہد نہ ہوتا تو آپ کا "لا" بھی "نَعَم" (= ہاں) ہو جاتا۔

جامی: ترجمہ نہیں کیا

عزیز: زباں پہ "لا" کبھی نہ آیا مگر تشہد میں — "نعم" تھا وہ بھی نہ ہوتا جو حکم رب عباد
نسیم: آشنا "لا" سے ہوئی صرف تشہد میں زباں — یہ نہ ہوتا تو "نہیں" آپ کی ہو جاتی "ہاں"

(۳۶) عم البریۃ بالاحسان وانقشعت — عنہا الغیابۃ والاملاق والعدم

ترجمہ: خلقت کے ساتھ ان (امام) کا احسان عام ہے، اور (اس احسان کے باعث) اس سے (یعنی خلقت سے) تنگ دستی، غربت اور نیستی دور ہو گئی ہے۔

جامی: ترجمہ نہیں کیا

عزیز: رہی نہ خلق میں اب نام کو بھی ناداری — ترے کرم نے دیا سب کو اتنا نقد مراد
نسیم: عام احسان جو ان کا ہے جمہور رہا — غم مٹا، فقر اٹھا، رنج و الم دور ہوا

(۳۷) آباؤہ من قریش فی ارومتہا — محمد و علیؑ بعدہ علم

ترجمہ: ان کے باپ دادا قریش سے (ایسے قریش) جن کی نسل میں محمدؐ ہیں اور پھر علیؑ ہیں جو ان

ائمہ کے بعد نمایاں ہیں۔

جامی: ترجمہ نہیں کیا

عزیز: ترجمہ نہیں کیا

نسیم: قرشی نسل سے ہیں آپ کے آبائے کرام — اک نبیؐ، اک علیؑ جو کہ ہے بعد اُن کے امام

(۳۸) بلیٰ، لہ شاھد والشعب من احد — والخندقان ویوم الفتح ان علموا

ترجمہ: اگر لوگ جاننا چاہیں تو اُس علیؑ (کی شجاعت) پر بدر، کوہِ احد، خندق و خیبر اور فتحِ مکّہ شاہد ہیں۔

جامی: ترجمہ نہیں کیا

عزیز: ترجمہ نہیں کیا

نسیم: جس کی توقیر پہ شاہد ہیں جو سو حین و کام — خندق و بدر و احد اور شکستِ اصنام

(۳۹) من یعرف اللہ یعرف اولویۃ ذا — فالدین من بیت ھذا نالہ الامم

ترجمہ: جو اللہ کا عارف ہے وہ ان کی برتری کا بھی عارف ہے، تمام جماعتوں نے دین انھیں کے گھرانے سے پایا ہے۔

جامی: ترجمہ نہیں کیا

عزیز: خداشناس ہے جو آپ کا شناسا ہے — پڑی ہے آپ کے گھر سے ہی دین کی بنیاد

نسیم: آپ کو جانا ہے مولیٰ عرفائے ربّنے — دین پایا ہے گھرانے سے انھیں کے سب نے

نسیم امروہوی کی شخصیت

رئیس امروہوی

برادرِ محترم شاعرِ آلِ محمد جناب نسیم امروہوی کی پنجاہ سالہ علمی، ادبی اور شعری خدمات کے "جشنِ زریں" کے موقع پر یہ خدمت میں نے اپنے ذمے لی ہے کہ آپ کی شخصیت کو الفاظ کا جامہ پہنا کر اہلِ نظر کے سامنے پیش کر دوں تاکہ وہ بھی جنھوں نے آپ کی "صورتِ ظاہر" کا مشاہدہ کیا ہے اور وہ بھی جو آپ کی زیارت کے مشتاق ہیں اور اب تک نہیں دیکھ سکے ہیں، آپ کے "باطن" کی تصویر دیکھیں اور پھر اس تصویر کے آئینے میں آپ کے کلام کا مطالعہ کر کے یہ جان سکیں کہ آپ نے کیا کہا؟ کیوں کہا؟ کس دل سے اور کس جذبے سے کہا؟ اور اس کے کتنے گہرے نقوش خواص و عوام کے دلوں پر مرتسم ہوئے۔

نسیم صاحب مجھ سے عمر میں کچھ بڑے ہیں۔ میں جس زمانے میں امروہہ کے مشہور دارالعلوم "سید المدارس" میں متعلم تھا، اس وقت، وہ وہیں کے دوسرے قدیم تر دارالعلوم "نور المدارس" میں معلم کی حیثیت سے عربی و فارسی کے درسیات پڑھاتے تھے۔ شعر و سخن کا چرچا نہ صرف میرے گھرانے میں، بلکہ پورے امروہہ میں اتنی عمومیت کے ساتھ تھا، جتنی کہ اب شہرِ دہلی میں ہاکی اور فٹ بال کے کھیلوں کو حاصل ہوتی ہے۔ تعلیم کے ضروری مشغلے سے فراغت پانے کے بعد میرا پورا وقت شعر و سخن، بیت بازی، اور میرؔ و غالبؔ اور انیسؔ کی شعر خوانی میں گزرتا تھا۔ والد مرحوم (حضرت علامہ شفیق حسن اعلی اللہ مقامہ) اور خدا بخشے چچا غنی حسن صاحب مرحوم

شعر کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے، اور میری اس مشغولیت سے ان کی روح اس قدر بالیدگی محسوس کرتی تھی جس کا اظہار اکثر ان کے چہروں کی شگفتگی سے ہوتا تھا۔ وہ خود بھی اکثر مرحلوں پر رہنمائی کے لیے، ایک فریق دقیم کے طور پر اس مشغولیت میں شریک ہو جاتے تھے۔ عم محترم جناب عنی حسن صاحب مرحوم کو جناب نسیم کے جد امجد فرزدق ہند حضرت شمیم طاب ثراہ سے حد درجہ دلی عقیدت تھی، ان کی اکثر بیتیں پڑھتے اور گھنٹوں لطف لیتے۔ کبھی کبھی مرحوم کی زبان پر نسیم صاحب کا ذکر بھی آتا اور فرماتے کہ ہمارے استاد شمیم صاحب کی مسند شاعری جو ایک مدت سے سونی پڑی تھی بحمد اللہ اب اس کا وارث پیدا ہو گیا ہے اور خوب خوب کہتا ہے۔ مرحوم کے ان کلمات سے اکثر مجھے نسیم صاحب کے سننے اور ان کے کلام سے محظوظ ہونے کا اشتیاق پیدا ہوتا تھا، لیکن بدقسمتی سے ایسا موقع میسر آتا تھا کہ آمنے سامنے بیٹھ کر کچھ سن سکوں اور نسیم صاحب کی معرفت حاصل کر سکوں۔ نسیم صاحب کا آبائی مکان میرے گھر سے کافی فاصلے پر واقع تھا، بلکہ یہ کہیے تو غلط نہ ہوگا کہ ایک سرے پر وہ رہتے تھے اور دوسرے سرے پر میں۔ بنابریں طالب علمی کی مشغولیتوں میں اتنی دور جانا ——— پھر ایک ایسے مقام پر جہاں خاطر خواہ سواریاں بھی آسانی سے دستیاب نہیں ہوتی تھیں ——— کچھ آسان نہ تھا۔ گاہے ماہے کنبے کی تقریبات میں نسیم صاحب نظر آجاتے تھے اور بس! نسیم صاحب کی علمی منزلت کیا ہے؟ اور وہ کیسے شاعر ہیں؟ یہ سوال ذہن میں تو اٹھتے لیکن ان کا جواب معلوم نہ تھا۔

میں خود بھی شعر کہتا تھا اور قریب قریب ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کر لیتا تھا، ایک دفعہ رجب کے مہینے میں بابا نے مجھ سے کہا کہ میاں رئیس! اس دفعہ تم بھی ۱۳ رجب کی محفل میں ہمارے ساتھ چلنا اور کچھ پڑھنا۔ چنانچہ میں نے بارھویں رجب کو ایک منقبت کہی اور بابا کے ساتھ محفل میں پہنچا۔ سید محمد تقی سلمہ بھی ساتھ تھے اور انھوں نے بھی اس محفل کے لیے چند شعر کہے تھے۔ یہ محفل امروہہ کے مشہور محلہ کٹکوئی، کی امام بارگاہ میں تقریباً دو تین صدی سے منعقد ہوتی تھی اور اس میں امروہہ کے کل شعراء بلا لحاظ مذہب و ملت شرکت کرتے تھے، اور اس طرح ۱۰ بجے صبح سے مغرب تک پورا دن غذائے روحانی کے مختلف مزے اٹھانے میں بسر ہوتا تھا۔ محفل میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ

نسیم صاحب بھی تشریف لا رہے ہیں۔ آج میں نے نسیم صاحب کو قریب سے دیکھا۔ سن و سال میں مجھ سے تین چار سال بڑے ہوں گے، لیکن چہرے پر عالمانہ متانت کے آثار نمایاں تھے۔ محفل شروع ہوئی، شعرا پڑھتے رہے، لطف آتا رہا، میرا نمبر آیا، نسیم صاحب نے بھی کئی مقامات پر مجھے جی کھول کر داد دی، میرے بعد اور کئی بزرگوں نے قصائد پڑھے۔ طبیعت بے چین تھی کہ جلد نسیم صاحب کو دعوتِ کلام دی جائے اور ان کے شعر ان کی زبان سے پہلی بار سننے کا موقع ملے۔ شاعری نسیم صاحب کا خاندانی مشغلہ تھی، ان کے والد، دادا اور پردادا امروہہ میں جگت استاد کی حیثیت کے مالک تھے۔ ہر طبقے کے لوگ ان کا لوہا مانتے تھے۔ اور انھیں کی نسبت سے ایسی محفلوں میں نسیم صاحب کو سب سے آخر میں پڑھوایا جاتا تھا۔ خدا خدا کر کے مغرب سے کچھ پہلے نسیم صاحب کے پڑھنے کی باری آئی۔ اور وہ پھولوں کی بارش اور استقبالیہ تالیوں کی گونج میں منبر پر تشریف لے گئے۔ بہت اچھی منقبت پڑھی، سن کر دل خوش ہو گیا، تین شعر ابھی تک یاد ہیں:

نبی کو یہ حیرت تھی معراج کی شب — کہ باتیں کسی کی ہیں لہجہ کسی کا
وہ بیری، وہ موسیٰ، وہ ڈر کر جھجکنا — وہ جھولا، وہ اژدر، وہ بازو علی کا
نمک اور علی کے عدد ہیں برابر — بغیر علی دینِ احمد ہے پھیکا

درود کے نعروں میں محفل ختم ہوئی، نسیم صاحب نے شہر کے بزرگوں سے مصافحہ کیا، اور چچا غنی حسن مرحوم کی طرف بڑھے اور بڑے انکسار سے جھک کر تسلیم کی، اور معذرت کے طور پر والد مرحوم اعلی اللہ مقامہ سے کہا کہ میں آپ کی صحبت سے فیض اٹھانا چاہتا ہوں مگر بدقسمتی سے اتنا مشغول رہتا ہوں کہ حاضری اور قدم بوسی کی سعادت، ارادے کے باوجود نصیب نہیں ہوتی۔ چچا غنی حسن نے فرمایا کہ ایسی بھی کیا مشغولیت ہے کہ تھوڑا سا وقت نہیں نکال سکتے، تمھیں دیکھ کر استاد یاد آ جاتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان سے مل لیے۔ اس موقع پر نسیم صاحب نے اپنی مشغولیت کا مختصر حال سنایا، جسے سن کر میں دنگ رہ گیا۔ اللہ! ایک نوجوان اتنے سارے کام کرتا اور اتنی مشقت جھیلتا ہے اور پھر ایسے اچھے شعر کہہ لیتا ہے۔ نسیم صاحب نے بتایا کہ وہ تڑکے میں اذان سے پہلے اٹھتے ہیں، اور ضروریات سے اتنے جلد فارغ

ہو جاتے ہیں کہ اذان ہوتے ہی فریضۂ صبح ادا کر کے گھر سے نکل پڑتے ہیں، اور رسید سے ہمارے محلے کی طرف سے گزرتے ہوئے مدرسۂ باب العلم نوگانواں سادات میں پڑھانے کے لیے پیدل چلے جاتے ہیں۔ یہ نوگانواں سادات ایک قصبہ ہے جو ایک کچی سڑک کے ذریعہ ہمارے محلے سے تقریباً ۷ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ نسیم صاحب کے گھر سے کوئی ۸، ۹ میل دور ہوگا راستے میں گنجان بانسوں کا ایک بھیانک بن پڑتا ہے۔ دوپہر تک وہاں عربی کی درسیات پڑھانے کے بعد، امروہہ واپس آتے ہیں اور یہاں چار بجے سے مغرب تک دارالعلوم "نورالمدارس" کے طلبا کو عربی کے مختلف علوم پڑھاتے ہیں، اس طرح آپ روزانہ تقریباً سترہ میل پیدل چلتے ہیں۔ دن بھر تعلیم میں منہمک رہتے ہیں، اور رات کو دس گیارہ بجے تک کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں، اور اسی میں کچھ وقت شعر و شاعری کے لیے بھی نکال لیتے ہیں۔ چچا غنی حسن اور والد مرحوم نے فرمایا کہ اتنی محنت نہیں کرنا چاہیے ورنہ صحت پر اس کا برا اثر پڑے گا نسیم صاحب نے جواب دیا کہ کنبے کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے، اگر ایک مدرسے کے کام پر قناعت کی جائے تو وہ اتنی تنخواہ نہیں دے سکتا جو ضرورت کے لیے کافی ہو۔

نسیم صاحب کی عمر اس وقت سترہ اٹھارہ سال کی ہوگی میں نے اور ان سب لوگوں نے جو گرد و پیش موجود تھے، نسیم صاحب کے مشاغل کا حال سن کر دو باتیں اخذ کیں، ایک اپنی ذمہ داری کا احساس، دوسری مستقل محنت شاقہ کرنا، اور اس سے نہ گھبرانا۔ میرے نزدیک نسیم صاحب کی کامیابی کا راز انھیں دو عادتوں میں مضمر ہے۔ اور مجھے ذرہ بھر حیرت نہیں ہوتی جب آج کراچی میں لوگوں سے یہ سنتا ہوں کہ نسیم صاحب روزانہ سورج نکلتے وقت "ترقی اردو بورڈ" کے دفتر میں پہنچ جاتے ہیں اور اکثر وہاں شام تک، بلکہ بعض اوقات رات تک مسلسل کام کرتے رہتے ہیں، اور اسی کے ساتھ شعر و سخن کا سلسلہ بھی اتنی فراوانی کے ساتھ جاری ہے جس کا ذکر پاکستان کے مشہور ادیبوں اور نقادوں نے ان کے جشن زریں، کے موقع پر اپنے طویل مقالوں میں کیا ہے اور وہ مقالے اشاعت سے پہلے میں نے حرف بحرف پڑھے ہیں۔

اس مقام پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ زندگی کے اس دور میں نسیم صاحب کی کارکردگی صرف تعلیم و تعلم تک محدود نہ تھی بلکہ اسی زمانے میں انھوں نے طالب علموں کی مشکلات حل کرنے کے لیے متعدد امدادی

کتابیں بھی تالیف و تصنیف کیں جو انوار احمدی پریس الہ آباد سے پے در پے شائع ہوتی رہیں۔ بہت دن کی بات ہو گئی مگر جہاں تک مجھے یاد ہے معانی و بیان کی مشہور کتاب " حدائق البلاغت " ، محقق طوسی کی " معیار الاشعار " بزبان فارسی کا اردو میں خلاصہ ، جواہر فارسی اور دفاتر ابوالفضل کی شرحیں ، عالم و فاضل کے طالب علموں کے لیے الفلوز ، حصہ دوم ، استقرائی طرز پر اردو قواعد صرف و نحو کی کتاب " تسہیل القواعد " کے کئی حصے ، اور علم عروض و قافیہ میں ، معراج العروض ، اور ایسی ہی چند اور کتابیں جن کے نام مجھے یاد نہیں رہے ، سب اسی زمانے کی قلم فرسائی کا نتیجہ ہیں ، جو آج بھی بعض کتب خانوں میں موجود ہیں ، یا نسیم صاحب ہی بتا سکتے ہیں " یا خدا ہی کو علم ہے کہ وہ ان سب کاموں کے لئے کہاں سے وقت نکالتے تھے۔ نسیم صاحب کی زندگی کے ان شب و روز پر نظر کر کے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اگر انسان پختہ ارادہ کرے ، دل میں لگن ہو ، اور محنت بھی کرے تو کوئی کام ایسا نہیں جسے وہ انجام نہ دے سکے۔ " عزم " اور " عمل " دونوں انسان کی مٹھی میں ہیں ، جن سے وہ ہر وقت کام لے سکتا ہے۔ نسیم صاحب اپنی زندگی میں ہر مرحلے پر ان سے کام لیتے رہے ہیں اور یہ دونوں اس حد تک ان کے خمیر اور سرشت میں شامل ہیں کہ آج ان کے پورے کلام کو پڑھ جائیے (عام اس سے کہ وہ مرثیہ ہو ، یا نظم ، یا غزل) تو اس میں ہر جگہ عزم و عمل کی کارفرمائی نظر آئے گی۔ میں نے جناب پروفیسر سید وقار عظیم کا طویل مقالہ جو زیر نظر مجموعہ مقالات میں شامل ہے ، شروع سے آخر تک پڑھا ہے اور اس کا ماحصل یہی ہے کہ نسیم صاحب " عزم و عمل " کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور یہی ان کے مرثیوں کی روح ہے ، جس سے ایک طرف قوم میں عام بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے ، اور دوسری طرف ان کی اس سعی و کاوش سے صنف مرثیہ کا درجہ اردو ادب میں بہت بلند کر دیا ہے ، جو آپ سے پہلے اس صنف کو نصیب نہیں ہوا تھا۔

یہ ایک جملہ معترضہ تھا جو اپنے خیال کی تائید میں حوالے کے طور پر لکھ دیا گیا ۔ دراصل

یہ بتانا مقصود تھا کہ امروہہ اور نوگانویں کی درس گاہوں کے سالانہ نتائج سے نسیم صاحب کی معلمانہ مہارت کا شہرہ دور دور تک پہنچا چنانچہ آپ کو شعبۂ عربی کالج میرٹھ میں معلم عربی کے عہدے پر بلالیا گیا۔ وہاں پہنچ کر آپ صبح کے وقت مذکورہ کالج میں فرائض منصبی ادا کرتے تھے اور ۳ بجے سے "دارالعلوم میرٹھ" میں فارسی کے منتہی طلباء کو پڑھاتے تھے۔ اسی دارالعلوم میں عربی کی چند کتابوں کا درس ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم کے سپرد تھا اور وہ صبح کی شفٹ میں پڑھاتے تھے ۔ یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ جس طرح زندگی کے ابتدائی دور میں یہ دونوں بزرگ معلم کی حیثیت سے ایک دوسرے کے رفیق تھے اسی طرح آخری دور میں بھی کراچی پہنچ کر "ترقی اردو بورڈ" میں "مدیر" کی حیثیت سے ایک دوسرے کے رفیق کار رہے۔ غرض ایک دو سال کے بعد نسیم صاحب میرٹھ سے لکھنؤ چلے گئے اور اب علمی عظمت کے ساتھ آپ کی شاعری اور مرثیہ گوئی کو ابھرنے کی فضا ملی۔ جس نے آپ کو جدید مرثیے کے بانیوں میں سرفہرست جگہ دی اور مرثیہ کی تاریخ میں آپ کو وہ مقام عطا کیا جس کے استحقاق کی صلاحیت آپ مبدء فیاض کی بارگاہ سے لیکر آئے تھے۔

میں رسالہ "مسافر" کی ادارت کے سبب مستقلاً مراد آباد میں رہنے لگا، جس کا دفتر اسلامیہ مسافر خانے میں تھا۔ یہ مسافر خانہ ریلوے اسٹیشن کے بالکل سامنے واقع ہے۔ برابر نسیم صاحب لکھنؤ سے امروہہ آتے۔ مراد آباد ایسا جنکشن تھا جہاں لکھنؤ سے آکر امروہہ کی طرف جانے والے مسافروں کو، دوسری گاڑی کے انتظار میں بسا اوقات کئی کئی گھنٹے اسٹیشن پر رکنا پڑتا تھا۔ مسافر کا دفتر اسٹیشن سے کوئی سو قدم کے فاصلے پر تھا۔ نسیم صاحب لکھنؤ کی گاڑی سے اترتے اور میرے پاس چلے آتے۔ پھر امروہہ کی واپسی میں ریل سے اترتے اور میرے دفتر میں آجاتے۔ اب اُن تعلقات کا دور شروع ہوا جنھیں برادرانہ، بے تکلفانہ اور دوستانہ کہہ سکتے ہیں، میں اپنا نیا کلام یا کوئی اور مضمون سناتا۔ وہ اپنے نئے مرثیے سناتے۔ ابن کوکب مرحوم اور عادل ادیب مرحوم بھی اس صحبت میں شرکت کرتے اور محظوظ ہوتے۔

لکھنؤ دیکھنے کو میرا بھی دل چاہتا تھا، چنانچہ نسیم صاحب کی اخوت معنوی کے وسیلے سے میں بھی دو تین دفعہ لکھنؤ گیا، نسیم صاحب کی مجلسوں میں ان کے نئے مرثیے سنے۔ ان مجلسوں میں تقریباً کل علما اور شعرا سے ملاقاتیں ہوئیں، نسیم صاحب "خیال گنج" میں رہتے تھے۔ قریب ہی قیصر باغ تھا، جہاں راجہ صاحب محمود آباد اور راجہ سلیم پور کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا، اور انھوں نے ضیافت سے بھی نوازا۔ ہائے کیا زمانے تھے:

یاد باد آں روزگاراں یاد باد

اسی زمانے میں دو سال مسلسل اربعین کے عشرے میں نسیم صاحب کو سننے کے لیے، میں روزانہ امروہہ جاتا رہا جس کی صورت یہ ہوئی کہ نسیم صاحب کے خاندان میں دو عزا خانے خاص تھے۔ ایک نورالحسن مرحوم کا عزا خانہ کہلاتا تھا، اور دوسرا اکبر علی مرحوم کا۔ اول الذکر عزا خانے میں مولانا ابن حسن صاحب نونہروی ۱۰ صفر سے ۱۹ صفر تک مجلس پڑھتے تھے۔ یہ مجلس دن میں ۱۲ بجے تک ختم ہو جاتی تھی۔ آخر الذکر امام باڑے میں لکھنؤ سے نسیم صاحب کو عشرہ پڑھنے کے لیے بلوایا گیا۔ یہ مجلس چار بجے شروع ہوتی تھی۔ نسیم صاحب نے یہ التزام کیا تھا کہ صبح کی مجلس میں قبلہ نونہروی صاحب جو حال پڑھتے تھے، شام کی مجلس میں نسیم صاحب بھی اسی حال کا مرثیہ سناتے تھے۔ جس کے لئے انھیں ۱۲ بجے سے ۴ بجے تک کے وقفے میں بہت سے نئے بند کہنا پڑتے تھے۔ اس التزام سے دونوں مجلسوں کی رونق میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا۔ شہر کے ہزاروں سامعین دونوں مجلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ عزا خانے کھچا کھچ بھر جاتے تھے کھوے سے کھوا چھلتا تھا، تل دھرنے کی جگہ نہ ملتی تھی، خود قبلہ نونہروی صاحب نسیم صاحب کی مجلس میں شرکت فرماتے تھے۔ موصوف اگرچہ نسیم صاحب سے بہت دور لکھنؤ میں تشریف رکھتے ہیں، مگر اب تک اس واقعے کو نسیم صاحب کے اعتراف کمال کے طور پر بیان فرماتے ہیں۔ میں بھی مرثیہ سننے کے اشتیاق میں مراد آباد سے امروہہ جاتا اور شب میں کسی وقت واپس آ جاتا۔ ان مجالس کو سننے کے بعد میں نے اسی زمانے میں نسیم صاحب کی شاعری سے متعلق یہ رائے قائم

کرلی تھی کہ وہ خوش گو، خوش فکر، قادر الکلام، اور بلاغت کے ہر پہلو پر عبور رکھنے والے شاعر ہیں اور تاریخ ادب ان کے کمال فن کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کر سکتی۔

تکلف برطرف، آج نسیم امروہوی میرے مزاج داں ہیں اور میں ان کا نظر شناس! چالیس سال گزر چکے ہیں، آج تک ہمارے پر خلوص تعلقات ایک نہج پر قائم ہیں۔

مولانا کی سیرت میں ایک بہت ہی خاص بات قابل ذکر یہ ہے کہ اُن کی " زندگی شعر سے اور شعر زندگی سے " ہم آہنگ ہے۔ مثلاً آپ نے ایک مرثیے میں عون محمد کے اخلاق کی مدح کی ہے، جو کمسنی میں چھوٹے اور بڑے ماموں جان کے ساتھ فوج مخالف کے مقابل کھڑے ہوئے ہیں:

ہیں بردبار بھی یہ بہادر غضب کے ساتھ غصے میں ہیں بھرے ہوئے لیکن ادب کے ساتھ

آپ کے اس شعر کو آپ کی زندگی سے ملایئے تو حرف بحرف ہم آہنگ پایئے گا۔ اتنا پاس ادب جتنا کہ آپ میں ہے، شاید ہی کسی میں ہو۔ جب کوئی بزرگ آتا ہے، چاہے وہ عالم ہو یا جاہل، امیر ہو یا غریب، آپ سلام میں سبقت کرتے ہیں اور حسب موقع سرو قد یا نیم قد اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں، اتنی عمر آئی مگر کبھی آپ کو کسی چھوٹے سے بھی " تو " یا " تم " سے تخاطب کرتے نہیں دیکھا، بیٹوں کو البتہ " تم " سے خطاب کرتے ہیں ۔ ایک جگہ نعت میں فرمایا ہے،

دل چھین لیا اس کا جو سر لینے کو آیا

یہ خوبی آپ میں اس حد تک پائی جاتی ہے کہ جو ایک دفعہ آپ سے مل لیتا ہے، اس کے دل میں آپ کا گھر ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آپ کے حریف اور دشمن بھی آپ کی خوش خلقی، تواضع اور حسن سلوک کا کھلے لفظوں میں اعتراف کرتے ہیں ۔ نعت کے مذکورہ مصرع کے بعد فرماتے ہیں،

ادنیٰ کو بھی پاس اپنے تواضع سے بٹھایا

آپ کے پاس کوئی بھی مہمان آئے، اور کیسا ہی خستہ حال کیوں نہ ہو حتیٰ کہ بعض اوقات ملازم کو بھی، بشرطیکہ وہ (آپ کے لفظوں میں) نماز روزے کا پابند ہو اپنے پاس بٹھاتے اور اپنی مثل

کھلاتے اور پہناتے ہیں۔ جناب سرورِ کائنات صلعم اور ائمہ اہلبیت کی سیر چشمی، سخاوت اور ایثار کی آپ نے جا بجا مدح کی ہے:

ایسے تھے سیر چشم کہ جینے سے سیر تھے

جو کھا کے جو اہم کے خزانوں کو لٹایا

فقر میں محوِ سخاوت تھے امیر المومنیں ‏ ‏ ‏ مال پہ ہے کچھ امیری دل تو انگر چاہیے

خدا کی راہ میں سر دے دیے سخی ایسے

قدسیوں سے عرش پر سن کے زہرا کی عطا ‏ ‏ ‏ ہل اتیٰ بھی ڈھونڈتا آیا ہے باب فاطمہ

یہ سب اوصاف نسیم صاحب میں بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی میں محنت شاقہ اور عرق ریزی سے ہزار ہا روپے کمائے، مگر کبھی سرمایہ کی صورت میں ایک ٹھیکری کوڑی جمع نہیں کی۔ احباب یا اعزہ کی ضرورت میں بطور نذر جو کچھ انھیں دے دیا، پھر کبھی واپسی کی تمنا نہیں کی۔ یگانے اور بیگانے طالب علموں کی فیس ادا کر دی، کتابیں منگوا دیں، سردی کے کپڑے بنوا دیے۔ کتنی ہی بیواؤں اور یتیموں کی مستقل اور عارضی اعانت کر دی۔ لاوارث بچیوں کا جہیز مہیا کر دیا۔ ساکین کے لیے آزوقہ فراہم کر دیا، غرض آپ کی جیب ہمیشہ کے لیے آپ کے اس شعر کا مصداق رہی:

جو کچھ خدا سے ملا دے دیا فقیروں کو ‏ ‏ ‏ خدا کے ہاتھ کی مٹھی کبھی بھری نہ رہی

گھر میں جا کر دیکھیے تو معمولی پلنگ، بستر، کرسی، میز، ضروری برتن اور سیدھے سادے سامان کے علاوہ ریڈیو تک نظر نہ آئے گا، جو آج کل لازمۂ زندگی ہے۔ یہ سادگی دیکھ کر کوئی شخص

نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی کلاس ون، گریڈ کے ملازم کا گھر ہے۔ بچوں کی آسائش اور گھر کے کام کاج کے لئے ایک دو ملازم ضرور رکھتے ہیں، لیکن اپنی چلم خود بھرتے ہیں، اپنا راشن بازار سے آپ لاتے ہیں، اور ضرورت پڑنے پکھا انہیں خود ہی پکا لیتے ہیں، ہر کسی سے انکسار کے ساتھ ملتے ہیں۔ "الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس" کا مجسمہ ہیں حق اللہ سے زیادہ حقوق العباد کا خیال رکھتے ہیں، جیسا کہ ایک مرثیے میں بھی کہا ہے:

نماز و روزہ و حج و زکات و خمس و جہاد — نہیں جو رہ گئے بدلے کے بچو فریاد

غضب کی جا ہے کہ بھولے نبی کا یہ ارشاد — کہ ہے عبادتِ حق بعد پہلے حقِ عباد

ہر ایک طاعت خالق کی ہے قضا ممکن

یہ فرض ہو جو قضا پھر ادا ہے ناممکن

جس محلے میں جا کر رہتے ہیں وہاں کے لوگ اپنے معاملات میں آپ سے مشورہ لیتے ہیں، اور باہمی نزاعات کے فیصلے میں آپ کو 'حَکَم' بناتے ہیں۔ یہ سب وہ اخلاق ہیں جو آپ نے محمدؐ و آل محمدؐ کی سیرت کے مطالعے سے اخذ کر کے جا بجا اپنے مراثی میں نظم کئے ہیں، اس طرح آپ کی زندگی اور آپ کے شعر میں مطلقاً تضاد نہیں پایا جاتا۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ نسیم صاحب قدیم محاسن اخلاق کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں، ان سے مل کر طبیعت کو عجیب قسم کی بشاشت کا احساس ہوتا ہے، جیسے نسیم صبح کا ایک جھونکا کسی مقفل قید خانے میں در آیا اور ہر گوشۂ تاریک کو مہکا گیا۔

کسی مبالغے کے بغیر عرض کر رہا ہوں کہ نسیم صاحب کی علمی صحبتوں سے میں نے بے حد فیض اٹھایا ہے، ہم گھنٹوں نکاتِ شعر پر گفتگو کرتے اور معانی کے نئے نئے گوشے سامنے آتے۔ حضرت نسیم اعلی اللہ مقامہ کے بارے میں بزرگوں سے سنا ہے کہ وہ بیک وقت غزل، مرثیہ، قصیدہ اور گت اپنے تلامذہ کو املا کراتے اور ایک ایک صحبت میں کئی کئی اصنافِ سخن کے خزانے معمور کر دیتے، نسیم صاحب کی ذکاوت طبع کا عالم بھی یہی ہے۔ میں نے

ان سے زیادہ مستعد اور مشاق شاعر آج تک نہیں دیکھا، وہ جم کر بیٹھتے ہیں اور پورا مرثیہ کہہ کر اٹھتے ہیں، اور جس رنگ میں چاہتے ہیں کہہ لیتے ہیں۔ نسیم کا مرثیہ عہد جدید کا مرثیہ ہے، زبان، بیان، فنی اسلوب، پیرایۂ اظہار، اور معانی و معیار کے لحاظ سے ان کے مراثی اُردو ادب کا بیش بہا ذخیرہ ہیں، مگر ان کی شاعرانہ شخصیت کو فقط مرثیہ گوئی تک محدود کر دینا بہت بڑی ستم ظریفی ہے۔ وہ ہر صنفِ سخن کے شاعر ہیں اور قادر الکلام! نظم ہی نہیں نثر کی بھی تمام اصناف کو انھوں نے اپنے قلم سے مالا مال کیا ہے۔ نسیم صاحب یوپی میں نصابی کتابوں کے سب سے بڑے مصنف تھے۔ ان کی بے شمار کتابیں درس میں شامل تھیں۔ یہاں آکر بھی وہ نصاب نویسی سے غافل نہیں رہے، پھر متعدد علمی و تاریخی تصانیف بھی ان کے قلم سے نکل چکی ہیں۔ ان کی نسیم اللغات سے کس نے استفادہ نہیں کیا۔ اور اب تو وہ ایک ایسی لغت کی تدوین میں مصروف ہیں جو آکسفورڈ کے بعد مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں پہلی یادگار فرہنگ ہوگی، جس میں کئی صدی کے اُردو لٹریچر کے الفاظ اور ان کے ماخذ کو سمیٹ کر یکجا کر دیا گیا ہے اور جو رہتی دنیا تک آنے والی نسلوں کو نسیم امروہوی کی یاد دلاتی رہے گی۔

رئیس امروہوی

نسیمِ امروہوی کی تاریخ گوئی

فاضل مشرقیات مولانا شبیہ الحسنین محمدی

جناب مولانا سید قائم رضا صاحب نسیم امروہوی ہندوستان و پاکستان سید؛
کے اُن ، گنے چنے شعراء میں ہیں جو مختلف اصناف شعر پر ماہرانہ دستگاہ رکھتے ہیں؛
ایک باوقار کرسی کی زینت ہیں اور غالباً ملک کا بڑے سے بڑا نقاد اور سخن فہم اس
باب میں میری تائید کریگا کہ جس صنفِ سخن میں بھی حضرت نسیم قلم اٹھاتے ہیں اپنی
انفرادیت کا لوہا منوا لیتے ہیں۔ عام طور سے لوگ جناب نسیم کو مرثیہ گو شاعر کی حیثیت
سے جانتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ رباعی ، سلام ، قصیدہ ، مثنوی ، غزل
ترجیع بند ، ترکیب بند اور تاریخ گوئی میں نسیم کا مرتبہ مرثیہ گوئی سے کسی
طرح کم نہیں۔ عام طور سے غزل گو شعرا ، مرثیہ اور قصیدہ نہیں لکھ سکتے ، یا
مرثیہ گو شعراء غزل اور قصیدہ نہیں کہہ پاتے لیکن حضرت نسیم کی جولانیٔ طبع

کے لیے ہر صنفِ سخن یکساں وسعت رکھتی ہے تاہم میں اس وقت صرف حضرت نسیم کی تاریخ گوئی کی طرف متوجہ ہوں۔

تاریخ گوئی کا فن عربوں میں نہ محبوب تھا نہ موجود۔ تاریخ گوئی ایران سے شروع ہوئی لیکن ایران میں بھی بہت کم شعراء نے دلچسپی لی ہے یا اتنی کامیابی کے ساتھ تاریخ نہیں کہہ سکے ہیں جتنی اردو کے شعراء کو اس فن میں مہارت ہے۔ اور اس وجہ سے بہت تھوڑے شعراء ایران نے تاریخ گوئی کے فن کو اپنایا ہے۔ ہندوستان میں فنِ تاریخ گوئی امکانی بلندیوں تک پہنچا تقریباً ہر بلند مرتبہ شاعر نے بڑی دلچسپ اور اثر انگیز تاریخیں کہی ہیں۔

تاریخ کا کمال یہ ہے کہ ایک مصرعے میں پورا واقعہ آجائے اور اعداد پورے کرنے کے لیے ایک لفظ بھی حشو کے طور پر نہ ہو۔ نسیم صاحب کی تاریخوں میں عموماً یہ وصف اپنی حدِ کمال تک پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم اس مقام پر دو قطعہ ہائے تاریخ پیش کرتے ہیں:

۱۔ امروہہ (محلہ مجاپوتہ) میں ایک بزرگ تھے، مولوی سید معجز حسن مرحوم، انھیں ان کی وصیت کے مطابق محلہ کے عزاخانہ میں پائین منبر دفن کیا گیا۔ نسیم صاحب نے تاریخ فرمائی:

دنگ تھا ہاتف کہ دربارِ شہِ مظلوم میں — اللہ اللہ کس مطیع پنجتن کی قبر ہے
کہتے کہتے مصرعِ تاریخ بول اٹھا نسیم — یہ تہِ منبر یہاں معجز حسن کی قبر ہے

۱۳۶۲ھ

۲۔ عماد العلماء حضرت مولانا السید محمد رضی صاحب قبلہ نبیرۂ سرکار نجم العلماء (طاب ثراہ) جب تحصیل علوم دینیہ کے بعد عراق سے واپس تشریف لائے تو سرکار نجم العلماء نے نسیم صاحب کو حکم دیا کہ وہ رسالۃ الواعظ میں

اشاعت کے لیے اس موقع پر ایسا قطعہ تاریخ کہیں جس میں پوری بات آجائے، چنانچہ نسیم صاحب نے حسب ذیل قطعہ فرمایا:

درِ علمِ نبیؐ کے شہر سے پلٹے ہیں مولانا ۔۔۔ بہ استعدادِ علمی نشرِ حق پر مستعد ہو کے
نسیم اب لکھ دو یہ تاریخ حکمِ نجم ملت سے ۔۔۔ رضیؔ آئے نجف سے لکھنؤ میں مجتہد ہو کے

۱۹۳۹ع

انھیں دو قطعوں پر موقوف نہیں، جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے نسیم صاحب کے مادہ ہائے تاریخ میں عموماً بھرتی اور حشو کا کوئی لفظ نہیں ہوتا۔ اگر وہ تخرجہ کرتے ہیں تو نہایت حسین (دیکھیے تاریخ زیبا ردولوی کا آخری شعر) تعمیہ کرتے ہیں تو نہایت خوبصورت (دیکھیے تاریخ زیبا ردولوی شعر ۲۹) اس کے علاوہ انھوں نے تاریخ گوئی میں بھی اپنی مجتہدانہ طبیعت کے اقتضا سے نئے نئے گوشے نکالے ہیں مثلاً یہ کہ مصرعے کے محض نقطہ دار حروف سے یا صرف بے نقط حروف سے تاریخ کا استخراج کیا ہے (دیکھیے تاریخ جشن رئیس و تاریخ وفات علامہ ترابی) بعض مادّے مصرعے کی بجائے پورے شعر سے نکالے ہیں (دیکھیے تاریخ نظام دکن وغیرہ) بعض تاریخوں میں صرف حروفِ بینات[1] کو شمار کیا ہے (دیکھیے تاریخ زیبا ردولوی شعر ۲۸) اور بعض مادوں میں زبر و بینات دونوں سے کام لیا ہے۔ آخر الذکر دونوں قاعدوں کا برتنا یعنی بینات یا زبر و بینات سے تاریخ کا استخراج اتنا مشکل ہے جسے بڑے بڑے اساتذہ نے بھی شاذ و نادر ہی برتا ہے۔

---

[1] مثلاً لفظ "خدا" میں تین حرف ہیں (۱) خ (۲) د (۳) ا، یہ تینوں حروف "زبر" کہلاتے ہیں۔ اگر ان حروف کو لفظوں میں لکھیں تو اس طرح لکھیں گے: خا، دال، الف "ان میں خا کا "ا" "دال" کا "ال" اور "الف" کا "لف" بینات ہیں۔

لیکن نسیم صاحب نے متعدد تاریخوں میں ان دونوں راہوں کا اختیار کیا ہے۔
تاریخ گوئی پر نسیم صاحب کو کتنا اقتدار حاصل ہے اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب آپ ایک ہی واقعہ کی متعدد تاریخیں ایک ہی زمین میں بے تکان کہتے چلے جاتے ہیں۔

عام طور سے تاریخ کسی باحیثیت آدمی کی وفات یا کسی عمارت کی تعمیر کے سلسلے میں یا شادی بیاہ کے موقع پر کہی جاتی ہے۔
جناب نسیم نے بھی تاریخ گوئی میں تقریباً ہر مرحلہ پر فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ بلند مرتبہ لوگوں میں سرکار ناصر الملت، جناب نجم العلماء، خطیب اعظم مولانا سید محمد دہلوی، علامہ رشید ترابی، جناب راجہ صاحب بہادر مرحوم آف محمود آباد، ڈاکٹر سید علی حسنین زیبا ردولوی وغیرہ کی وفات حسرت آیات کے مواقع پر بڑی معنیٰ خیز تاریخیں کہی ہیں۔ بعض مصرعے تو اس قدر برجستہ ہیں کہ جن کو القائی کہا جا سکتا ہے مثلاً جناب ناصر الملت کے مادۂ تاریخ میں فرمایا ہے:

"ہیں علم و زہد ناصر ملت کے سوگوار"

۱۳ ۵ ۶۱

راجہ محمد امیر احمد خاں کا سال وفات کیا خوب نکالا ہے:

"خدا نے لکھ دی ضریح امیر احمد خاں"

۱۹ ۶ ۷۳

مرحوم سید علی حسنین زیبا ردولوی کے قطعہ تاریخ میں جناب نسیم نے انتیس ۲۹ شعر کہے ہیں جن میں تقریباً دس مصرعوں سے تاریخ نکلتی ہے ایک شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں جس کے دوسرے مصرعے میں تاریخ ہے:

کن فکاں تھا امرِ حق رضواں پکارا نا گہاں
وہ سناحیدرؑ نے زیبا کا قصیدہ خلد میں

۱۳ ھ ۸۸

خطیبِ اعظم مولانا سید محمد صاحب دہلوی نے ملّتِ جعفریہ کی جو بیش بہا خدمات انجام دیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ جنابِ نسیم نے خطیبِ اعظم کے سانحۂ وفات پر ایک طویل قطعہ سپردِ قرطاس فرمایا ہے اس کے ہر مصرعے میں خطیبِ اعظم کے اوصافِ فاضلہ اور خدماتِ جلیلہ کا اعتراف واعلان کا پرتو پایا جاتا ہے، اور اس قطعہ کا ہر شعر حرزِ جاں بنانے کے قابل ہے دو تین شعر کسی انتخاب وامتیاز کے بغیر پیش کر رہا ہوں:

یا الٰہی نور کی بارش جو ہے شام و سحر — یہ کسی اہلِ ولا کی یا ولی کی قبر ہے
ذاکرِ فرزندِ ختم المرسلیں کا ہے مزار — یا خطیبِ اعظمِ آلِ نبیؐ کی قبر ہے
حق طلب تھی جراتِ اخلاق تاج و تخت ہے — پرتوِ خلقِ حسینؑ ابنِ علیؑ کی قبر ہے
جس کا مسلک تھا بہر حال اتحادُ المسلمین — اس نشانِ پائے شاہِ لوذعی کی قبر ہے
کیا لکھوں تاریخِ رحلت خود ہیں حیراں نسیم — یہ ملک کی قبر ہے یا آدمی کی قبر ہے

"ہے یہ جائے فاتحہ اے زاہدانِ نیک دل
مولوی سید محمد دہلوی کی قبر ہے"

۱۳ ھ ۹۱

نمایاں عمارتوں کی تاریخ میں بھی جنابِ نسیم نے اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ ہز ہائی نس سید رضا علی خاں صاحب والی رامپور نے اپنی کوٹھی خاص باغ میں مردانہ اور زنانہ دو عزاخانے بنوائے تھے مولانا نسیم نے ان دونوں عزاخانوں کی تعمیر کی تاریخ میں کئی اشعار لکھے ہیں اِن دونوں

مصرع ہائے تاریخ کی لطافت ملاحظہ فرمائیے:

ناگہاں عیسیٰ پکارے لکھ دو یہ مصرع نسیم
"دو عزا خانے ہیں اب گویا دلِ وجانِ رضا"

۱۹ ۶ ۴۹

شاہد ہجرت نے اس مصرعے کو سن کر دی ندا
صاف کہہ دو ہیں یہ دونوں دین و ایمانِ رضا"

۱۳ ھ ۶۹

عزیز آباد کراچی میں امام بارگاہ ابوتراب تعمیر کیا گیا۔ مولانا نسیم نے اس سلسلے میں جو قطعہ تاریخ سپردِ قلم فرمایا اس کا مصرعِ تاریخ بھی بڑا پُر کیف ہے:

"ہے یہ امام بارگاہ حاصلِ فیض بوتراب"

۱۹ ۶ ۷۱

۱۹۷۱ء میں جناب رئیس امروہوی کے اعزاز میں "جشنِ رئیس" کا اہتمام کیا گیا مولانا نے اس موقع پر برجستہ اور خوبصورت قطعہ کہا۔ مصرع تاریخ کی عظمت و جلالت رئیس امروہوی کے اوصاف نظم و نثر نگاری کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر شخص محسوس کرے گا۔

ساقط کر کے حروفِ مہمل لکھ دو یہ تاریخ نسیم
"جشنِ رئیس ناظم و ناثر جانِ جہانِ علم و ادب"

۱۹ ۶ ۷۱

دوسرے مصرعے کے حروف منقوط سے تاریخ نکلتی ہے۔ ایک ادیب کے کارناموں سے تعلق رکھنے والی تاریخ میں "تخرجے" کے موقع پر "حروفِ مہمل" (یعنی بے نقط حروف) کا اسقاط کتنا معنی خیز فقرہ ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی

شگفتہ تاریخیں جناب نسیم کے قلم گوہر بار کے کرشمہ کی حیثیت سے موجود ہیں، اِن میں سے ہمیں جس قدر بھی مل سکی ہیں، درج ذیل کرتے ہیں ناظرین پڑھیں اور لطف اندوز ہوں۔ خاتمۂ کلام میں جناب نسیم کے متعلق میں اپنی حیرانی کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور میں جانتا ہوں کہ میری طرح مولانا کے اکثر احباب اِس حیرانی کا شکار ہیں وہ یہ ہے کہ جناب نسیم ذہنی طور پر اتنی مشکلات اور اتنی الجھنوں کا عنفوانِ شباب سے شکار چلے آرہے ہیں کہ جن کے ادنیٰ تصور سے دماغ اور قلب انتشار و اختلاج کی زد میں آجاتے ہیں۔ اس گردش میں ہر صنفِ سخن میں استادانہ سخن گوئی کا مظاہرہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح ممکن ہوتا ہے۔ میرا تو یہ احساس ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی چشم عنایت کا کوئی نورانی ذرّہ جناب نسیم کا مجسمہ ذہن و دماغ بنا رہا ہے ورنہ اِن حالات میں مکمل مرثیے، منظم قصیدے، معنی خیز رباعیاں دل میں اتر جانے والی نظمیں کہنا تو کجا مصرع بھی موزوں نہیں کیا جاسکتا۔ کسی فارسی شاعر نے کہا تھا کہ

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

میں سمجھتا ہوں کہ یہ صرف امام مظلومؑ کے گوشۂ چشم ہی کی کرامت ہے، انسان کے بس کی بات نہیں۔

وفات و تدفین حضرت ناصر الملت طاب ثراہ

وفات : لکھنؤ

تدفین : بمقام آگرہ در احاطہ مزار قاضی نور اللہ شوستری (شہید ثالث)

ناصر کی لاش لے کے جو آئے ہیں جاں نثار
ہاتف بھی ہے مزار پہ قاضی کے اشکبار

مصرع یہ سال مرگ کا پڑھتا ہے بار بار
ہیں علم و زہد ناصر ملت کے سوگوار
۱۳۶۱

تاریخ دفن بھی یہ عجب دلخراش ہے
وہ نور کے مزار میں ناصر کی لاش ہے
۱۳۶۲ھ

(از مرثیہ ناصر الملت)

پُرسے کی مقبولیت

(شام غریباں میں ہر ہائینس رفعت زماں بیگم (آف رامپور) کا پُرسہ بارگاہِ جناب شہربانو میں مقبول ہونے کے موقع پر)

بنائی بارگاہِ شہربانو شہر سے باہر
ہوئیں رفعت، مقرب بارگاہِ شہربانو میں

شب عاشور سے روتی جو بیٹھیں اُن کے کنبے کو
رہے آنسو رواں آنکھوں سے راہ شہربانو میں

شب شام غریباں روتے روتے نصف جب گزری
چلیں پُرسے کو بی بی بارگاہ شہربانو میں

حروف تعزیت منہ سے نکلتے ہی جواب آیا
عقیدت نے جگہ پائی نگاہ شہربانو میں

صدا آئی کبھی "اچھا" کبھی "ہوں" اور "ہوا" گویا
کرامت کا اضافہ عز و جاہ شہربانو میں

سُنی اوروں نے بھی دو تین بار آواز وہ غیبی
اشارہ تھا کہ بی بی ہیں پناہ شہربانو میں

نسیم اس واقعہ کا مصرع تاریخ یہ لکھ دو
"یہ ہے مقبول پُرسہ بارگاہ شہربانو میں"
۱۳۶۸ھ

عزا خانہ زنانہ و مردانہ

کوٹھی خاص باغ ریاست رام پور بنا کردہ ہز ہائینس رضا علی خاں مرحوم

ہے یہی تسلیم کی منزل یہی شانِ رضا ؎ صبر کا سودا ہو سر میں، دل میں ارمانِ رضا
دو مہینے میں بنائے تعزیہ خانے بھی دو آ گئے دو قصرِ جنت زیرِ فرمانِ رضا
پا رہے ہیں مومنین مجلس میں آ آ کر ثواب بے تکلف لٹ رہی ہے نعمتِ خوانِ رضا
دیکھنا تعمیرِ حق کا ہے یہ اک ادنیٰ اثر ذاکرِ شاہِ خراساں ہے ثنا خوانِ رضا
فرصتِ اول میں بنوایا مکانِ اہلِ بیت تولتی ہیں دل کی آنکھیں قدرِ عرفانِ رضا
دو عزا خانے ہیں بہرِ مرد و زن دونوں نفیس ایک ہے ایوانِ رفعت ایک ایوانِ رضا
ہے زبانِ حال سے گویا یہ تعمیرِ جدید بڑھتی جائے گی عزا تا حد امکانِ رضا (ہز ہائینس)
قصرِ شاہی کے ہر اک گوشے سے اعلیٰ ہیں وہ قصر جن میں ہو روحِ رسولِ پاک مہمانِ رضا
یہ عزا خانے کہیں گے حشر میں وقتِ حساب ہم ہیں دو عادل گواہِ جوشِ ایمانِ رضا
فکر تھی دونوں کی وہ تاریخ یکجائی لکھوں جس کے اک اک لفظ میں ملحوظ ہو شانِ رضا
ناگہاں عیسیٰ[۵] پکارے لکھ دو یہ مصرعِ تمام دو عزا خانے ہیں اب گویا دل و جانِ رضا
۱۹۴۹ء

شاہِ ہجرت نے اس مصرع کو سن کر دی ندا
صاف کہدو "ہیں یہ دونوں دین و ایمانِ رضا"
۱۳۶۹ھ

وفات مرزا شوکت علی مرحوم

ابن مرزا اسکندر بیگ حیدر آباد سندھ

نہیں کم حشر سے اس نخل کا نذرِ خزاں ہونا نہ جس میں ایک گل آئے نہ جس میں [illegible]

---

۵ مادے کے عیسوی ہونے کی طرف اشارہ

زہے مرزا سکندر بیگ بیٹے کی تو نے وہ منزل
لرزتے تھرتھراتے جس کی سرحد میں ولی آئے

یہی کہتا دل ان کا جواں بیٹے کی میت پر
مدد کو اب مری صبر حسینؑ ابن علیؑ آئے

پسر کو اپنے ہاتھوں سے سپردِ خاک فرما کر
دعائے مغفرت کر کے بصبر منجلی آئے

گھٹا اشکوں کی امڈی تو ندی کی ضبط نے بڑھ کر
یہ موج آنکھوں سے ہٹ کر دل و ذہنِ بانعم علی آئے

بہت کی تھی جو خدمت ذاکرِ دیں کی تو تجھوا دے نے
جناں میں اس کے استقبال کو حق کے ولی آئے

نسیمِ باغِ حیدر جلد لکھ تاریخ کا مصرع
پرے باندھے وہ رحمت کے مضامینِ جلی آئے

کہا ہاتف نے بیساختہ ناگاہ گردوں سے
کہ "وہ بزمِ جناں میں میرزا شوکت علیؑ آئے"

۱۳ ھ ۶۹

قطعہ تاریخ

تعمیرِ مسجد الرضا

(بنا کردہ ہز ہائینس میر علی مراد خاں ٹالپر میر خیرپور)
بمقام کوٹ ڈی جی

علی مرادِ دوم نے جو کوٹ ڈی جی میں
بذوق و شوق یہ مسجد کرائی ہے تعمیر

دراس کے پانچ گواہی یہ دیں گے محشر میں
کہ ہے فقیرِ درِ پنجتنؑ یہ مردِ امیر

جب اس کا نام سنا "مسجد الرضاؑ" میں نے
سمجھ لیا کہ یہ عشقِ رضاؑ کی ہے تاثیر

وہی رضاؑ جو امامِ غریبِ مشہد کے
وہی کہ جن کے ہیں جد مرتضیٰؑ جناب امیر

وہی رضاؑ جو خریدارِ مرضیِ معبود
وہی رضا جو رضی اور راضیِ تقدیر

وہی رضاؑ جو ہمارے طبیبِ روحانی
وہ جن کی خاکِ لحد ہر مرض میں ہے اکسیر

نسیمؔ نے جو کیا عزم مصرعِ تاریخ
قلم نے فکر سے پوچھا کہ کیا کروں تحریر

یہ ہو، طائرِ فکرِ رسا کہ کیا کہیے — مری رسائی سے بالا ہے رفعتِ تعمیر

پکارے مسجدِ اقصیٰ سے ناگہاں ہستی

کہ سرفراز یہ مسجد بنی بفضلِ قدیر

۵۸   ۶   ۱۹

قطعۂ تاریخ

کتاب شجراتِ ساداتِ امروہہ

مولفہ مولوی سید بشیر حسین

(مقیم امروہہ)

شہر امروہہ، مرادآباد، یوپی، ملکِ ہند — جو کئی صدیوں سے ہے اولادِ زہرا کا چمن

پھول بکھرے جب بہ تقسیمِ ہند اس باغ کے — جا بجا یہ برگِ گل پھیلے تہِ چرخِ کہن

بس گئی خوشبو سے وہ، یہ بس گئے جس خاک پر — خود مہک اٹھتا ہے جاتا ہے جہاں مشکِ ختن

حسنِ فطرت دے رہا تھا گو سیادت کی خبر — لیکن اصل و نسل سے واقف نہ تھے سرو و سمن

نخل بندی تھی جو لازم شجرۂ انساب کی — منتظر اہلِ قلم کا تھا ہر اک گل پیرہن

عزمِ صادق سے اٹھے ناگاہ مولانا بشیر — جن کا ہے زورِ قلم سرمایہ دارِ علم و فن

لکھ چکے ہیں گھر گرہستی پر جو اک ایسی کتاب — مرد و زن نے جس سے سیکھے خانہ داری کے چلن

وہ نسب نامہ لکھا ساداتِ امروہہ کا آج — حشر تک جس کو مٹا سکتا نہیں دورِ زمن

مصرعِ تاریخ اس تاریخ کا لکھ دو نسیم

شجرۂ ساداتِ امروہہ کا ہے چیدہ چمن

۸۰۲   ۵۵   ۱۳

وفاتِ والدہ مرحومہ

سیّدہ خاتون اعلی اللہ مقامہا

قیامت خیز غم ہے مرگ مادر — پئے تاریخ کیا مضمون لکھیے
الف یہ آہ کا اٹھ کر پکارا — "مزار سیدہ خاتون" لکھیے

ے تخرجہ کی طرف اشارہ — ۱۳۸۳ = ۱ - ۱۳۸۴

وفات سعید الملت طاب ثراہ

سیف خامہ سے وہ لکھے نصرتِ دینی میں نبرد — سرخرو دین ہوا، غیروں کے چہرے ہوئے زرد
لاکھ شعلوں کو کیا نور کے مضمون نے سرد — آبرو بڑھ گئی اس قوم کی جس کے تھے یہ فرد

بہر تاریخ وفات اب تو کہے کل ملت
"مسندِ علم و عمل قبر سعید الملۃ"

۱۳۸۷ ھ

(از مرثیہ سعید الملت)

وفات نظام سابع دکن

مرحلہ مرگ ناگہانی کا — ایک وقفہ ہے زندگانی کا
تیر بارانی حوادث میں — حوصلہ کس کو سخت جانی کا
زندگی اور اس کا ذوق نمو — بلبلہ ہے برستے پانی کا
سب یہ تاب و توانِ عہد شباب — پیش خیمہ ہے ناتوانی کا
صبح پیری کا خندۂ بے کیف — مضحکہ عالم جوانی کا
کچھ نہیں ہے یہ مرگ و زیست مگر — نقش قدرت کی قہرمانی کا

زیست تمہیدِ مرگِ ناکامی   مرگ آغاز کامرانی کا
زندگی، موت کے اشارے سے   امتحاں فہم و نکتہ دانی کا
موت اک جزوِ ناتمامِ عمل   عمرِ جاوید کی کہانی کا
کس لیے جستجوئے آبِ حیات   فائدہ عیشِ جاودانی کا؟
مرنے والے فنا نہیں ہوتے   موت دعوکا ہے بے نشانی کا
برگ ریزِ خزاں کے ہاتھوں سے   سازوساماں ہے گلفشانی کا

جو نگاہوں سے دور رہتے ہیں
جان و دل کے حضور رہتے ہیں

موت ہے مرضیِ قضا و قدر   جبر پر کیا ہے اختیارِ بشر
پھر بھی فرقت میں تڑپنے والے کی   روتے ہیں دل۔ اگر نہیں پتھر
آہی جاتے ہیں آنکھ میں آنسو   باوجودِ کمالِ فکر و نظر
وہ بھی اک بار رو ہی دیتا ہے   غمکدے میں جو غیر کا ہو گزر
اور بالفرض اگر نہیں روتا   پھر بھی ہنستا نہیں ہے رونے پر
بن ہی جاتی ہے شکل رونے کی   اہلِ میت کا دردِ دل سن کر
کتنے ہی ضابطہ و متین سہی   ابھی دیکھا نہیں ہے موت نے گھر
یادِ میت میں اشک، فطرتِ غم   مرغِ رشتہ بپا کی جنبش پر
کون ان کے لیے نہ روئے گا   تھے جو وجہ سکونِ قلب و جگر
دستبردِ خزاں نے لوٹ لیے   ہائے کیا کیا گلِ شگفتہ و تر
وائے جورِ فلک سے خاک ہوئے   کیسے کیسے نہالِ بار آور
وقت کا اقتضا کرو رحم ہیں   موت کی ضد میں کے ہو گئے امر

زیست مانا کہ پائیدار نہیں
موت کا بھی تو اعتبار نہیں

صبحدم اک شگوفۂ خنداں — بے فضائے چمن پہ جلوہ فشاں
قرۃ العین نرگسِ شہلا — مرہمِ داغِ لالۂ نعماں
رونق جلوہ گاہ سرو و سمن — نازشِ محفلِ گل و ریحاں
آنکھ اٹھی تو دلنواز بہار — آنکھ جھپکی تو پائمالِ خزاں
وہی شبنم کہ منہ دھلاتی تھی — خاک کے ڈھیر پر ہے ابرِ گریاں
وہی بلبل کہ نغمہ سنج تھی کل — آج ماتم کی صف پہ مرثیہ خواں
بار ہے کہنگی مشیت پر — نام اسی کا ہے گردشِ دوراں
عرصۂ دہر میں بشر کا وجود — توسنِ بے عنان وہم و گماں
مشتِ خاک اور اعتبارِ بقا — آدمی اور اعتمادِ جہاں
حسنِ معصوم و فتنۂ صرصر — ذرۂ ریگ و شورشِ طوفاں
کیسے کیسے سکندر و دارا — کیسے کیسے حسین و شوخ جواں
خلد نظارہ و بہار نظر — فتنۂ روزگار و آفت جاں

ہاتھ اٹھا کر حیاتِ فانی سے
اٹھ گئے بزمِ زندگانی سے

نہ فقط یہ کہ اہلِ دیں نہ رہے — انبیا اور مرسلیں نہ رہے
حکم یہ ہے قضائے مبرم کا — ابدیت کی بو کہیں نہ رہے
بے نیازی کہیں کی ناز کریں — نازبردار و نازنیں نہ رہے
جاگ اے غیرتِ زلیخائی — حسنِ یوسف کے نکتہ چیں نہ رہے
وائے دل ہائے نامرادیِ دل — دلربایانِ دلنشیں نہ رہے
برقِ ایمن کی تابشیں کیسی — موسیِ جلوہ آفریں نہ رہے
گم ہوئی خاتمِ سلیمانی — صاحبِ افسر و نگیں نہ رہے

فلسفہ حل ہو موت کا کیونکر | وہ حکیمانِ دور بیں نہ رہے
نقشِ مانی ہوا ہے بے معنی | اڑ گیا رنگ مہ جبیں نہ رہے
اب کریں مہر و ماہ کس کا طواف | نازشِ کعبۂ بلقیس نہ رہے
حسنِ فطرت نثار تھا جن پر | حسنِ قدرت کے وہ امیں نہ رہے

حق کو سمجھا تھا جن کے آنے سے
اُن کو جانا پڑا زمانے سے

نام جس چیز کا زمانہ ہے | اک تغیر کا کارخانہ ہے
دم ہے گویا مثالِ آبِ رواں | اِدھر آیا اُدھر روانہ ہے
ہے شکستِ حباب سے ثابت | زندگی موت کا بہانہ ہے
فرشِ ماتم زمیں ہے زیرِ فلک | ماتمی جس کا شامیانہ ہے
وہ کبھی ہے سبزہ وار بیگانہ | یاں ہزاروں میں جو یگانہ ہے
دم بدم کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ | سازِ توحید کا ترانہ ہے
سب فنا ہیں سوائے ذاتِ خدا | اک یہی بات عارفانہ ہے
فرصت ستعار و قصۂ عمر | وقت کم اور بڑا افسانہ ہے
اس کی اتنی ہے عمر نامعلوم | جس قدر جس کا آب و دانہ ہے
منتشر ہے نفس کا شیرازہ | موت ان گیسوؤں کا شانہ ہے
برق و خرمن کی چشمکیں فطری | بجلیاں ہیں اور آشیانہ ہے
مختصر یہ کہ ہر نشانِ حیات | ناوکِ مرگ کا نشانہ ہے

کچھ نہیں اس طلسم خانے میں
ہے فنا کو بقا زمانے میں

دہر کا یہ نظام عالمگیر | سب پہ نافذ ہے میر ہوں کہ امیر

ہے اسی سلسلے کی ایک کڑی   ارتحال نظام با تدبیر
وہ نظام انتظام ہے جس کے   تھا دکن اہل علم کی جاگیر
سات پشتوں سے وصف آصف جاہ   شاملِ طینت و خمیر و ضمیر
حاملِ جذبۂ قطب شاہی   بانیِ بزمِ ماتمِ شبیر
سرپرستِ عزا و رسمِ عزا   فاطمہؑ کی دعا۔ ابد تاثیر
وہ محرم کے راز کی محرم   پائے سلطاں کی منتی زنجیر
اپنے گھر میں بنا کے بیت عزا   کر لیا گھر بہشت میں تعمیر
مومن پر خلوص، اہل ولا   عاشق صادقِ جنابِ امیرؑ
اس کے نغمات ملاحِ حیدر سے   حیدرآباد تھا بہشت نظیر
وارث تاج و تخت اہل عطا   صاحب ہیں انہی کے در کا فقیر
اس کا معیار قدر، علم و عمل   اس کا ذوقِ نظر جہان کبیر
مغربی علم آج اردو میں   اس کی آیاتِ فضل کی تفسیر
طالبانِ علوم کا طالب   ریگ صحرا کی منتظر اکسیر
باوجود نعم یہ نفس کشی   ابن آدم کا رزق نانِ شعیر
سادگی وہ کہ درسِ پرکاری   جائزۂ زرنگار کی تحقیر
دل پُر عزم میں وہ سوز و گداز   آدمیت کا درد جس کا خمیر

کیا بتائیں وہ نیک خو کیا تھا
انس انسانیت سے رکھتا تھا

گو حجاب نظر ہے بُعد وطن   دل ہے لیکن شریکِ دفن و کفن
یہ رکھا ہے جنازۂ مرحوم   وہ بناتے ہیں گورکن مدفن
اہل دل کا ہجوم اے توبہ   داغہائے نجوم کا خرمن

شمع مردہ کے اتنے پروانے
سوز غم سے ہے ان کے دل روشن

شور فریاد و آہ و زاری سے
ہل رہا ہے حصار چرخ کہن

باپ کو جیسے روتے ہیں اطفال
یوں ہیں گریاں تمام مرد و زن

اس نے پونچھے ہتھیلیوں سے اشک
اس نے آنکھوں پہ رکھ لیا دامن

میں بھی ہوں اس ہجوم میں جیسے
بکمال تصورات حسن

فکر تاریخ مرگ ہے مجھ کو
مضطرب ہے مری مہارت فن

چھانتا ہوں کبھی زمیں کی خاک
ہے کبھی چرخ ذہن کا مسکن

لب عیسیٰ سے ناگہاں نکلے
یہ سنی بیت وقت فکر سخن

آسماں پر زمین سے پہنچی
آصف سابع و نظام دکن

۱۹۶۷ء

بس نسیم اب بجائے طول کلام
فاتحہ پڑھ برائے روح نظام

اہلیہ مرحومہ عزم صاحب جونپوری

اللہ اللہ کتنی باایمان تھی کیا پاکیزہ قلب
سال رحلت میں ہے جز و مادہ پاکیزہ قلب

خود کنیز فاطمہؑ تھی باپ حیدرؑ کا غلام
ذاکر و مداح شوہر عزم سا پاکیزہ قلب

عزم یعنی منتظر کا منتظر مہدی حسن
مہدی دیں کی ولا کا اقتضا پاکیزہ قلب

تین بیٹے۔ ایک احمد۔ ایک حیدر۔ اک حسن
سب میں مہدی مشترک سب کا بابا پاکیزہ قلب

سیدہ رسید کی زوجہ خود نجیبہ وہ نجیب
سلسلہ دونوں کا تا خیر النسا پاکیزہ قلب

نغیر، پر لکھا ہے دم سن لو جنازے کی نماز
معترف ہیں مومنین با صفا پاکیزہ قلب

مجلس شہ میں ہوئیں بیہوش اکثر ہوشمند
کم ہیں ایسے پُرخلوص اہل عزا پاکیزہ قلب

قبر مرحومہ پہ یہ مصرع رقم کردو نسیم
تربت ام حبیبہ مومنہ پاکیزہ قلب

۱۳۸۸ھ

یادِ مرحوم میں ہے ایمائے زبردیّنات
اک دُرود اِک فاتحہ آکے دست باپاکیزہ قلب

۸۸ ۳ ۱۳

وفاتِ سیّد علی حسنین زیبا رُدولوی

چمن لیے میں کیسے کیسے پھول رضواں نے نسیم — بس گئی ہے رنگ و بو کی ایک دنیا خلد میں
باعمل، عالم، محدث، خطیب خوش لہجہ، واعظ و فقیہ — کل زمیں پر منتشر تھے، آج یکجا خلد میں
مومنین و موقنین و صالحین و زاہرین — حسبِ ترتیبِ مراتب جلوہ آرا خلد میں
متقی، غازی، نمازی، معتکف، زاہد، ولی — قاریٔ قرآں، جن کا بول بالا خلد میں
عابدِ شب زندہ دار و صبح گزار و روزہ دار — صورتیں ہیں نور کی اللہ کیا کیا خلد میں
عاشقانِ آلِ و مستانِ مے خم غدیر — حوضِ کوثر کے کنارے زیرِ طوبیٰ خلد میں
دیکھ اے خاکِ حرم ہر بوترابی کا یہ اوج — خاکساری سے ملا قصرِ معلیٰ خلد میں
اُمتیں موجود سارے انبیا کی ہیں۔ مگر — اُمتِ مَن کُنتُ مولیٰ سب سے اولیٰ خلد میں
خون کا غازہ ملے رخ پر شہیدانِ وفا — سُرخرو اپنے عمل سے پیشِ مولا خلد میں
مرثیہ گویانِ فرزندِ علی و فاطمہ — کھولتے ہیں مرثیہ خوانی کا بستہ خلد میں
ہے وہی مجلس وہی ذاکر وہی سب سامعین — کھنچ گیا ہے ہو بہو دنیا کا نقشہ خلد میں
جس جگہ یہ ذاکر و مداحِ مولا ہیں وہیں — بہرِ زیبا مسندِ شایانِ زیبا خلد میں
کون زیبا؟ وہ جو اک نو واردِ باغِ بہشت — آمد آمد کا ہے جس کی آج چرچا خلد میں
کون زیبا؟ وہ جو فرشِ خاک پر ہے محوِ خواب — مدح خوانی پر ہے تکیہ اور بچھونا خلد میں
کون زیبا؟ وہ کہ جس کے شاہبازِ فکر کا — آشیانہ تھا کربلا میں، اب بسیرا خلد میں
شعر جس کے محفلوں میں سن گئے ہیں جبرئیل — اس سے پہلے جا چکا ہے نام اس کا خلد میں
لے گئی یہ کہہ کے دنیا سے جسے شوقِ سخن — اب سناؤں چل کے مولا کو قصیدہ خلد میں

اللہ اللہ ضعف پیری میں یہ سعی پر ثمر
جان جب کھوئی شباب اس قدر پایا خلد میں

اس ادا سے کچھ قضا آئی کہ دے بیٹھا وہ دل
روح پہنچی لحد میں۔ دل پہلے پہنچا خلد میں

اس محل پر یہ ہوئی تاریخ رحلت برمحل
پیکر لے دل لحد میں روح زیبا خلد میں

گلشن رضواں میں سن کر سب نے یہ مصرع نسیم
اک نیا گلدستۂ تاریخ باندھا خلد میں ۱۳۸۸

رحمت باری نے فرمایا بطور یادگار
محفلیں برپا ہوں پہنچیں جبکہ زیبا خلد میں

کن فکاں تھا امر حق رضواں پکارا ناگہاں
وہ سنا حیدر نے زیبا کا قصیدہ خلد میں ۱۳۸۸

دی صدا جنت کے غنچوں نے چٹک کر دم بدم
عطر بیز محفل حسنین زیبا خلد میں ۱۳۸۸

واہ کہہ کر بول اٹھے بے ساختہ روح الامیں
نوحے زیبا کے ہیں سب مقبول زہرا خلد میں ۱۳۸۸

یہ سماں دیکھا تو چلائے حروف مہملہ
سر بسر حور و قصور و کلک زیبا خلد میں ۱۳۸۸

بالمقابل ان کے بولے عیسوی میں معجمہ
منقبت خواں اور سرافراز زیبا خلد میں

کیوں وہ چپ رہتے پکار اٹھے یہ آٹھوں بہشت
مصطفیٰ بھی سن رہے ہیں شعر زیبا خلد میں ۱۹۶۸

بتینہ حرفوں نے دی بڑھ کر مکرر یہ ندا
دُرّ نجف میں، دلکشی ہے گل میں، زیبا خلد میں

نورؔ نے اٹھ کر کہا ازراہ زبر و بینات
مصطفیٰ، زہرا، علی، حسنین، زیبا خلد میں ۲۵۶

عندلیب شادانی

عندلیب ریاض شعر و سخن
ڈاکٹر عندلیب شادانی

عالم و فاضل علوم ادب
بلبل محفل غزل خوانی

ع۱ حرکتِ قلب یکایک بند ہونے کی طرف اشارہ

ع۲ تعمیہ ع۳ تعمیہ ع۴ بینات کے اعداد دو چند کرنے سے تاریخ پیدا ہوتی ہے۔

ع۵ تخرجہ ع۶ متوفی کا نام "علی حسنین زیبا"

کر گئے کوچ سوئے دار بقا — چھوڑ کر بزم عالم فانی
بہر سالِ قضا لحد پہ نسیم — پڑھ رہی ہے یہ شعر ویرانی
آہ بے جان اب لحد میں ہے ۳۳۲
ڈاکٹر عندلیب شادانی ۱۱۵۷ / ۱۳۸۹

انتخابات میں پیپلز پارٹی کی کامیابی

پیپلز پارٹی کی جو بالا ہوئی ہے بات — دراصل یہ عوام کے دل کی پکار ہے
میدان میں بہیلوں تھیں مخالف جماعتیں — پھر بھی یہ فتحیاب ہے اُن سب کی ہار ہے
ان فتحیابیوں سے یہ ظاہر ہے اے نسیم — بے لشبہ سربراہ لیاقت شعار ہے
وہ سربراہ جس کا جہاد حقوق میں — تلوار ہے نشان لقب **ذوالفقار** ہے
یہ شہسوار لشکر آئین ساز ملک — جیتے نہ کیوں کہ پیرو ذلدل سوار ہے
جھنڈے میں امتزاج تو رنگوں کا دیکھئے — اسلام سے ہے عشق یہ صاف آشکار ہے
ہے ساتھ کالی کملی کے رنگ حسن حسین — ہر رنگ نال رحمتِ پروردگار ہے
قومی اسمبلی کے الیکشن میں کامیاب — صوبائی انتخاب میں بھی کامگار ہے
ہاتف نے دوہری جیت کو سن کر یہ دی ندا
اب فتح ذوالفقار علی یادگار ہے
۷۰ ۶ ۱۹

وفات اسد صاحب مرحوم

(مرثیہ خوان سہارنپور مقیم بجر گڑھی خیر پور)

خلاف رسم مروت ہے یہ جہاں میں اسد — ہم آئے گھر ترے اور تو نہیں مکاں میں اسد
۱۰
نسیم بخضر بھی ڈھونڈ تو پا نہیں سکتے — کہ اس جہاں میں وہ جا اس جہاں میں اسد

وہ دن ہے یاد جب اتنا تھا قرب تجھ سے ہمیں — کہ جتنا قرب ہے انساں کے قلب و جاں میں اسد
اب اتنا بُعد ہے اللہ تجھ میں اور ہم میں — کہ جتنا فرق زمین اور آسماں میں اسد
وہ زندگی ہمیں رہ رہ کے یاد آتی ہے — وفا کی شمع تھا جب بزم دوستاں میں اسد
وہ انکساری کی خو منکسر مزاجوں سے — مثالِ شاخ ثمر در تھا گلستاں میں اسد
جوابِ کبر میں وہ کبر جو عبادت ہے — حدیث معتبر شاہِ مومناں میں اسد
ہجوم فوج مصائب میں ضابط و خود دار — پہاڑ سے بھی گراں تر اس امتحاں میں اسد
کبھی یہ سر نہ جھکے گا۔ کہا علی الاعلان — رکوع کا ہے کو کرتا بھلا اذاں میں اسد
ہزار بار ہوئی گردشِ زماں پسپا — ہزار بار گھرا گردشِ زماں میں اسد"
عجب مزاج مرنجاں مرنج پایا تھا — "نہیں" میں تھا نہ کسی کی کبھی نہ "ہاں" میں اسد
خلوص و سادگی و کسر نفس و ہمدردی — یہ سرخیاں ہیں جلی تیری داستاں میں اسد
وحید عصر تھا اس ذاکری کی منزل میں — فرید مرثیہ خوانی کے کارواں میں اسد
انیس کا وہ سخن اور تری ادائے نفیس — زباں تھی موجہ کوثر ترے دہاں میں اسد
وہ رزمیہ ترا پڑھنا کڑک کے منبر پر — کہ گونجتا ہے کبھی جیسے نَے نیستاں میں اسد
رجز حبیب کا پُر رعب جیسے پیری میں — وہ طنطنہ تھا ترے لہجہ جواں میں اسد
شباب، مرثیہ خوانی کا تھا ضعیفی میں — بہار جذب سی تھی گویا تری خزاں میں اسد
یہی کمال تھا جس نے یہ منزلت بخشی — جگہ ملی سر منبر تجھے جناں میں اسد
ہوا جو مرثیہ خوانی کا تجھکو حکم وہاں — وہ بن گیا سن رحلت مرے بیاں میں اسد
بیانِ حکم میں گونجے فضا میں دو مصرعے — جو گوشِ دل نے سنے جا کے لامکاں میں اسد
شمار عیسوی و احتساب ہجری میں — پکارا ہاتفِ غیبی مری زباں میں اسد

وفورِ غم سے ہوں گریاں انیسِ باایماں
۶۱۹ ۷۰
انیس کا وہ پڑھو مرثیہ جناں میں اسد ۱۴۲۸ھ
۵۰ ۱۴ ۶

بیان تفسیر سورۂ توبہ کی تاریخ

زبان حضرت علامہ ترابی سے — سنی نسیم نے تقریر سورۂ توبہ
بیاں ہوگیا ارے توبہ بیان کا انداز — وہ پُر جلال کہ تصویر سورۂ توبہ
مجالس رمضاں کے جہادِ علمی میں — کماں لبوں کی بنی اور تیر سورۂ توبہ
علی کے فیض سے اٹھتیس دن بزورِ بیاں — چلی نفاق پہ شمشیر سورۂ توبہ
منافقوں کے مزاروں سے خاک اڑنے لگی — یہ تھی جلالتِ تاثیرِ سورۂ توبہ
یہ شیر بیشۂ منبر بنام شیرِ خدا — رہا اسیر تھا اسیر سورۂ توبہ
مجھے تھی فکر وہ تاریخ برمحل لکھوں — جو ہو مناسبِ توقیرِ سورۂ توبہ

فلک سے عیسیٰ گردوں نشیں پکارا کہ: آج
تمام ہوگئی تفسیر سورۂ توبہ

۱۹۶۶ = ۱۹۷۰

جشن رئیس

جشن رئیس اک صحبتِ علمی، عزت و شانِ علم و ادب
جس کی گھڑیاں، جس کے لمحے عصر روانِ علم و ادب
زخمۂ کلک سیف زباں سے رنگ پہ آئی بزم سخن
علم و ادب کی بزم میں جاگے مرتبہ دانِ علم و ادب
حسن زمیں کے ان تاروں کا انجمن انجم میں کہاں
واں ہے قرانِ ماہ و عطارد یاں ہے قرانِ علم و ادب
قومی ذوق کی دنیا میں ہے ہر پہلو سے یہ تقریب

ایک نشانِ قدرشناسی ایک نشانِ علم و ادب
اس موقع پر جی یہ چاہا ایسی اک تاریخ لکھوں
جس کا بیانِ نفس الامری ہو بزبانِ علم و ادب
جھک کے سروشِ غیب نے مجھکو اوجِ فلک سے دی آواز
لے کر عیسیٰ چرخ نشیں سے روحِ بیانِ علم و ادب
ساقط کر کے حروفِ مہمل لکھ دو یہ تاریخ نسیم
جشنِ رئیس ناظم و ناشر جانِ جہانِ علم و ادب
۱۹۷۱ء

تعمیر امام بارگاہ بوتراب عزیز آباد کراچی

کیوں نہ ہوں ساکنانِ خاک قائلِ فیض بوتراب
خاتمہ نعمتوں کا ہے شاملِ فیض بوتراب
میری زباں کی کیا سند، ہے یہ غدیر کا بھی غل
دینِ مکمل رسول کاملِ فیضِ بوتراب
شانِ نزولِ ہل اتیٰ یہ بھی ہے وجہ نازش
میری طرح سے بھی ہیں سائلِ فیضِ بوتراب
پھنس کے بلا میں ناگہاں کہتے ہیں وہ بھی یاعلی
اب نہیں کرتے کسب فیض جاہلِ فیض بوتراب
سب کی سرشت میں ہے آب، جو کہ ہے مہرِ فاطمہ
سب کے خمیر میں تراب، فاضلِ فیضِ بوتراب
کس سے بیاں ہوں وسعتیں فیض ابوتراب کی
قلزمِ کائنات ہے، ساحلِ فیضِ بوتراب

اِنس و جن و وحوش و طیر بحر و بر و نبات و سنگ
سب بہ اساسِ آب و گل حاملِ فیض بوتراب

بیت عزا جو یہ بنا اس کی بھی ہے یہی بنا
ہے یہ مکاں مع مکیں منزل فیض بوترابؑ

مسجد اہل حق کے پاس تعزیہ خانۂ حسینؑ
جیسے خدا سے متصل واصل فیض بوتراب

سال بنا کی فکر ہے ۔ دیکھیے کیا ملے نسیم
ذہن و دماغ و دل ہیں سب مائل فیضِ بوتراب

بیت وہ اک عطا ہوئی لائق سنگِ یادگار
جس کے نقوش ہیں مدام ناقل فیض بوترابؑ

مصرعِ اولِ جمیل ، مرکز ہجری رسولؐ
مصرعِ دوم عیسوی داخل فیض بوترابؑ

ہے یہ عمارت حسنؑ رکنِ مجالس حسینؑ
ہے یہ امام بارگاہ حاصل فیض بوترابؑ
۱۴۱۳ھ ۱۹۹۱ء

قطعہ تاریخ سید علی شاہ کوٹ ڈیجی

نسیم اس لحد پر ہے رحمت کا سایہ
عنایت یہ ابن یداللہ کی ہے

جو حاجی تھا زائر تھا اور متقی تھا
یہاں لاش دفن اپنے نگاہ کی ہے

تہجد گزاری یہ جس کی گواہی
ہر اک رات میں انجم و ماہ کی ہے

یہ وہ ہے سدا جس نے بزم عزا میں
تگا شہؑ کے غم میں بصد آہ کی ہے

جو پہنچائے گی اس کو قصر جناں میں
لحد پہلی منزل اسی راہ کی ہے

یہ اب قبر پر ہے تاریخ رحلت — صدا خامۂ معذرت خواہ کی ہے
پڑھیں فاتحہ جو کبھی آئیں ادھر کو — کہ یہ قبر سید علی شاہ کی ہے

۱۹۷۱ء

تفسیر سورۂ اسریٰ سننے کے بعد

(رمضان ۱۳۹۱ھ بر دولتکدہ علامہ ترابی مرحوم)

ہوا واضح ترابی کے بیانِ بو ترابی سے — وہ سورہ جو ہے ماثورہ زسبحان الذی اسریٰ
گہرریز سحاب طبع رنگیں سے محافل میں — ملے دُر ہائے منثورہ زسبحان الذی اسریٰ
صراطِ حق سے تا قربِ بحق بعقدے تھے لاینحل — کھلے اسرار مذکورہ زسبحان الذی اسریٰ
بیانِ متن و شرح و معنی و تاویل علامہ — مہینے بھر سنا پورا زسبحان الذی اسریٰ
تلاش معنی و تفسیر حق میں سعی کی کیا کیا — فکان السعی مشکورا زسبحان الذی اسریٰ
زباں کی تیغ اور آیت بہ آیت صف بصف محکم — یہ ہیں افواج منصورہ زسبحان الذی اسریٰ
کہاں ہیں حق کے انکاری سنیں تفسیر ما اوحیٰ — ہوا باطل ہر اک شورِ بلیٰ زسبحان الذی اسریٰ
عمارت جس سے مستحکم ہوئی قصر عقیدت کی — بنا چھوڑا وہ معمورہ زسبحان الذی اسریٰ

نسیم ان موعظوں کا عیسوی سن ہو اگر لکھنا
تو لکھ دو: بحث کل سورہ زسبحان الذی اسریٰ

۱۹۷۱ء

وفات خطیب اعظم مولانا سید محمد دہلوی

یا الٰہی نور کی بارش جو ہے شام و سحر — یہ کسی اہل ولا کی یا ولی کی قبر ہے
ذاکر فرزند ختم المرسلیں کا ہے مزار — یا خطیب اعظم آلِ نبیؐ کی قبر ہے
ہیں فضا میں ہر طرف اس کی زباں کے خطبے — کیا یہ ان سب کے ثواب دائمی کی قبر ہے

اس کے دونوں لب بہ منبر تھے اک گویا کتاب
موعظے شاہد ہیں آیات جلی کی قبر ہے

مرنے والا اپنے رنگِ فکر کا تھا خود جواب
منفرد مخصوص طرز ذاکری کی قبر ہے

عالمِ دینِ رسولِ پاک کی ہے یہ لحد
یا علوم ظاہری و باطنی کی قبر ہے

مُکتفے کو بخش دیں جس نے ہزاروں کی کتب
اس فقیرانہ منش دل کے غنی کی قبر ہے

قوم کی تعمیر میں تج دی گئی جو زندگی
اللہ اللہ کیا یہی اس زندگی کی قبر ہے

حق طلب تھی جرأت اخلاق تاج و تخت ہے
پرتوِ خلقِ حسینؓ ابن علیؓ کی قبر ہے

سعی تھی شمشیر جس کی عزم راسخ جس کی ڈھال
یہ محاذ قوم کے ایسے جری کی قبر ہے

تھے اسی کے دم سے زندہ نیم جانوں کے حقوق
یہ نمائندہ تھا جن کا ان سبھی کی قبر ہے

عشقِ ملت عشقِ دیں عشقِ پیمبر عشقِ آل
یہ عناصر جس کے تھے اس بیخودی کی قبر ہے

تھیں بڑھاپے میں جواں جس کی ارادی قوتیں
اس حبیب کربلائے عاشقی کی قبر ہے

بندگانِ حق کا خادم بندۂ طاعت گزار
بندہ پرور دفن ہے اور بندگی کی قبر ہے

محوِ ماتم ہیں خلوص و زہد و ایثار و عمل
عابد شب زندہ دار و متقی کی قبر ہے

جس کا مسلک تھا بہر حال اتحاد المسلمین
اس نشانِ پائے شاہ بوذری کی قبر ہے

مژدۂ رحمت لیے آتے ہیں قدسی فرش پے
نفسِ قدسی کے کمالِ واقعی کی قبر ہے

کیا لکھوں تاریخ رحلت خود ہیں حیراں سوز النسیم
یہ ملک کی قبر ہے یا آدمی کی قبر ہے

لو مکمل شعر میں القا ہوئی تاریخ مرگ
اس کے یہ شایاں بھی ہے جس جیّدی کی قبر ہے

ہے یہ جائے فاتحہ اے زاہدانِ نیک دل
مولوی سید محمد دہلوی کی قبر ہے

---

۹۱ ۱۳

بولے عیسیٰ دیکھ کر ستر برس کی خدمتیں
پیری احساس فرض منصبی کی قبر ہے
۱۹۷۱ء

میں نے یہ آں کہا از رہِ زبر و بینات
ہے یہ ملت کی لحد اک رہبری کی قبر ہے
۱۹۷۱ء

بول اٹھے میر سخن سن کر حروف مہملہ
رہبری کیسی شعور رہبری کی قبر ہے
۱۳۹۱ھ

مجلسیں ان کی پکاریں گی کے منقوطہ حروف
شمع خاموش زبان آگہی کی قبر ہے
۱۳۹۱ھ

امراضِ قلب سے صحت یابی کی تاریخ

(علامہ رشید ترابی طاب ثراہ)

مریضِ دل ۔ مریضِ کربلا کا دل سے متوالا
مسیحِ دو جہاں کے در پہ جا کر کامیاب آیا

علیؑ کا مدح خواں شیریں بیاں کوثر زباں یعنی
ترابی ۔ جو منبر کو جس کا تشنہ حسنِ خطاب آیا

لٹاتا تھا ذخیرے فکر کے مدحِ ائمہ میں
دلِ عارف ہوا کچھ محو ایسا جیسے خواب آیا

یہ خوابِ دل ۔ سکونِ دائمی کی اک علامت تھا
جو بے حکمِ مشیت چھوڑ کر راہِ صواب آیا

مرض نے پوری طاقت سے کیا تھا حملہ آخر
دوا کو یہ جسارت دیکھ کر غیظ و عتاب آیا

اٹھیں بستر کی جانب شافیٔ کونین کی نظریں
شفا خانے کا قدرت کے کھلا در انقلاب آیا

فرشتہ موت کا یوں کانپتا تھا دور گوشے میں
کہ جیسے یہ بھی فطرس کی طرح زیرِ عتاب آیا

فرشتے لے گئے دار الشفا سے فضل و رحمت میں
مچا اک شور ۔ ہٹ جاؤ غلامِ بوتراب آیا

مسیحا دم بخود تھے منبرِ چرخِ چہارم پر
کہ یہ منبر نشیں یا رب عجب کر کے جناب آیا

عیادت کو بتولِ پاکؑ آئیں مضطرب ہو کر
کہ میرے لال کا ذاکر بحالِ اضطراب آیا

ریاضت عمر بھر کی وقتِ بد بخیر کام آئی
دعا گو مجلسوں کا ایک لشکر بے حساب آیا

دعا کی عابدِؑ بیمار نے، آمین صغراؑ نے
شفا بخشی خدا نے ۔ خونِ قاتل پہ عذاب آیا

فنا نے آڑے ہاتھوں لے کے کہا کیا بل لگانے میں
عدم میں قلب کا دورہ جو کھاتا پیچ و تاب آیا

خبر صحت کی سن کر خوش ہوئے سارے عزا خانے
نسیمِ خوش بیاں تاریخ گوئی کو شتاب آیا

ابد سے چھین کر کلکِ الف اس سے لکھا مصرعہ؎
اٹھے بستر سے علامہ کہ مجلس پر شباب آیا

۱ + ۱۹۷۱ = ۱۹۷۲ء

؎ تعمیہ کی طرف اشارہ

وفاتِ رواں واسطی مرحوم

واسطی سید، گرامی خانداں کی قبر ہے
اہل بیتِ مصطفیٰ کے مدح خواں کی قبر ہے

مصرعِ تاریخ لکھ دو لوحِ تربت پر نسیم
شاعرِ جادو بیاں یعنی رواںؔ کی قبر ہے
۱۳۹۲ھ

قطعات تاریخ وفات

حضرت علامہ رشید ترابی مرحوم طاب ثراہ

نسیم ان کے مدارج صبا بتا دل ہی جانیں
مع تفسیر جو سینے میں اپنے لے گئے سو قرآں

مچی چاروں طرف اک دھوم جب پہنچے یہ جنت میں
سنو آکر خطیب عالم اسلام سے قرآں

ملک حیراں تھے کون آیا یہ اکبر باب زہرا پر
زباں پر یا حسینؑ اور چشم تر دل میں لیے قرآں

کہا اس نے ترابی ہیں وہ بولا بو ترابی ہیں
ہوئیں با ہمدگر اس بات پر خوش اٹھے قرآں

پئے تاریخ غل تھا چرخ چارم سے مجالس تک
فلک پہ شمس و منبر پہ رشید و رحل پہ قرآں
۱۹۷۳

(۲) تعمیہ

تا زیست رہا حق کے کرم کا سایہ
سب چاردہ معصوم کے دم کا سا

چودہ ہی کے فیض سے ہے رکر کبھی نسیم
تربت میں ترابی پہ علم کا سا
۱۴ + ۱۹۵۹ ۔ ۱۹۷۳

(۳)

چوتھے مصرع کے حروف منقوطہ سے تاریخ نکلتی ہے

خطیب عالم اسلام چل بسا افسوس
خود اہل فن تھا، وہ تاریخ کو فن ہو ساں

نسیم لکھ لو شمار حروف منقوطہ
اٹھا رشید ترابی خطیب سحر بیاں
۱۳۹۳ھ

؎ مادہ تاریخ کے عیسوی ہونے جانب اشارہ ہے۔

(۴)

(چوتھے مصرع کے حروفِ سادہ یعنی غیر منقوطہ سے تاریخ نکلتی ہے)

بچپن سے یہ ساری عمر ہے منبر پہ علم کے سائے میں
رتبے پہ نسیم اے صلِّ علیٰ ہیں قابلِ دید ترابی کے
تاریخِ وفات اس نسبت سے ہے میرے حروفِ سادہ میں
رایت کا ہے پرچم اب سر پر وہ دیکھ رشید ترابی کے

(۵)

قرآن کی باتیں کرتے تھے جو منبرِ شاہِ سلونی پر
اس تربت میں قرآں کی قسم وہ صاحبِ روئے کتابی ہیں
میں ان کی زبانِ گویا کو معیارِ خطابت کیا لکھوں
جب غیر خطیبِ آلِ کسا جو لفظ بھی ہیں وہ خطابی ہیں

تاریخِ لحد کی فکر جو کی بولے یہ جلو سے روح امیں
الفاظ ہوں اعلیٰ سے اعلیٰ، یہ لائقِ عرش جنابی ہیں
لکھ "مرقد" پہلے پھر "ذاکر" پھر بہرِ تعارف نامِ حسینؑ
۳۴۴ — ۹۲۱ — ۱۲۸ = ۱۳۹۳ھ
ان لفظوں میں ہجری سن کے اعداد و شمار حسابی ہیں

گر دو گے ندا دی عیسیٰؑ نے اور پھر بھی لحد کے دیکھ نسیم
"سائے میں علم کے علامہ مرحوم رشید ترابی ہیں"
۱۹۷۳ء

وفاتِ راجا محمد امیر احمد خاں (محمود آباد)

سدھارے خلد کو راجا امیر احمد خاں — کہ جن کا خونِ جگر ہے یہ ارضِ پاکستان
وہ نیک دل کہ فضائل کے غیر بھی قائل — وہ پاک نفس کہ مصداقِ معنیٔ انساں

فقیر از رہِ خو از رہِ خمیر امیر
غلامی درِ آلِ رسولؐ کے شایاں

مقامِ فکر میں روح و ضمیرِ اہلِ نظر
مقامِ ذکر میں نفسِ ابوذر و سلماں

نماز و روزہ و خمس و جہاد و حج کے سوا
جہادِ نفس کے میداں میں فاتحِ دوراں

شہیدِ عزم و عمل ذاکرِ حسینؑ شہید
دوائے زخمِ دلِ فاطمہ کہ مرثیہ خواں

مثالِ ماہ وہ شب زندہ دار و سجدہ بکف
نجوم جس کے مصلے کے رات بھر نگراں

حریمِ پاکِ شہنشاہِ طوس و مشہد میں
ہے ان کی لاش امانت برائے امن و اماں

ولائے آل کے صدقے میں حکمِ باری سے
جہاں ہے سیرِ جناں کو ہوئی ہے روح رواں

قیمِ خلد وہاں روحِ پاک کے ضامن
جسد کے ضامنِ ثامن نگہبان یہاں

یہ روح و جسم ہیں سائے میں دو اماموں کے
خبر کرو انھیں ہیں منکر و نکیر کہاں

فراقِ جان و جسد کی میں کیا لکھوں تاریخ
کہ خود جسد ہے ہم آہنگ اب نہیں مری جاں

پکارے چرخ سے عیسیٰؑ کہ فکر کیا ہے نسیم
لحد پہ لکھ دو "ضریحِ امیر احمد خاں"
۱۹۷۳ء

وفاتِ محسنہ

(ذاکرۂ امام حسینؑ)

نظامِ دہر ہے مائل زیانِ جاں کی طرف
عبث یہ نسبتِ گردش ہے آسماں کی طرف

ہر امتحاں میں جما رہے جو پائے ثبات
وہ لائے جاتے ہیں رہ رہ کے امتحاں کی طرف

کبھی حسینؑ کبھی مبتلائے حسینؑ کے دوست
ہے چشمِ رہزنِ غم ایک کارواں کی طرف

کبھی جو بیٹھ کے رہ لیں ذرا سکون سے ہم
تو غم کے تیر چلیں چشمِ خوں فشاں کی طرف

ہے کل کی بات کہ اس ذاکرہ کو مجلس سے
یہ جبر لے کے چلا دردِ جاں ستاں کی طرف

وہ ذاکرہ جو رلاتی رہی مجالس میں
اب اس کی یاد میں مائل ہیں دل فغاں کی طرف

تمام عمر پڑھیں مجلسیں، کہے نوحے — کبھی زباں کی طرف رخ، کبھی بیاں کی طرف
زنانِ قوم کی چالیس سال خدمت کی — جھکا کے سر شہِ والا کے آستاں کی طرف
جلو میں اُس کے مجالس کئی ہزار چلیں — وہ اِس جہاں سے گئی جب کہ اُس جہاں کی طرف
سفر تھا سخت پہ اس کی نظر میں گُل تھے — وہ یوں چلی کہ صبا جیسے گلستاں کی طرف
لقائے شہ کے تصوّر کا جذب، عشقِ علیؑ — کہ جیسے کھنچ کے نمازی چلے اذاں کی طرف
کیا سلام جو آکر اجل نے مجلس میں — تو آنکھ اٹھا کے بھی دیکھا نہ این و آں کی طرف
یہ حادثہ ہوا ہشتم ربیع الاول کو — چلی ربیع کے آغاز میں خزاں کی طرف
وہ گھر میں فصلِ غمِ شہ کی آخری مجلس — نگاہِ شوق کا اٹھنا وہ سوز خواں کی طرف
وہ دل پہ اُس کے مرض کا شدید تر حملہ — وہ دل رجوعِ غمِ شاہِ تشنگاں کی طرف
وہ سیلِ اشکِ عزا عازمِ دفاعِ مرض — وہ اشتدادِ مرض مرگِ ناگہاں کی طرف
وہ سر کو در پہ عزا خانے کے جھکا دینا — نظر وہ روح کی دنیائے جاوداں کی طرف
وہ تین لختِ جگر تین بیٹیاں بیہوش — کبھی وہ بین، کبھی دیکھنا وہ ماں کی طرف
وہ بی بیوں کی عزا بانیٔ عزا کے لیے — نگاہیں لاش پہ، دل شاہِ بیکساں کی طرف
شہادتِ حسنِ عسکریؑ کی ساعت میں — مکاں سے لے کے چلی موت لامکاں کی طرف
اسی کی یاد میں ہے منعقد یہ بزمِ عزا — گئی جو فرشِ عزا سے شہِ زماں کی طرف
ہجومِ غم میں جو پڑھنا تھی موت کی تاریخ — یہ بیت قلبِ حزیں سے چلی زباں کی طرف
کہ "آج چوم کے بیت العزا کی چوکھٹ کو — سوئے حسینؑ گئیں محسنہ جناں کی طرف"

۱۹ ۶ ۷۴

قطعہ تاریخ رحلت زیبا احمدی بیگم مرحومہ

بفیضِ آلِ طٰہٰ باغِ جنت میں جگہ پائی — سدھاریں چھوڑ کر جب باغِ دنیا احمدی بیگم
ندا دی مغفرت نے لکھ دو یہ تاریخ تربت پر — "مقامِ رحمتِ حق قبرِ زیبا احمدی بیگم"

وفاتِ رباب

(زوجہ جناب غلام علی ایڈووکیٹ)

مردِ مومن وہ مرادوست وہ شیدائے حسینؑ
روز و شب جس کا ہے دل محوِ عمل میں غرقاب

کام بھی نام بھی شاہد کہ علیؑ کا ہے غلام
خدمتِ خلق میں ہے گام زنِ راہِ صواب

ایڈووکیٹ بھی اور اہلِ ولا کا بھی وکیل
دردِ قوم میں ہے، دل جس کا ہمیشہ سیماب

مبتلا آج وہ خود درد میں ہے اپنے ہے یتیم
اس کی زوجہ کا اُسے دیتے ہیں پرسا احباب

ہائے دنیا سے سدھاری وہ عزادارِ حسینؑ
محو تھی مجلسِ ماتم میں جو بے حدّ و حساب

جس کی فطرت کا ہر اک وقت تقاضا تھا یہی
سانس جب تک ہے کیے جائیے کچھ کارِ ثواب

حج، زیارات، عبادت، صدقہ، صوم، صلوٰۃ
ورد تھے سب یہ عمل دل میں لیے آلِ کتاب

مادرِ اصغرؑ ماداں کی کنیز اور ہمنام
عاشق و خادمۂ زینبؑ و کلثومؑ و رُباب

بیٹیاں بیٹھ کے میت کے قریب روتی ہیں
غم سے بے چین ہیں بلقیس، حسینہ، مہتاب

تینوں بیٹے قطبؔ و عبدِ حسینؔ و قائمؔ
دل کو کس طرح سنبھالیں کہ ہیں آنکھیں پُر آب

رونے والوں سے کہو کوئی یہ کیوں روتے ہیں
مرنے والی پہ تو رحمت کے کھلے خلد میں باب

ہو چکا نزع کے عالم میں بھی ظاہر یہ راز
خلدِ فردوس کے قدرت نے دکھائے اسے خواب

جب وہ دم توڑ رہی تھی تو کیا یہ محسوس
اس کو دیتا ہے صدا جیسے کوئی عرش جناب

کوئی داعی ہو، مگر تھا کوئی ایسا ہی عظیم
ہچکیاں لیتے میں "لبیک" کہی بہرِ جواب

سن کے یہ حال کہی ہم نے یہ تاریخِ وفات
تابعِ امرِ رباب آئی ہے ربّ الارباب
۱۳۹۴ھ

نذرِ حادثہ، عابدہ سلطانہ بنتِ بیدار نجفی

(شبِ نیمۂ شعبان (بس کے حادثے میں)

نوحہ خوانی کو تری ترسیں گی شب بیداریاں
عابدہ! اے دخترِ بیدار! نذرِ حادثہ

نیمۂ شعباں کو نکلی تھی عریضہ ڈالنے — راہ میں لیں ہو گئی اک بار نذرِ حادثہ
تھی جو عرضی روبرو دینے کی دل میں آرزو — جذبۂ دل سے ہوئی ناچار نذرِ حادثہ
تو شہیدوں میں ہے شامل کیونکہ وہ بھی ہے شہید — راہِ حق میں ہو جو ماتم دار نذرِ حادثہ
نیک نفسی ذاکری طاعت سلیقہ علم و فن — ساتھ تیرے یہ بھی ہیں دو چار نذرِ حادثہ
حادثہ خود نذر کو لایا تھا بخشش کی سند — لوگ کہتے ہیں تجھے بیکار نذرِ حادثہ

قبر مرحومہ پہ لکھ دو سالِ رحلت اے نسیم
عابدہ سلطانہ دیندار نذرِ حادثہ
۱۹۷۴ء

قطعۂ تاریخِ وفات

ڈاکٹر ممتاز حسین (صدر ترقی اردو بورڈ)

علم و فکر و عمل و صدق و خلوص و اخلاق — بزمِ ممتاز میں ہر دم تھیں یہ شمعیں روشن
سالِ رحلت یہ نسیم ان کی لحد پر لکھ دو — "محفلِ نور ہے، یہ مرقدِ ممتاز حسن"
۱۳۹۴ھ

تاریخِ وفات اہلیہ مرحومہ

معجزہ خاتون بنتِ زاہد حسین و اُمِ کلثوم

بے نسیم امروہوی کی یہ شریکِ زندگی — دخترِ کلثوم و زاہد سیدہ عالی حسب
سالِ رحلت عیسوی میں قبر پر لکھ دو نسیم — "خواب گاہِ معجزہ خاتون پاکیزہ نسب"
۱۹۷۴ء

یہ قطعات تکمیلِ مضمون کے بعد دستیاب ہوئے:

وفاتِ معز حسنین نقوی مرحوم

جو جامعہ امامیہ میں نماز ظہر پڑھتے پڑھتے مصلے پر جاں بحق ہوئے

پڑھنے کو ظہر بن معز آئے جو گھر سے مسجد میں — آتے ہی بالائے مصلیٰ دم بھر اٹھے مسجد میں
ہم نے تھام کے اپنا کلیجہ لکھی یہ تاریخ نسیم — "آہ عزیز معز ہم سے ظہر میں بچھڑے مسجد میں"
۱۹۷۱ء

تاریخ وفات عمۂ محترمہ

صغرہ خاتون بنتِ فرزدق ہند شمیم امروہوی

بیٹی یہ اسی شمیمؔ کی ہے — جس کا تھی ثنائے شہؑ وتیرہ
تربت پہ شمیمؔ لکھ یہ تاریخ — "جنت میں ہے اہلِ دیں صغرہ"

۱۹۷۳

غلط نامہ مع صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۲	۲۱	جدید مرثیہ	مرثیہ
۵۴	۹	سیدھے	سیدھے سادے
″	۱۰	پورا زور کلام دکھایا	پورا زورِ کلام دکھایا
۵۵	۶	کلمہ	کلمۂ
″	۱۴	نسیم	نسیم کا
۵۸	۱۸	نسیم کی	نسیم
۶۰	۱۶	برق و خرمن	برقِ خرمن
۶۳	۲۱	اماں	داماں
۶۶	۱۰	ایک	اک
″	۱۳	جو ٹیپ	جو رنگ ٹیپ
۶۷	۱۱	محفی	مخفی
۶۹	۱۴	آٹھ دس	اکیس
″	۱۹	تیرہ	۲۶
۷۲	۱	دیبجاہ	دیباچہ
۷۳	۹	بند	مرثیہ
۷۴	۱۳	مرثیے	دسویں مرثیے
۷۵	۵	بدلے	بولے
۷۷	۱۶	لیے گرمی	لیے نرمی
″	۱۷	جانثاری	جاں نثاری
۷۸	۱۱	مرثیوں کیے	مرثیوں میں کیے
۷۹	۱۷	رطب السان	رطب اللساں
۸۰	۱۷	جواہر کا	جواہر کے
۸۵	۹	رشتۂ عمل	رشتہ، عمل
۸۷	۸	ایک اور	ایک
۸۸	۱۵	عمل کے آپ کا	عمل کا آپ کے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۹۲	۸	دہن	دہن
۹۵	۱۳	حسینؑ	حُسین
۹۶	۱۰	پیدا ہو	پیدا ہوئی
۹۸	۱۶	شخصیت	شخصیتوں
۹۹	۱۶	کیے گئے	کیے
۱۰۴	۸	سراپاے	سراپا
۱۲۲	۱۲	عفیر	غفیر
۱۲۵	۵	پہلوانو	پہلوان
۱۲۶	۱۶		اس کے بعد ایک بین بنا لیجیے
۱۲۷	۲	گوئی	گوئی کے
۱۲۸	۱۷	افتصادی	اقتصادی
۱۹۰	۴	یہ نئی	ایک نئی
″	۱۳	بار گزرے	بار نہ گزرے
۱۹۳	۱۳	خالی جگہ	چہرے
۱۹۴	۵	ہوتی نہ ہوتی	ہوتی نہ ہوتی
۱۹۵	۶	خالی جگہ	علی
۲۵۴	۱۵	طہوری	ظہوری
″	۲۱	برصغیر	برصغیر کا
۲۵۶	۱	محطوط	مخطوط
″	۴	انیسویں	انیسیوں
۲۵۸	۱۳		یہ حاشیے کے بعد کی سطر ہے جو غلطی سے یہاں درج ہوگئی
۲۶۰	۴	اس کے	اس کے کر
″	۹	عصر خانہ	عصر حاضر
۲۶۲	۳	انیس کا زمانہ	انیس کے زمانے

مطبوعہ : سندھ آفسٹ پرنٹرز۔ کراچی